میں وی جانا ڈھوک رانجھن دی نال میرے کوئی چلے

(شاہ حسینؒ)

ساتھ لے جانے والے

ڈاکٹر عفت

اور

قدرت اللہ شہاب

کے نام

مندرجات

معذرت:

بن مانگے،

مانگے ملے نہ بھیک،

جدہ،

مکہ روڈ،

مکہ معظمہ،

مسجد الحرام،

کالا کوٹھا...... قبولیت کا خطرہ...... اب بولو...... اذان...... نماز...... سجدہ...... صرف حضوری...... انوکھا...... تپسوی...... ابلیس کے دانت...... گنگا جمنی...... انجانینا...... ڈاکٹر عفت...... چور اور گٹھڑی...... عورت...... اٹیم بم......

مطاف،

سنگ اسود...... دل چھوٹا...... رکاوٹیں...... پر اسرار بندے...... حلیم...... بدبو...... اپنا اپنا مقام...... انوکھی کرم نوازی...... حرم...... بے نیاز فقیر...... اسلام...... اسلام کو خطرہ...... اللہ اور بندے...... میزاب رحمت...... زائر، سوداگر...... توہم پرستی...... تاجر ہی تاجر

زائرین اور حج،

توحید پرست اور بت پرست...... کھڑکیاں اور دریچے...... پالتو شکایات...... بند کمرہ...... کردہ اور نا کردہ گناہ...... شکوک و شبہات...... نمناک حیرت...... باتھ اور سلیم کی ماں...... ابو الاثر اور بت...... خارجی اور داخلی...... نورانی بڈھا...... صدر ایوب...... ہائی لیول کانفرنس......

منٰے،

انوکھا سفر...... الف لیلوی شہر...... خیمہ ہوٹل...... بے نام آزردگی...... عظیم بیگانگی...... پتھر اور چور چور...... پر اسرار شخصیت...... لاٹھی اور اندھا...... "میں میں"...... خیمے...... لڑائی جھگڑے...... بڑے میاں...... وسوسوں کا شہر...... رستہ بھول......

میدان عرفات،

طلب اور یافت ...... جوار بھاٹا ...... خالی قیام ...... پھول پتیاں ...... جان کین ...... پر ہیبت انبوہ ...... رنگ رنگ ...... روپ بہروپ ...... زائر دکاندار ...... جبل الرحمت ...... سفید پتھر ...... سجدہ سہو ...... امریکی ٹریلر ...... وقوف ...... سیاہ و سفید ......

جمرۃ الباطنیہ،

وقوف اور خروج ...... تعجیل ...... مزدلفہ ...... کنکریاں ...... رجعت ...... چھوٹی اور چھوٹی ...... جان محمد بٹ ...... واپسی ...... دعا ...... باقی تو جانے ...... شیخ سعدی ...... صحیح فری کوئنسی ...... انتقامی غیض وغضب ...... جمرۃ العقبہ ...... میری طرف دیکھو

بال جنجال،

کیمرہ اور دل ...... لنگوٹی ...... اہتمام ...... سائیں حلوہ ...... بندوبستی قافلہ ...... تلذز کا اژدہا ...... بلے بلے بلے ...... شبلی بی کام ...... سوچ اور کیفیت ...... دہکا کوئلہ ...... تواتر ...... سیون ...... ''پاگل ای اوئے'' ......

طواف وداع،

احساس مفارقت ...... جب اور اب ...... افریقی قافلہ ...... لت پت ...... مکان اور مکین ...... عکسی مفتی اور پراگ ...... فالتو ہستی ...... منافقت منافقت منافقت ...... ثواب کی گٹھڑیاں ...... میں کون ہوں؟ ...... رخ ...... حاجی صاحب ...... بیعت ...... رکاوٹیں، رحمتیں ...... محاصرہ ......

مدینہ روڈ،

اللہ اور محمدؐ...... عظیم ترین انسان...... بشیر خالد...... پاکستان...... ادنیٰ غلام...... بھیڑوں کا رکھوالا...... عالم...... حمیدہ کور...... تڑخیں ہی تڑخیں۔ سکر اور محو...... جنات کا مسکن...... شرمساری...... شہداء بدر......

حجرہ مبارک،

باب جبرئیل...... جذبہ جنون...... مٹی کا پہلوان...... بدھ اور نروان...... اجلے اور میلے...... وہ سلام...... دعا...... مانگنے والا اور دینے والا...... غلام دین وانی...... سچا منگتا...... ڈھنگی...... سب سے بڑا انسان اور رسول اللہ...... نے نیازی اور شوراشوری...... سنہرا موقع...... شی...... آداب عالیہ......

مسجد نبویؐ،

باادب باملاحظہ ہوشیار...... مرد قدیم...... مخالفین حرم...... قانون اور رحمت...... پاپوش بابا...... عرب سردار...... آزردگی...... کرم ہی کرم...... نچڑ تارس گلا...... رد عمل...... مناسب نامناسب......

مینار عظیم،

چنبے دی بوٹی...... سفارت پاکستان...... علما کا وفد...... عام حاضری خاص حاضری...... "نال مرے کوئی چلے"...... قدرت کی واپسی...... درویشوں کا شہر...... ان دیکھا شہر...... مانگنا، قبول کرنا......

واپسی،

اکیلا...... طلب اور منزل...... خوشنودی...... چالیس نمازیں...... اجازت رخصت...... ریورس گیئر...... اشیاء کا ناچ...... لذت خریداری...... نماز......

آوارگی......

سفارت پاکستان،

وداع......سفارش خروج......بھگوڑا...... جناب عالی جناب عالی......صحرا نوردی......فون نمبر......سفیر صاحب......میری طرف دیکھو!!......

مسافر خانہ،

کارواں سرائے......کھانا...... پاکستان زائرین......فرد واحد......لوٹ کا مال......ستر لاکھ نمازیں......یا حاجی یا حاجی......مستند حاجی......خروج......ہٹ جاؤ

خروج،

سنڈیاں ہی سنڈیاں......گلیور اور بالشتیہ......گوریاں......عرب میم......خیر اور شر......وہ خاموشی یہ خاموشی......منوجی مہاراج......دھندلکا......روشنی کی کرن......سوتا جاگتا......سونا ہی سونا......"ہشیٹ"......

جتھوں دی کھوتی،

کوے اور ہنس راج......منکر......حاجی سپیشل......جذبے کی راب......جیسے گئے ویسے لوٹے......وہی ممتاز مفتی......نہیں نہیں......

تعارف،

معذرت

یہ رپورتاژ سیارہ ڈائجسٹ میں سولہ قسطوں میں چھپ چکا ہے۔ اب میں اسے ترمیم و اضافہ کے ساتھ کتابی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔

میں نے ۱۹۶۸ء کے حج میں حاضری دی تھی۔ حج سے واپسی کے بعد میرے

دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ حج بیت اللہ پر کچھ لکھوں لیکن جرأت نہ ہوئی۔ خیال آیا کہ اس مقدس موضوع پر میں کیا لکھ سکتا ہوں۔ قلب میں گرمی نہیں، دل میں روشنی نہیں، دین سے واقفیت نہیں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کرلیا کہ کچھ نہ لکھوں گا لیکن ہونی ہو کر رہی۔

قاسم محمود سے وعدہ ایفا کرنے کے لیے اور کوئی موضوع ذہن میں نہ آیا اور میں نے سوچے سمجھے بغیر حج بیت اللہ پر لکھنا شروع کر دیا۔ خیال تھا، سرسری طور پر دو تین قسطیں لکھ دوں گا۔ اِدھر اُدھر کی فروعی باتیں کروں گا جن کا اللہ اور دین سے کوئی تعلق نہ ہو اور پھر ختم کر دوں گا۔ لیکن جب رپورتاژ خانہ خُدا کے حضور پہنچا تو میرے اللہ نے مجھے پکڑ لیا۔ "اب ہمارے حضور پہنچ کر تو جاتا کہاں ہے"۔ پھر مجھے پتہ نہیں کیا ہوا، لکھتا گیا، لکھتا گیا اور لکھتا ہی چلا گیا۔

وہ تو شکر ہے اسلام کے اجارہ داروں نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا "اے او" ہم سے پوچھے بغیر اس مقدس موضوع پر قلم اٹھاتا ہے۔ تیری یہ جرأت؟" اس پر میں نے اپنا ہاتھ روک لیا، ورنہ شاید سولہ کی بجائے بتیس قسطیں لکھ جاتا۔

حیرت کی بات ہے کہ اس رپورتاژ کو اتنے سارے لوگوں نے پسند کیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ میں ذات کے چشمے سے دیکھ رہا ہوں اور میری ذات اس قدر کثیف ہے کہ قاری بور ہوں گے۔ مگر مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ اتنے سارے لوگ میرے نقطۂ نظر سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ یہ بھی میرے اللہ کا کرم ہے کہ اس نے میری تحریر کو تاثر بخشا۔

میرے اللہ مجھ پر ہمیشہ سے کرم فرمائی کرتے رہے۔ ان دنوں بھی جب میں ان کے وجود سے منکر تھا، ان دنوں بھی جب میں انہیں شکوک و شبہات کی نظر سے دیکھتا تھا، ان دنوں بھی جب میں سمجھتا تھا کہ اگر خدا کا وجود نہ ہوتا تو بھی ہم اپنی

آسائش کے لیے ایک خدا تخلیق کر لیتے، اور اب بھی جب میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ میرے لیے جیتے ہیں، میرے فکر میں جا رہے ہیں، مجھے تکلیف نہ ہو، میری ضروریات پوری ہوتی رہیں، میرا رخ سیدھا رہے، میری بداعمالیاں میری ذہنیت کو داغ دار نہ کر دیں، میرے دل کا سوتا سوکھ نہ جائے۔

جب آقا اس قدر مہربان ہو تو بندہ فرطِ محبت سے سرشار ہو کر لاڈ کرنے لگتا ہے۔ اس رپورتاژ میں میں نے بھی جگہ جگہ لاڈ کئے ہیں۔ اگر ان کی وجہ سے کسی کی دل آزادی ہوئی ہو تو میں معافی کا خواستگار ہوں۔

کچھ لوگوں کو شکایت ہے کہ اس مضمون میں میں نے قدرت اللہ شہاب کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ رپورتاژ لکھتے ہوئے میری سب سے بڑی مشکل قدرت کے متعلق حقائق کو حذف کرنا تھا۔ اگر یہ مشکل میری راہ کی دیوار نہ ہوتی تو عرصہ دراز سے "علی پور کا ایلی" کا دوسرا حصہ "ایلی اور الکھ نگری" شائع ہو چکی ہوتی۔

نعمانہ سہیل اور نیر ربابا کی فرمائش پر میں نے اس رپورتاژ میں چند ابواب کا اضافہ کر دیا ہے۔ ابتدا میں میں نے دو تعارف شامل کئے ہیں۔ نذیر احمد کا جو مغز ہی مغز ہیں، تابش کا جو دل ہی دل ہیں۔

آخر میں سیارہ ڈائجسٹ کے مدیرِ اعلیٰ سید قاسم محمود کا مضمون شامل ہے جس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ رپورتاژ چھپنے کے دوران ان پر کیا بیتی، کیسے کیسے خط موصول ہوئے۔ کیا کیا ردِ عمل ہوئے، کتنے کانٹے چبھے، کتنے پھول برسے۔

اس رپورتاژ کا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں۔ نہ ہی دینی مسائل پر بحث کرنا ہے۔ نہ دینی مسائل پر کوئی نیا نظریہ پیش کرنا ہے۔ یہ رپورتاژ تو ایک انجان، جاہل مگر مخلص زائر کی آپ بیتی ہے۔

ممتاز مفتی

مکان ۲۲، گلی ۳۲، ایف ۱/۶

اسلام آباد

بن مانگے

فوارہ چوک کا مست:

میرے دل میں حج کرنے کی خواہش کبھی پیدا نہ ہوئی تھی، پر عجیب حالات رونما ہوئے۔ ایک شام میں فوارہ چوک سے گزر رہا تھا۔ اس وقت بجلی فیل ہونے کی وجہ سے چوک میں خاصا اندھیرا تھا۔ حسب دستور آنے جانے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ میں بچ کر ایک طرف چل رہا تھا کہ دفعتاً ایک سیاہ فام جسم میرے سامنے ابھرا چہرہ بھیانک تھا، بال بکھرے ہوئے، آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا، پھر خوشی سے چلا کر بولا: ''تو حج پر جائے گا۔ تو حج پر جائے گا۔ سنا تو نے؟''

وہ مست تھا۔ میں سمجھا فقیر ہے۔ میں نے جیب سے چونی نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی اور چل پڑا۔ اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ ہاتھ کھولا، چونی میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ پھر اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی مٹھی کھولی، وہ ریزگاری سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے ساری ریزگاری مجھے تھما دی۔ ''رکھ لے رکھ لے'' وہ بولا۔ ''تجھے حج پر جو جانا ہے، تجھے پیسے چاہئیں۔ رکھ لے رکھ لے۔''

اس روز گھر پہنچ کر میں سوچتا رہا۔

اگر وہ چونی واپس نہ کرتا اور اتنی ساری ریزگاری میرے ہاتھ میں نہ تھما دیتا، تو اس واقعے کو چنداں اہمیت نہ دیتا۔ لیکن ان کوائف نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔

چار ایک دن میں سوچتا رہا۔ وہ کون تھا؟ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے مجھے پیسے کیوں دیئے؟ حج کی بات کی طرف میری توجہ منعطف نہ ہوئی۔ اس کی حیثیت ضمنی رہی۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ اتنی بھیڑ میں اس نے مجھے کیوں روکا۔

خیرات کیوں نہ لی۔ مجھے پیسے کیوں دیئے۔ چار ایک دن میں سوچتا رہا، پھر بات ذہن سے نکل گئی۔

دو مہینے گزر گئے۔

خواب ہی خواب:

پھر...... ایک رات مجھے حج کا خواب آیا۔ میں اپنے خواب لکھ لیا کرتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے یہ گمان ہے کہ خواب پیغامات کے حامل ہوتے ہیں یا مستقبل کی خبر دیتے ہیں، بلکہ اس لیے کہ میں نفس لاشعور میں دلچسپی رکھتا ہوں۔

خواب میں میں نے دیکھا کہ میرے چچا مرحوم تشریف لائے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں دو سوٹ کیس ہیں۔ بغل میں ایک لمبا لفافہ دبا رکھا ہے۔ بولے "یہ لو یہ رہا تمہارا سامان۔" اور پھر لفافہ کھول کر اس میں سے ایک سلپ نکالی "اور یہ رہی تمہاری ٹکٹ۔"

"کیسی ٹکٹ؟" میں نے پوچھا۔

بولے "بھئی تم حج پر جو جا رہے ہو۔"

یہ خواب اپنی نوعیت کے لحاظ سے انوکھا تھا۔

نوجوانی میں مجھے خواب نہیں آتے تھے۔ آتے بھی تو بے ربط اور ڈراؤنے جو صبح کو یاد نہ رہتے۔ ان دنوں صرف ایک بار ربط خواب آتا تھا جس سے میں اچھی طرح مانوس تھا۔ جسے انگریزی NIGHT MARE کہتے ہیں۔ ڈراؤنی بڑھیا میرے پیچھے بھاگتی، مجھے پکڑ لیتی۔ پھر وہ میری چھاتی پر چڑھ کر بیٹھ جاتی۔ ڈر کے مارے میں چیختا...... اور میری آنکھ کھل جاتی۔

ادھیڑ عمر میں بڑھیا سے تو چھٹکارا مل گیا لیکن خوابوں میں بے ربطی، افراتفری، دوڑ دھوپ، خوف و ہراس قائم رہے۔ اس خواب سے متعلق تین باتیں

عجیب تھیں۔

پہلی یہ کہ ایسا بار بط اور صاف خواب میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

دوسری یہ بات کہ حج کی بات کبھی میرے نفس شاعر یا غیر شاعر میں نہ آئی تھی۔ پھر اس کے متعلق خواب دیکھنا حیران کن بات تھی۔

تیسری یہ کہ حج کی بات اور چچا کی زبانی! دونوں باتیں ہی نا قابل یقین تھیں۔ چونکہ میری طرح چچا مرحوم بھی اللہ تعالیٰ کو صرف منہ زبانی مانتے تھے۔

یہ خواب دیکھ کر اب کی بار میری تمام توجہ حج پر مرکوز ہو گئی۔ کئی ایک دن میں سوچتا رہا۔ مجھے حج کی خبر کیوں سنائی جا رہی ہے۔ حج اور میں دونوں کا کوئی میل بھی ہو۔ سوچ سوچ کر ہار گیا۔ بات سمجھ میں نہ آئی۔

پھر کچھ دیر کے بعد بات ذہن سے نکل گئی۔

دو مہینے اور گزر گئے۔

میاں صاحب:

پھر ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ میرے دل میں حج کے مفہوم کی آگاہی حاصل کرنے کے لیے تجسس پیدا ہو گیا۔ ان دنوں میں کراچی میں نیا نیا قدرت اللہ شہاب سے واقف ہوا تھا۔

ایک روز قدرت اللہ شہاب نے مجھے فون کیا۔ بولے "جب آپ دفتر آئیں تو راستے میں ۸۱۔ گارڈن ایسٹ (GARDEN EAST) سے ہوتے ہوئے آئیں۔ وہاں ایک صاحب ٹھہرے ہوئے ہیں میاں صاحب۔ ان سے ملیں۔ کہیں میں نے بھیجا ہے۔ پوچھیں: فرمائیے آپ چاہتے کیا ہیں؟"

بسیار تلاش کے بعد مجھے گارڈن ایسٹ کا وہ مکان ملا جس میں میاں صاحب مقیم تھے۔ میں نے صاحب خانہ سے میاں صاحب کے بارے میں پوچھا۔ انہوں

نے ملحقہ کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ ایک چھوٹا سا خالی کمرہ تھا۔ جس میں ایک طرف چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف جائے نماز پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی عبادت میں مصروف تھا۔

میں نے جھک کر سلام کیا۔

میاں صاحب بڑے اخلاق سے ملے۔ میں نے اپنا مقصد بیان کیا۔ میں نے کہا ''مجھے قدرت اللہ شہاب نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے''۔ وہ پوچھتے ہیں کہ آپ چاہتے کیا ہیں؟''

کچھ دیر کے لیے میاں صاحب خاموش بیٹھے رہے۔ ان کے بشرے سے نورانی بزرگی اور وقار کا اظہار ہو رہا تھا۔ برتاؤ میں حلم، شفقت اور سنجیدگی تھی لیکن اس کے باوجود انداز میں شدید اضطراب تھا جسے وہ دبانے کی شدید کوشش کر رہے تھے۔

کچھ نہیں چاہیے'' ۔میاں صاحب نے جواب دیا۔'' کچھ نہیں چاہیے۔اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔کون سی نعمت ہے جس سے انہوں نے اپنے غلام کو نہیں نوازا۔ان سے کہیے کہ بس اتنی گزارش ہے کہ ہمیں حج پر بھجوا دیں۔''

حج کی بات کرتے ہی ان کا پر وقار چہرہ یوں ٹوٹ گیا جیسے انڈا ضرب لگنے سے ٹوٹ جاتا ہے۔چہرہ مسخ ہو گیا۔ بزرگی اور وقار پارہ پارہ ہو کر رہ گئے۔ ان پر منت سماجت، بے بسی اور بیچارگی طاری ہو گئی۔آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ روتے روتے وہ چلائے۔''وقت بیت نہ جائے۔ ہمارے پاس پیسہ ہے، کرایہ ہے، اللہ کا دیا سبھی کچھ ہے، صرف وقت نہیں۔بس ہمیں حج پر بھجوا دیں۔''

وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے۔روتے روتے ان کی گھگھی بندھ گئی۔میاں صاحب سے ملنے کے بعد میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔

''یہ حج کیا چیز ہے؟''میں نے قدرت اللہ سے پوچھا۔

انہوں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا: "حج اسلام کا ایک رکن ہے"۔

"رکن تو ہے پر یہ کیسا رکن ہے جس کے لیے ایک معزز باوقار بزرگ یوں بچے کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا، جیسے حج چوسنے والی مٹھائی ہو۔"

ریچول:

"حج ایک RITUAL ہے" قدرت نے سنجیدگی سے کہا۔

تقسیم کے فوراً بعد مشہور فلم ڈائریکٹر مسعود پرویز نے مجھ سے کہا تھا "مفتی صاحب آپ ایک ایسی فلمی کہانی لکھ دیں جس میں دور جہالت کے قدیم عرب قبیلوں کی زندگی کی تصویر ہو۔ عربوں کی بت پرستی، شراب نوشی، زنا کاری، بے حیائی اور عیاشی دکھانے کے بعد دفعتاً جہالت کے بادل چھٹ جائیں اور سورج نکل آئے اور محمد صلعم کی عظیم شخصیت کے اثرات عربوں کی کایا پلٹ دیں۔"

مسعود پرویز کے خیال نے مجھے مسحور کر دیا۔ فلم لکھنے کے لیے میں نے مکے کی تاریخ کا مطالعہ شروع کر دیا۔

تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ حج کے کوائف بالکل وہی ہیں جو زمانہ جہالت میں مکے کے بت کدے میں سالانہ اجتماع پر ادا کئے جاتے تھے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ جب لات و منات کا طواگ ہوتا تھا تو زائرین ننگے ہوتے تھے۔ ہاتھوں میں شراب کے پیالے ہوتے اور بغلوں محبوبائیں ہوتی تھیں۔

لیکن اب زائرین کے جسم ملبوس ہوتے ہیں۔ دلوں میں پاکیزہ جذبات کی بھیڑ لگی ہوتی ہے۔ ہونٹوں پر اللہ کی حمد و ثناء کے جام ہوتے ہیں۔ اور اگرچہ مسجد الحرام میں عورتوں اور مردوں کی بھیڑ ہوتی ہے لیکن وہاں نہ کوئی عورت ہوتی ہے نہ مرد ہوتا ہے۔

"کیا یہ سچ ہے؟" میں نے قدرت اللہ سے پوچھا۔

"ہاں" وہ بولے "تقریباً"۔

اگر حج وہی پرانا RITUAL ہے تو پھر میاں صاحب جیسے معزز لوگ اس کے لیے کیوں منہ پھاڑ پھاڑ کر روتے ہیں۔

"پتہ نہیں" قدرت اللہ نے کہا۔

قدرت اللہ ایک ایسے تنگ منہ کا مرتبان ہیں اور انہوں نے التزاماً اپنے علم اور مشاہدے کے پانی کی سطح اتنی نیچی رکھی ہوئی ہے کہ اس سے استفادے کے لیے مرتبان میں بہت سے پتھر پھینکنے پڑتے ہیں، جب کہیں جا کر طالب کی چونچ ہری ہوتی ہے۔ اس قدر ہری نہیں کہ پیاس مٹ جائے بلکہ اس قدر ہری کہ تشنگی اور بڑھ جائے۔

قدرت کا روکھا جواب سن کر مجھ میں مزید پتھر مارنے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں نے سوچا اتنی محنت کون کرے اور اگر حج کے کوائف کے متعلق پتہ چل بھی جائے تو کیا فرق پڑے گا۔

بھُس میں آگ:

پھر چند ایک ماہ کے بعد گویا بھس میں آگ لگ گئی۔ حج کے خوابوں کا تانتا بندھ گیا۔

میں کہیں جانے کے لیے سامان باندھ رہا ہوں، کوئی پوچھتا ہے: کہاں جا رہے ہو؟ پیشتر اس کے کہ میں جواب دوں، آواز آتی ہے "یہ حج پر جا رہے ہیں"۔

میں بس میں بیٹھ جاتا ہوں۔ بس چل پڑتی ہے۔ کنڈیکٹر ٹکٹ دینے آتا ہے۔ "میں ملتان جاؤں گا۔" میں اس سے کہتا ہوں۔ سبھی مسافر حیرانی سے میری طرف دیکھتے ہیں اور یک زبان ہو کر چلاتے ہیں "یہ بس تو حج کو جا رہی ہے۔"

"مگر میں تو ملتان ...... روک روکو میں چلاتا ہوں۔" کنڈیکٹر نفی میں سر ہلاتا ہے۔ "بس رکے گی نہیں۔"

ایک بڑھیا آتی ہے۔میرے ہاتھ پر اٹھنی رکھ دیتی ہے۔کہتی ہے "اس کا گیہوں خریدنا اور کبوتروں کو ڈالنا میری طرف سے۔"

"کون سے کبوتر؟" میں پوچھتا ہوں۔

"اے روضہ پاک کے اور کون سے۔"

یہ خوابوں کا سلسلہ تین مہینے تک جاری رہا، حتیٰ کہ میں بوکھلا گیا۔

آیات ہی آیات:

پھر ایک روز میں بک سنٹر سے گزر رہا تھا کہ سامنے ایک کتاب پر نظر پڑی، جس پر جلی قلم سے لکھا تھا: "حج بیت اللہ"۔

میں نے وہ کتاب خرید لی اور گھر جا کر اسے پڑھنے لگا۔کتاب پڑھ کر میں بے حد مایوس ہوا۔کتاب کا لب لباب یہ تھا کہ حج کی نیت کرتے وقت فلاں آیت پڑھو احرام باندھتے وقت فلاں آیت پڑھو روانہ ہوتے وقت فلاں آیت پڑھو۔سر زمین پاک کو پہلی دیکھو تو فلاں آیت پڑھو۔مکہ شریف میں داخل ہوتے وقت فلاں آیت پڑھو۔مسجد الحرام میں داخل ہوتے وقت فلاں آیت پڑھو۔خانہ خدا پر نگاہ پڑے تو فلاں آیت پڑھو۔

ارے تو حج مسلسل آیتیں پڑھنے کا نام ہے۔لیکن اتنی ساری آیات زبانی تو یاد نہیں رہ سکتیں۔میں نے سوچا۔زائرین اپنے ساتھ چھپی ہوئی آیات کی کتابیں اٹھائے پھرتے ہوں گے۔

پھر جو دیکھتا ہوں تو لاکھوں زائرین کتابیں آنکھوں کے سامنے رکھے فریضۂ حج ادا کر رہے ہیں۔انہیں آیتیں پڑھنے سے اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ آنکھ اٹھا کر دیکھیں کہ وہ کس کے حضور میں کھڑے ہیں، کس کے در پر استادہ ہیں۔

اور کتابوں کی اوٹ میں بیت اللہ تن تنہا کھڑا ہے...... اداس اکیلا......

ارے کیا میاں صاحب اس حج کے لیے زاروقطار رو رہے تھے! بات اور بھی الجھ گئی۔ میں نے سوچا کہ چلو قدرت سے ملو، چاہے مرتبان میں کتنے ہی پتھر ڈالنے پڑیں۔ کتنی ہی محنت کرنی پڑے، کر گزرو، شاید کچھ پلے پڑ جائے۔

پتہ نہیں کون سی تزک میں تحریر ہے کہ فتح پور سیکری میں ایک بہت بڑا پتھر ہے جو بظاہر سوکھا نظر آتا ہے، لیکن اس پر کنکر مارو تو پانی کے قطرے اڑتے ہیں۔

میں نے بہت سے کنکر اور خالی شیشی جیب میں رکھ لیے، اور قدرت اللہ کی طرف چل پڑا۔ ان دنوں قدرت اللہ لاہور چھاونی میں الگن روڈ پر ایک وسیع و عریض لیکن بوسیدہ اور ویران کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

پہلا حج:

"آپ نے حج کیا ہے؟" میں نے پہلا کنکر مارا۔

"ہاں کیا ہے"۔

"طیارے سے گئے تھے؟"

"نہیں"

"پیدل گئے تھے؟"

"نہیں"

"پھر کیسے گئے تھے؟"

"بس سے گیا تھا"

قدرت اللہ سے سوالات پوچھنا، اچھی خاصی سر دردی کا باعث ہوتا ہے۔ سوالات پوچھو تو ان کا رویہ مجرم کا سا ہوتا ہے جو پولیس کے ہتھے چڑھا ہوا ہو۔ جسے جھوٹ بولنا گوارا نہ ہو مگر سچ کہہ دینے سے حتی الوسع بچنا چاہتا ہو۔

سوالات کا جواب دیتے وقت ان کا رویہ اس قدر خالصتاً منطقی ہوتا ہے جس

قدر ارسطور کا ہوتا تھا۔

ایک دہقان ارسطو کا فین (FAN) تھا۔ وہ گاؤں سے چل کر بڑے شوق سے ارسطو سے ملنے آیا۔ شہر آ کر پوچھتے پوچھتے وہ ارسطو کے گھر پہنچا۔ اتفاق سے اس وقت ارسطو حکیم کی دکان پر جانے کے لیے گھر سے باہر نکل رہا تھا۔

دہقان نے پوچھا ''یہ ارسطو کا گھر ہے؟''

''جی ہاں''۔ ارسطو نے جواب دیا۔

''ارسطو اندر ہے کیا؟''

''نہیں''

''وہ کہاں ملے گا؟''

''حکیم صاحب کی دوکان پر''۔

''حکیم صاحب کی دوکان کہاں ہے؟''

ارسطو نے اتا پتا بتایا۔

کچھ دیر کے بعد دہقان حکیم صاحب کی دوکان پر پہنچا۔ حکیم سے کہا ''مجھے ارسطو سے ملنا ہے۔'' حکیم نے ارسطو کی طرف اشارہ کیا ''یہ ہے ارسطو''۔

''اچھا تو تُو ارسطو ہے۔''! دہقان نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں'' ارسطو بولا۔ ''میں ارسطو ہوں''۔

دہقان کو غصہ آ گیا، بولا ''تو نے مجھے وہاں کیوں نہ بتایا کہ تو ارسطو ہے''۔

ارسطو نے جواب دیا ''تو نے وہاں یہ نہیں پوچھا تھا کہ تو ارسطو ہے؟ پوچھتا تو بتا دیتا۔''

جواب دینے میں قدرت اللہ بھی سمجھ لیجئے ارسطو ہیں۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ سوال پوچھنے میں میں اس دہقان کا چھوٹا بھائی ہوں۔ جواب لینے کے لیے

مجھے مناسب سوال کرنا نہیں آتا۔

میں نے پوچھا "مکہ شریف میں ٹھہرے کہاں تھے؟"

کہنے لگے۔ "ایک نالے کے کنارے"۔

میں نے پوچھا۔ "نالے کے کنارے ہوٹل تھا کیا؟"

بولے "نہیں"

"مکان تھا؟"

"نہیں"

"کیا تھا؟"

"نالے کے کنارے نالے کا کنارہ تھا۔" قدرت اللہ نے جواب دیا

"اتنے دن نالے کے کنارے پر پڑے رہے! زمین پر؟"

"نہیں، میں نے وہاں ایک دری بچھالی تھی"۔

"وہاں دری پر پڑے رہتے تھے؟"۔

"ہاں"۔

"پاس پیسے نہیں تھے کیا؟"

"نہیں"

"گھر سے پیسے نہیں لے گئے تھے"۔

"لے کر گیا تھا"۔

"تھوڑے ہوں گے؟"

"نہیں کافی تھے"۔

"ان دنوں عہدہ کیا تھا؟"

"صدر کا مشیر تھا"۔

''تو پیسے چوری ہو گئے تھے؟''

''نہیں''۔

''کسی کو دے دیئے تھے؟''

''ہاں''۔

''پاس کچھ نہ رکھا؟''

''رکھا تھا''۔

''کتنا رکھا تھا؟''

''جتنے میں دو روٹیاں خریدی جا سکیں''۔

''باقی خیرات کر دیئے؟''

''ہاں''۔

''روٹی کے ساتھ کیا کھاتے تھے؟''

''دال''۔

''دال کہاں سے ملتی تھی؟''۔

''تندور والا دیتا تھا۔''

''مفت؟''۔

''ہاں مفت''

توبہ ہے، قدرت سے کون سر کھپائے۔ ساری کنکریاں ختم ہو گئیں لیکن بوتل میں ایک قطرہ پانی نہ پڑا۔ میں نے سوچا چلو گھر چلو۔ حج سے متعلق معلومات حاصل کیے بغیر کیا میری زندگی ادھوری رہ جائے گی۔ کیا فرق پڑتا ہے

ایلگن روڈ کا مست:

عین اس وقت باہر سے شور کی آواز بلند ہوئی۔ بہت سے لوگ چیخ رہے

تھے۔ ہم باہر نکلے، کوٹھی کے صحن میں بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ ان کے درمیان ایک نوعمر شخص تھا۔ وہ دیوانوں کی سی باتیں کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ چلایا: "وہ آ گئے، وہ آ گئے" اور پھر ہماری طرف بھاگا۔

کمرے میں لے جا کر قدرت نے اسے کرسی پر بٹھا دیا۔

کرسی پر بیٹھ کو وہ غصے سے کہنے لگا: "تو اسے بتاتا کیوں نہیں؟"

"کیا" قدرت نے پوچھا۔

"جو یہ پوچھ رہا ہے"۔ اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا اور قدرت کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"اس نے پانچ حج کرنے ہیں۔ ابھی چار باقی ہیں"۔

"تو بھی جائے گا، تو بھی جائے گا"۔ وہ بولا "تیری فائل بنی ہوئی ہے، ابھی دستخط نہیں ہوئے۔"

جب وہ چلا گیا تو میں نے قدرت سے کہا "اللہ میاں کے ہاں بھی کیا فائلیں چلتی ہیں۔"

"ہاں کہتے ہیں"۔

"اسی طرح جس طرح ہمارے ہاں سکریٹریٹ میں چلتی ہیں؟"

"ہاں"۔

"کیا وہاں کے دفتروں میں بھی ایسی ہی دھاندلی ہے؟"

قدرت ہنس پڑے "پتہ نہیں"۔

"قرائن سے تو ایسے ہی لگتا ہے؟"

"ہاں" وہ بولے "لگتا تو ایسا ہی ہے"۔

"اچھا۔ مجھ سے ایک وعدہ کیجئے"۔

"کیا" وہ بولے۔

"جب بھی آپ حج پر جائیں مجھے ساتھ لے جائیے"۔

"اچھا"۔ وہ بولے "لے جاؤں گا، اگر گیا تو"۔

میں نے کہا "اگر مجھے جانا ہی ہے تو اکیلے جانا بےکار ہوگا"۔

"کیوں؟" انہوں نے پوچھا۔

"وہاں مجھے کون جانتا ہے، وہاں میری کیا حیثیت ہوگی؟"

"وہاں کسی کی حیثیت نہیں ہوتی۔ وہاں سب ایک ہوتے ہیں۔ سب برابر ہوتے ہیں، وہاں صرف ایک رشتہ ہوتا ہے"۔

"کون سا؟" میں نے پوچھا۔

اللہ اور عبد:

مکہ شریف میں اللہ اور عبد ہوتے ہیں۔ مدینے شریف میں رسول اور امتی ہوتے ہیں"۔

"وہاں بزرگ نہیں جاتے کیا؟"

"جاتے ہیں؟"

"تو پھر؟"

"مسجد میں داخل ہونے سے پہلے سب کو جوتوں کے ساتھ ساتھ مرتبے اور بزرگی کے عمامے بھی اتار دینے پڑتے ہیں۔ اور کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا ہے کہ واپسی پر اس کا عمامہ اسے مل بھی جائے گا"۔

"پھر تو مرتبے والے بزرگ فکرمند رہتے ہوں گے۔ عام بندے مزے میں ہوں گے۔ اس فکر سے آزاد"۔

"ہاں" وہ بولے۔

"آپ کو کیسے پتہ ہے؟"

"اقبال نے جو بھانڈا پھوڑ دیا ہے: تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے"۔

"اقبال کو پتہ تھا؟"۔

"ہاں"

"کیسے پتہ تھا؟"

"وہ صاحب نظر تھے"۔

"کیا وہ اللہ اور عبد کے تعلق سے واقف تھے؟"

"ہاں"۔

دفعتاً میں نے محسوس کیا جیسے اللہ اور اس کے رسولؐ کا مجھ سے گہرا تعلق ہو۔ میرے دل سے منہ زبانہ مسلمان ہونے کا کانٹا نکل گیا۔ میرے بند بند میں ایک نیا رشتہ ابھرا۔ میں عبد ہوں۔ عبد ہوں، میرا خالق مجھے بلا رہا ہے۔ میں جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا۔ حج کرنے کے نہیں، اپنے اللہ کو سلام کرنے کے لیے۔ اپنے خالق کا شکریہ ادا کرنے کے لیے کہ اس نے مجھے بنایا۔ ایسا بنایا کہ جیسا میں ہوں۔ میں جاؤں گا، اپنے اللہ کو منانے کے لیے جاؤں گا۔ یہی عبدیت کی غایت ہے کہ بنانے والے کو منایا جائے۔

کمرے پر خاموشی طاری تھی۔ اس سنسان کوٹھی کے درختوں کی شاخیں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ دور کوئی چکی چلا رہی تھی:

"عبد ہو۔ رسولؐ ہو۔ عبد ہو۔ رسولؐ ہو"۔

مانگے نہ ملے بھیک:

سناٹا:

''بن مانگے موتی ملیں، مانگے ملے نہ بھیک''۔ سچ کہتے ہیں۔ جب تک طلب نہ تھی، راہ چلتے مست اور فقیر مجھے حج پر جانے کی خوشخبری سناتے تھے۔ میرے خواب حج کی نوید سے بھرے ہوئے تھے۔ پھر جب طلب بیدار ہوئی تو سب چپ ہو گئے۔ خواب بند ہو گئے۔ میں نے محسوس کیا جیسے ایک سناٹا طاری ہو گیا ہو۔ گہرا عظیم سناٹا۔

میرے دوست اشفاق احمد، بانو قدسیہ، احمد بشیر، ابن انشاء، قیصر سب سکہ بند دانشور ہیں۔ میری بات سن لیتے ہیں، وقتی طور پر متاثر بھی ہو جاتے ہیں، لیکن التزاماً اسے پلے سے باندھنے سے گریز کرتے ہیں۔ اس لیے کہ دانشور کا مسلک شک کرنا ہے، پلے باندھنا نہیں۔

میرے دوست محمد طفیل بذات خود ٹیلی پیتھک شخصیت ہیں۔ ان میں ایک ریسور لگا ہوا ہے۔ ان کی اپنی زندگی میں چوتھی سمت کے مشاہدات و احساسات موجود ہیں لیکن وہ محمد نقوش کے رعب کی وجہ سے اپنے ان مشاہدات کا تذکرہ نہیں کرتے۔ محمد نقوش سے دبتے ہیں، اسی وجہ سے ان کی شخصیت دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ محمد نقوش سوچتا ہے لکھتا ہے، محمد طفیل صرف دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے، ہچکچاتا ہے اور منہ تکتا ہے۔

میرے دوست غلام دین دانی نور محمد اور راجہ شفیع میری باتوں کو قابل یقین سمجھتے ہیں، لیکن ان میں توازن کا فقدان ہے۔ ایمان کے اتنے انبار لگے ہوئے کہ شک کی گنجائش ہی نہیں۔ ادھر جینے کی پابندی ادھر مرنے کی پابندی۔

پتہ نہیں توازن کی کیفیت اتنی کمیاب کیوں ہے کہ افراد میں یا تو عقلی شکوک کے ڈھیر لگ جاتے ہیں اور یا ایمان کے دھارے بہنے لگتے ہیں۔توازن کی کیفیت میں نے صرف قدرت اللہ میں پائی ہے۔قدرت اللہ کے شکوک اور ایمان میں عجیب سی ہم آہنگی ہے۔ایمان شکوک کی کاٹ نہیں کرتا۔اور شکوک ایمان کے راستے میں حائل نہیں ہوتے بلکہ اسے تقویت دیتے ہیں۔

میرے دل کی تڑپ یا طلب قدرت کی وجہ سے تھی اس لیے میرے لیے وہ وسیلہ بن گئے تھے۔

انہی دنوں قدرت اللہ پر ایک ایسی افتاد آپڑی کہ میری توجہ حج سے ہٹ کر قدرت اللہ پر مرکوز ہوگئی۔

قدرت کا تبادلہ:

پتہ نہیں کیوں بیرونی طاقتیں ہمیشہ سے قدرت اللہ کو اپنے راستے کی رکاوٹ سمجھتی رہی ہیں۔ان کا خیال تھا کہ صدر کے سیکرٹری ہونے کی حیثیت سے قدرت اللہ کا صدر پاکستان پر ایسا اثر ہے جو بیرونی طاقتوں کے مفاد میں رکاوٹ بنا رہتا ہے۔

عرصے دراز کی کوششوں کے بعد وہ کامیاب ہوگئے اور قدرت اللہ کو سیکرٹری صدر کے عہدے سے سبکدوش کرکے اطلاعات کا سیکرٹری لگا دیا گیا۔

اس تبادلے کے بعد بیرونی طاقتوں پر انکشاف ہوا کہ بات تو وہیں کی وہیں رہی اور قدرت عملی طور پر جوں کے توں اثر انداز ہیں۔لہذا بیرونی طاقتوں نے شدید دباؤ ڈالا۔نتیجہ یہ ہوا کہ قدرت کو مرکزی حکومت سے الگ کرکے صوبائی حکومت میں فائز کر دیا گیا۔

اس تبادلے کی وجہ سے ہماری توجہ حج سے ہٹ کر دوسرے معاملات پر مرکوز

ہوگئی۔

پتہ نہیں کیوں اس تبادلے پر قدرت اللہ نے اپنا استعفیٰ صدر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ استعفیٰ احتجاج کا مظہر نہ تھا۔ عرصہ دراز سے قدرت کی خواہش تھی کہ نوکری چھوڑ کر کوئی لکھنے پڑھنے کا کام کریں۔

صدر ایوب نہیں چاہتے تھے کہ قدرت اللہ کا استعفیٰ منظور کریں۔ قدرت اللہ ضد کر رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس بات پر پورا ایک مہینہ صدر اور قدرت کے درمیان مذاکرات ہوتے رہے۔ صدر متحمل مزاج تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وقت جذبات کمزور کرنے اور حالات سنوارنے کی واحد کنجی ہے، اس لیے وہ معاملے کو طول دیتے رہے۔ انہوں نے قدرت اللہ کو یہ پیش کش بھی کر دی کہ اپنے لیے کوئی سا عہدہ پسند کر لیں۔ آپ کی وہاں تعیناتی کر دی جائے گی لیکن قدرت نوکری چھوڑنے پر مصر تھے۔

انہی دنوں اتفاق سے ایک درویش آ گئے۔ انہوں نے قدرت کو مشورہ دیا کہ کیوں نہ آپ سفیر بن کر کچھ عرصے کے لیے ملک سے باہر چلے جائیں۔ قدرت اللہ کو یہ بات قابل قبول نظر آئی۔ ان کی خواہش تھی کہ کوئی دور کی جگہ ہو، چھوٹا سا ملک ہو۔ اتفاق سے ہالینڈ کی سفارت خالی تھی۔

لہذا صدر نے انہیں ہالینڈ کا سفیر بنا کر بھیج دیا۔

قدرت کے جانے کے بعد میرے نزدیک حج کا سارا منصوبہ ہی ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ ایک سناٹا چھا گیا۔ خواب آنے بند ہو گئے۔ مستوں نے مجھے سرِ راہ روکنا چھوڑ دیا۔ فقیر خاموش ہو گئے اور میں گویا ایک خلا میں ٹانگ دیا گیا۔

حج کی عرضی:

مہینے گزر گئے، پھر ہالینڈ سے قدرت کا خط موصول ہوا۔ لکھا تھا، مایوس نہ

ہوں۔اللہ کے در پر ناامیدی گناہ ہے۔انشاءاللہ ہم ضرور حج پر حاضری دیں گے۔ آپ حج کے لیے عرضی گزاردیں۔

قدرت اللہ کے اس خط نے اس ازسرنو امید کا دیا روشن کردیا۔ میں سمجھا کہ خوابوں کی تعبیر کا وقت آگیا ہے۔

میں نے عرضی کا فارم منگوایا۔کوائف درج کیے۔رقم جمع کروائی اور پھر تیاری میں مصروف ہوگیا۔

عرضی دیتے وقت میرا ایمان تھا کہ جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ قرعہ اندازی کریں گےتو اللہ میاں خود آکران کے پاس بیٹھ جائیں گے اور کہیں گے میاں ممتاز مفتی کا نام ضرورنکالو۔اسے ہم ہم نے خود بلایا ہے۔بڑی مشکل سے حج پر آنے کے لیے رضامند کیا ہے۔کہیں پھر سے منکر نہ ہوجائے اور قرعہ میں میرا نام نکلوانے کے بعد وہ فنافٹ مکہ معظمہ پہنچیں گے،تا کہ بروقت مجھے RECEIVE کرنے کا بندوبست کرلیں۔

جب مجھے علم ہوا کہ قرعہ میں میرا نام نہیں نکلا تو میں ہکا بکا رہ گیا۔ مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ میرا نام نہیں نکلا۔کئی ایک روز تو میرا ذہن ماؤف رہا۔پھر میں نے قدرت کو اطلاع دی کہ میرا نام قرعہ اندازی میں نہیں نکلا۔

جواب میں انہوں نے لکھا کہ نہیں نکلا تو کوئی بات نہیں۔آپ اگلے سال پھر عرضی گزاردیں۔اگلے سال پھر میرا نام نہ نکلا تو پھر دھچکا لگا۔

امید وبیم:

پھر دو مہینے ایک جمود سا طاری رہا۔طلب ہچکیاں لے لے کر ساکت ہوگئی۔

جب تیسرے سال بھی قرعہ اندازی میں میرا نام نہ نکلا تو میں مایوس ہوگیا۔

حج کے خواب پھر سے شروع ہوگئے۔اب ان خوابوں میں کوئی خوشخبری نہ

ہوتی تھی بلکہ رکاوٹیں پیدا ہونے کی خبر سنائی جاتی۔ کبھی راستے میں سانپ آ کھڑا ہوتا، کبھی راستہ کا پل بیٹھ جاتا، کبھی کوئی خوف ناک مست راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا۔

میں نے قدرت کو لکھا کہ خوابوں سے ظاہر ہے کہ حج کی بات فسخ ہوگئی۔ میں مایوس ہو چکا ہوں۔

قدرت نے جواب دیا "آپ کے مایوس ہو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے کبھی مایوس نہیں ہوتا"۔

ان طفل تسلیوں سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ میں نے سوچا ہٹاؤ، وہاں جا کر کرنا ہی کیا ہے۔ ایک سال گزر گیا۔

پھر ایک روز قدرت کا خط موصول ہوا۔ لکھا تھا انشاءاللہ اس سال بیت اللہ میں حاضری دیں گے۔ آپ تیار رہیں۔ درخواست دے دیں۔ اگر قرعہ اندازی میں نام نہ نکلا تو بیروت پہنچ جائیں۔ میں بھی بیروت پہنچ جاؤں گا۔ وہاں کوئی نہ کوئی انتظام ہو جائے گا۔ انشاءاللہ ہم منزل مقصود پر پہنچ سکیں گے۔

اس خط کی آمد کے بعد میں حج پر جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ سب سے پہلے میں نے سات آٹھ کتابیں خریدیں۔ ان سب کو بار بار پڑھا۔ نقشے حاصل کئے۔ جدہ، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، منیٰ، مزدلفہ، عرفات سب مقامات کو پن پوائنٹ کیا۔

حج کے ارکان کی فہرست بنائی۔

ممنوعات کو الگ قلم بند کیا۔

بھولی نماز کو از سر نو رٹا۔

پھر میں نے حج کے ارکان کو سلسلہ وار لکھا اور آخر میں ان آیات کے معنی یاد

کرنے لگا جو حج کے دوران مختلف مقامات پر پڑھنی ضروری تھیں۔

فائنل لسٹ:

انہی دنوں جب میں حج کی تیاری کرنے میں شدت سے مصروف تھا، قدرت کے ایک جاننے والے بزرگ ایڈووکیٹ صاحب پنڈی تشریف لے آئے۔

میں نے کہا "ایڈووکیٹ! آپ یہاں کیسے"۔

کہنے لگے "پنڈی ایک کام سے آیا تھا۔ سوچا آپ کو اطلاع دیتا جاؤں تاکہ آپ ناحق کی کوفت سے بچ جائیں"۔

"قدرت اللہ صاحب کا خط موصول ہوا ہے جس میں تحریر ہے کہ وہ اس سال حج پر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں"۔

"جی ہاں" میں نے جواب دیا "مجھے علم ہے"۔

"میں نے انہیں مطلع کر دیا ہے کہ اس سال آپ حج پر نہیں جا رہے۔"

"لیکن وہ جا رہے ہیں"۔ میں نے ان کی بات کاٹی۔ "انہوں نے پروگرام بنا لیا ہے۔ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ نہیں جا رہے"۔

"میں نے وہ لسٹ دیکھی ہے"۔ وہ مسکرا کر بولے۔

"کون سی لسٹ؟"

"زائرین کی لسٹ"

"زائرین کی لسٹ؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "ابھی تو قرعہ اندازی نہیں ہوئی"۔ ایڈووکیٹ نے پراسرار انداز سے میری طرف دیکھا اور پھر مسکرا دیئے۔ "وہ لسٹ نہیں" وہ بولے۔

"تو پھر کون سی لسٹ؟" میں نے پوچھا۔

"جو زائرین اس سال حج پر حاضری دیں گے"۔ وہ پھر مسکرائے۔ "مدینہ منورہ سے جن کی منظوری مل چکی ہے، وہ لسٹ۔ اس لسٹ میں نہ تو شہاب صاحب کا نام ہے نہ آپ کا"۔

حیرت سے میں ہکا بکا ایڈووکیٹ صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ مسکرائے۔ پھر بولے۔ "بھائی میں نے تو متعدد بار آپ کی فائل دستخط کے لیے پیش کی لیکن ہر بار اسے دستخط کے بغیر لوٹا دیا گیا۔"

میں نے حیرت سے ایڈووکیٹ کی طرف پھر دیکھا۔

"خیر کوئی بات نہیں" وہ بولے۔ "دیر آید درست آید۔" شہاب صاحب کو ان تفصیلات کا علم ہے۔ وہ جلد آپ کو اطلاع دیں گے۔"

ایڈووکیٹ صاحب کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ انہیں بھلا کیسے پتہ چلا کہ اس سال کون حج کرے گا، کون نہیں کرے گا، اور یہ لسٹ کیا چیز ہے۔ کیا حج کرنے والوں کی لسٹ قرعہ اندازی سے پہلے ہی تیار ہو جاتی ہے۔ ایڈووکیٹ صاحب کی ساری بات ہی مہمل تھی۔

ایڈووکیٹ صاحب ہمیشہ عجیب باتیں کیا کرتے تھے۔

ایڈووکیٹ صاحب:

ہم ۱۹۶۱ء میں ایڈووکیٹ صاحب سے متعارف ہوئے تھے۔ ایک روز شہاب کے نام ان کا خط موصول ہوا تھا۔ لکھا تھا: "میں خوشاب ایڈووکیٹ ہوں۔ مجھے کئی ایک ذرائع سے معلوم ہوا تھا کہ آپ ایک اچھے آدمی ہیں۔ اس لیے میرے دل میں آپ کے لیے خیر خواہی کا جذبہ بیدار رہا۔ پھر میں نے سنا کہ آپ ہاں اولاد نہیں ہوتی۔ اس پر مجھے بہت قلق ہوا۔ اللہ کے فضل و کرم سے میں نے کبھی تہجد قضا نہیں کی۔ اس سے میں نے معمول بنالیا کہ بلا ناغہ تہجد میں اللہ پاک کے حضور میں

التجا کرتا کہ آپ کو بچے سے نوازے۔

اللہ تعالیٰ نے فضل و کرم سے میری گزارش کو شرفِ قبولیت بخشا ہے۔ کل رات مجھے یہ خوش خبری دی گئی ہے کہ آپ کے ہاں بچہ تولد ہو گا۔ ہونے والا نومولود چند ساعت کے لیے میری گود میں ڈال دیا گیا اور حکم ہوا کہ آپ کو خبر دے دوں کہ ایک سال کے بعد آپ کے گھر فرزند ہو گا۔

آپ کو مبارک ہو۔

"فرزند کی ولادت پر مجھے مطلع فرمائیں"۔

عین ایک سال کے بعد قدرت کے گھر فرزند ہوا حالانکہ میڈیکل رائے کے مطابق پیدائش کا امکان نہ تھا۔

بچہ ایک سال کا ہو گیا تو ایک بزرگ صورت آدمی تشریف لائے۔ انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔ کہنے لگے میں وہی شخص ہوں جس نے دو سال پہلے آپ کو بچے کی ولادت کی خبر دی تھی۔ آپ نے مجھے ولادت کی اطلاع بھی نہ دی۔

اس روز سے ایڈووکیٹ صاحب کے شہاب سے مراسم پیدا ہو گئے۔

بہر حال، وہ تو محض اتفاق تھا کہ بچہ ہو گیا۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ایڈووکیٹ صاحب کی ایسی اوٹ پٹانگ بات کو مان لیا جائے۔

لہذا میں نے اپنی تیاری جاری رکھی اگرچہ اس میں وہ شدت نہ رہی۔ پھر دو دن کے قدرت کا خط موصول ہوا۔ لکھا تھا: بوجوہ اس سال ہم حج پر نہیں جا رہے۔

یہ خط میری عقل سلیم کے کفن میں آخری میخ تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیسی دنیا ہے۔

"تم حج پر جاؤ گے"۔

"تمہاری فائل بنی ہوئی ہے"۔

''ابھی دستخط نہیں ہوئے''۔

''تمہارا نام فہرست میں شامل نہیں اس لیے تم نہیں جا رہے''۔

آخر کیوں خواہ مخواہ مجھے الجھن میں ڈال رکھا ہے۔ میں کب چاہتا ہوں کہ حج پر جاؤں۔

اس بات پر میں کئی ایک دن غصے میں بل کھاتا رہا۔

اسی سال کے اختتام پر قدرت اللہ تین سال کا بن باس کاٹ کر وطن واپس آ گئے۔ میں نے جان بوجھ کر قدرت اللہ سے حج کی بات نہ کی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ پھر سے کسی طوطا مینا کی کہانی میں الجھ کر رہ جاؤں۔

ایلس اور روینڈ رلینڈ:

ایک دن قدرت اللہ نے مجھے فون کیا، بولے ''آپ کے پاس کچھ پیسے ہیں؟''

میں نے کہا ''ہیں''۔

کہنے لگے ''ڈھائی ہزار کے قریب ہوں گے؟''

میں نے کہا ''ہاں ہیں''۔

''کیا آپ آسانی سے انہیں خرچ کر سکتے ہیں؟''

''خرچ کرنے کے لئے ہی تو رکھے ہیں''۔

''میرا مطلب ہے آپ کو وقت تو نہیں ہو گی؟''

میں نے کہا ''نہیں''۔

بولے ''تو آپ ڈھائی ہزار کا چیک سلف کے نام کاٹ کر لے آئیں میرے پاس ساتھ اپنا پاسپورٹ بھی لے آئیں''۔

جب میں قدرت اللہ کے پاس پہنچا تو وہ بولے۔

"ہم حج پر جارہے ہیں اسی سال انشاءاللہ"۔

میں نے کہا "قرعہ اندازی تو ہو چکی۔ ہم نے تو عرضی نہیں گزری تھی"۔

بولے "کوئی بات نہیں"۔

"پھر ہم کیسے جائیں گے"۔

"انشاءاللہ" وہ بولے۔

"آپ نے فہرست دیکھ لی ہے کیا؟" میں نے طنزاً کہا۔

"کون سی فہرست؟"

"جس فہرست میں پچھلے سال ہمارا نام شامل نہیں تھا۔"

قدرت نے میری طرف دیکھا اور مسکرا دیئے۔

"پچھلے سال ایڈووکیٹ صاحب نے اطلاع دی تھی نا کہ آپ کا نام لسٹ میں شامل نہیں۔"

میں نے کہا "ہاں انہوں نے اطلاع دی تھی۔"

"کیا اب انہوں نے آپ کو اطلاع دی ہے کہ آپ کا نام فہرست میں شامل ہے؟" میں نے طنزاً کہا۔

"ایڈووکیٹ صاحب تو فوت ہو گئے"۔ قدرت اللہ نے کہا "بہت عابد آدمی تھے۔ عمر بھر انہوں نے کبھی تہجد قضا نہ کی تھی۔"

بات بدلنے میں قدرت اللہ کا جواب نہیں۔ جب بات ایسے موڑ پر آ جائے کہ پکڑے جانے کا امکان ہو تو وہ موضوع بدل دیتے ہیں۔ میں نے کہا "میں تو جب مانوں گا کہ ہم حج پر جا رہے ہیں جب میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

"یہ تو بڑا اچھا ہے کہ آپ پہنچ کر مان جائیں۔ کئی لوگ تو پہنچ کر بھی نہیں مانتے۔" وہ مسکرائے۔

گذشتہ تین چار سال سے ایسے واقعات رونما ہو رہے تھے کہ میری عقل سلیم ماؤف ہوکر رہ گئی تھی۔ میں ایک ایسی ایلس بن کر رہ گیا تھا جو ونڈر لینڈ میں کھو گئی ہو۔

تیاری:

حج پر جانے کے سارے انتظامات یوں گھر بیٹھے بیٹھے ہو گئے۔ ویزا حاصل کر لیا گیا، فارن ایکسچینج مل گیا، ٹیکے لگوا لئے گئے، بکنگ ہو گئی لیکن مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ہم واقعی جا رہے ہیں۔ جب تک دوڑ دھوپ نہ ہو، تگ و دو نہ ہو، امید و بیم نہ ہو، کیسے یقین آئے بھلا۔

ادھر قدرت تھے۔ وہ یوں اطمینان اور سکون سے بیٹھے تھے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ انہیں دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ تیاری کے عالم میں نہ ہوں بلکہ اس کے برعکس کے بڑ کے درخت کے تلے نروان حاصل کئے بیٹھے ہوں۔

کوئی ملنے والا آ کر پوچھتا کہ آپ حج کے لیے جا رہے ہیں کیا؟ تو وہ کہتے دعا کیجئے۔ اس بات پر مجھے شک پڑنے لگتا کہ شاید ہمارا جانا یقینی نہیں ہے، کیونکہ "دعا کیجئے" تو ان باتوں کے متعلق کہا جاتا ہے جو طے شدہ نہ ہوں۔

میں حیرت سے قدرت کی طرف دیکھتا۔ اس وقت مجھے توقع ہوتی کہ قدرت چپکے سے مجھے آنکھ مار کر یقین دلائیں کہ ہم تو جا رہے ہیں، یقینی طور پر جا رہے ہیں۔ ایسی بات کہہ کر میں اسے ٹرخا رہا ہوں۔ میری استفسارانہ نگاہ دیکھ کر بھی قدرت کے رویئے میں کوئی تبدیلی نہ آتی۔ نہ وہ آنکھ مارتے، نہ اشارہ کرتے، نہ ہی آنکھ چمکاتے۔

اس وقت میری کیفیت عجیب سی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ خوشی میں ناچوں کودوں۔ جی چاہتا تھا کہ شہر کے ہر مکان کی کنڈی بجاؤں اور جب کوئی باہر آئے تو کہوں: جی آپ کو نہیں پتہ کیا؟ میں حج پر جا رہا ہوں۔

اس کے برعکس قدرت کہہ رہے تھے "دعا فرمائیں"۔

پروگرام:

قدرت نے روانگی کا پروگرام ایسا بنایا کہ روانگی کا سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔ انہوں نے کہا مجھے لاہور اور کراچی میں ایسے سرکاری کام ہیں جنہیں روانگی سے پہلے سرانجام دینا ضروری ہے۔ لہٰذا ہم راولپنڈی سے روانہ ہوئے تو احباب نے سمجھا کہ دورے پر جا رہے ہیں۔

لاہور پہنچ کر قدرت نے سرکاری کام کرنے شروع کر دیئے اور اپنے اردگرد دفتر لگا لیا جیسے حج پر روانگی ایک جملۂ معترضہ ہو۔

قدرت کے اس رویئے نے میرے ذوق شوق پر گیلا بوریا ڈال دیا۔

لاہور میں اشفاق اور بانو قدسیہ کا رویہ بھی عجیب سا تھا۔ یا تو اشفاق میں جذبے کی شدت سرے سے ہی مفقود ہے یا اس میں شدتِ احساس پیدا ہو جائے تو اس کے جسمانی اعضاء شل ہو کر رہ جاتے ہیں اور شدت کا اظہار نہیں ہو پاتا۔

اشفاق ہم سے ملا تو قدرت سے کہنے لگا "یار کیا واقعی تو حج پر جا رہا ہے؟ صورت شکل سے تو ایسا نہیں لگتا"۔

اشفاق قدرت کا پرانا دوست ہے اور ان معدودے چند لوگوں میں سے ہے جو بے تکلفی سے بات کرتے ہیں۔

البتہ بانو قدسیہ اور ان کی والدہ بار بار میری طرف حیرت اور حسرت سے دیکھتیں "اچھا تو کیا واقعی آپ جا رہے ہیں"!

دو دن لاہور قیام کرنے کے بعد ہم کراچی پہنچے۔ وہاں بھی قدرت اپنے اردگرد دفتر لگا کر بیٹھ گئے اور میں قیصر اور ابن انشاء کے پاس چلا گیا۔ ابن انشا اظہار میں بچے کے مصداق ہے۔ وہ شدت سے محسوس کرتا ہے۔

ابن انشاء پہلا شخص تھا جس نے مجھے یہ احساس دیا کہ میں حج پر جا رہا ہوں اور حج پر جانا ایک عظیم واقعہ ہے۔ اور مبارک ہیں وہ لوگ جنہیں حج پر جانے کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔

کے اور ہے:

کاش کہ میں اس روز میں کچھ دیر کے لیے ابن انشاء کے پاس رکتا لیکن قیصر نے مجھے رکنے نہ دیا۔ وہ مجھے گھر لے گیا۔ قیصر مجھے یوں ملا جیسے میں کراچی میں شاپنگ کی غرض سے آیا تھا۔ کہنے لگا "ہاں بھئی کیا پروگرام ہے۔ چلو فلاں ہوٹل میں جا کر چائے پئیں، فلاں مقام پر ٹہلیں۔ ہاں یار بڑی عمدہ فلم لگی ہوئی ہے۔ سچے معنوں میں فارایڈلٹس قسم کی۔ کہتے ہیں سنسر نے چوتھائی فلم کاٹ دی ہے، پھر بھی کچھ مقامات رہ گئے ہیں۔ آپ رات پکچر رہے گی"۔ میں نے کہا "بھئی عقل کی بات کرو۔ ہم یہاں سے حج کو جانے کے لیے آئے ہیں"۔ قیصر مسکرانے لگے۔ اس کی مسکراہٹ میں شیطانیت کی جھلک ہوتی ہے۔

قیصر میرا پرانا ساتھی ہے۔ وہ ایک سکہ بند دانشور ہے۔ وہ مذہبی اور روحانی باتوں کو طوطا مینا کی کہانیوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ اس سے کوئی روحانی بات کی جائے تو اس کا ردعمل AMUSED DISBELIEF کا مظہر ہوتا ہے۔

قیصر کو قدرت سے شدید چڑ ہے۔ وہ قدرت کی قابلیت کو تسلیم کرتا ہے، اس کی دانشوری کو مانتا ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں مانتا۔ وہ قدرت سے ملنے سے گریز کرتا ہے۔

دو روز قیصر کے ساتھ رہنے کے بعد میں یہ بات قطعی طور پر بھول گیا کہ میں حج پر جا رہا تھا۔ پھر دفعتاً آخری دن قدرت نے مجھے فون کیا کہ آج شام کو فلاں وقت حاجی کیمپ میں پہنچ جائیں تا کہ ہم وہاں سے حج کے متعلقہ ضروریات خرید

لیں۔

شام کو ہم حاجی کیمپ پہنچے۔ قدرت اور ڈاکٹر عفت منتظر تھے۔ ہم نے احرام خریدے۔ جوتے اور حاجی بیگ خریدے، اس کے باوجود مجھے کوئی احساس نہ ہوا کہ میں حج پر جا رہا ہوں۔ ایسے لگتا تھا جیسے میرا ذہن سن ہو چکا ہو اور خون رگوں میں دوڑنے کی بجائے رینگ رہا ہو۔

خرید و فروخت کے بعد قدرت نے کہا "ہم رات کے ایک ڈیڑھ بجے ائیر پورٹ پر پہنچ جائیں گے چونکہ ہمارا طیارہ رات کے تین بجے روانہ ہوگا اور آپ کا طیارہ صبح پانچ بجے رانہ ہوگا' آپ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے پہنچ جائیں تو مناسب ہوگا"۔

اس روز قدرت کی بات سن کر مجھے پہلی مرتبہ علم ہوا کہ ہم الگ الگ طیاروں میں جدہ جا رہے تھے۔ اس پر میں حیران تو ہوا لیکن یہ پوچھنے کا موقع نہ تھا کہ ایسا کیوں ہے۔

اسی رات قیصر مجھے زبردستی وہ فلم دیکھنے لے گیا جو حقیقتاً "فارایڈلٹس" تھی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ہم فلم دیکھنے نہ جائیں لیکن قیصر کا کہنا تھا کہ فلم دیکھنا ضروری ہے۔ دوسری صورت میں اگر ہمیں نیند آ گئی اور ہم سو گئے تو ائیر پورٹ پر کیسے پہنچیں گے۔

اس فلم کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ اسے دیکھتے ہوئے میں قطعاً بھول گیا کہ اسی رات مجھے حج پر روانہ ہونا ہے۔ فلم دیکھ کر باہر نکلے اور جب ارم اور جے نے مجھے یاد دلایا کہ ابھی مجھے تیاری کرنا ہے تو ایک ساعت کے لیے میں حیران رہ گیا۔

نیت قارن:

گھر پہنچ کر میں نے زندگی میں پہلی بار غسل کیا۔ اس سے پہلے میں صرف نہایا کرتا تھا۔ غسل کے بعد جب میں نے احرام پہنا تو قیصر قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ جے

نے قیصر کو ڈانٹا لیکن قیصر کب کسی کی ماننے والا ہے۔اس کے قہقہے کو سن کر میں نے دوڑ کر آئینہ دیکھا۔ سچی بات یہ ہے کہ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر میرا بھی جی چاہا کہ قہقہہ مار کر ہنسوں۔میرے روبرو گویا ایک بہروپیا کھڑا تھا۔چہرے پر نہ پاکیزگی تھی، نہ خلوص تھا، نہ خوشی تھی۔

حج پر جانے والے احرام پوشوں کو میں نے کئی بار دیکھا تھا۔ان کے چہروں پر عقیدت، اشتیاق اور مسرت کا نور ہوتا ہے۔انہیں دیکھ کر ایمان تازہ ہوتا ہے۔ حاضری دینے کی خواہش بیدار ہوتی ہے۔درود شریف کا ورد کرنے پر دل مچل جاتا ہے۔لیکن آئینے میں میرے روبرو جو احرام پوش کھڑا تھا اسے دیکھ کر قہقہہ لگانے کی جی چاہتا تھا۔

احرام پہن کر میں نے پہلے نماز کی وہ چھوٹی سی کتاب کھولی جو جانے سے کئی دن پہلے پنڈی سے خرید لی تھی۔نماز کا ازسرِنو مطالعہ کیا، معانی پڑھے اور پھر ڈی ایف پی کے حج سے متعلق چھپے ہوئے کتابچے میں سے نیت حج کے متعلق ہدایات ازسرِنو پڑھیں۔پھر شدید کوشش سے احترام اور خلوص طاری کر کے قارن کی نیت باندھی۔

وی آئی پی لونج:

نماز سے فارغ ہو کر قیصر، اس کی بیگم بے اور ان کی اکلوتی بچی ارم اور میں، ہم سب ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ارم اس بات پر مصر تھی کہ وہ ہمیں وداع کرنے ضرور جائے گی۔ہم میں سے ارم واحد ہستی تھی جو حج کی خوشی سے چھلک رہی تھی اور ہمارے روانگی کے واقعے کو ایک عظیم واقعہ سمجھ رہی تھی۔

ایئرپورٹ پر قدرت اور ڈاکٹر عفت پہلے ہی موجود تھے۔وہ دونوں یوں بیٹھے تھے جیسے وہ وی آئی پی لونج نہ ہو بلکہ مدینہ منورہ کی کوئی مسجد ہو۔ہم اس لونج میں

چپ چاپ بیٹھے رہے۔صدیاں بیت گئیں۔

تین بجے قریب قدرت کا پی اے داخل ہوا۔ کہنے لگا آپ کا طیارہ لیٹ چلے گا۔ میں اطلاع دوں گا۔ پی اے کے جانے کے بعد پھر سکوت طاری ہو گیا۔ پھر صدیاں بیت گئیں۔فجر کی سفیدی جھلکنے لگی۔

دفعتاً آواز آئی "پی آئی اے طیارہ روانگی کے لیے تیار ہے"۔وہ میرا طیارہ تھا ۔میں اٹھ بیٹھا۔ارم خوشی سے چلانے لگی۔"بابا مبارک ہو"۔قدرت اور ڈاکٹر عفت کو وہیں چھوڑ کر میں لونج سے باہر نکل گیا۔سامنے میرا طیارہ روانگی کے لیے تیار کھڑا تھا۔

جدہ:

وہ ایک عام سا چھوٹا سا طیارہ تھا جیسے درون ملک اڑنے والے طیارے ہوتے ہیں۔ اس طیارے میں دو درجے تھے۔ فسٹ کلاس آگے تھا، عمومی پیچھے، درمیان میں پی آئی اے کا کیبن تھا۔ فسٹ کلاس میں پاکستان کی ہاکی ٹیم میچ کھیلنے کے لیے جا رہی تھی۔ عمومی حصے میں صرف زائرین تھے۔ انہوں نے احرام پہن رکھے تھے۔ ادھر اُدھر بوتلوں، تھیلوں اور ٹوکریوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔

زائرین اور طیارہ:

زائرین کے ہاتھوں میں تسبیحیں تھیں جو دانہ دانہ رینگ رہی تھیں۔ ہونٹ ہل رہے تھے۔ طیارے کی فضا اداس تھی۔ زائرین جذبے سے بھیگے ہوئے تھے، لیکن اس جذبے سے چھینٹے نہیں اڑ رہے تھے، غالباً اس لیے کہ جذبہ خالص خوشی کا جذبہ نہ تھا۔ احترام، ادب اور تشکر نے خوشی کے پر کاٹ کر رکھے تھے۔ یا شاید اس لیے کہ خوشی کا والہانہ جذبہ ادب کے منافی سمجھا جاتا ہے۔

طیارے میں تقدس بھری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں تقدس میں اداسی کیوں پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ اتنی بوجھل کیوں ہوتی ہے۔

جوں جوں طیارہ اڑتا جا رہا تھا توں توں تقدس گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اداسی دبیز ہوتی جا رہی تھی، دل پر بے نام سا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔

زائرین کے چہروں پر کوئی ولولہ نہ تھا۔ آنکھوں میں کوئی ستارہ نہیں چمک رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے ہم سرزمین حجاز کو نہیں جا رہے تھے بلکہ ہمارا طیارہ ہائی جیک ہو چکا تھا۔ ہائی جیکرز ہمیں کسی نامعلوم منزل کی طرف لئے جا رہے تھے اور مسافر اللہ کے حضور دعائیں کر رہے تھے کہ یا اللہ ہمیں اس مصیبت سے بچا۔

کبھی کبھار فسٹ کلاس سے قہقہے کی آواز سنائی دیتی۔ وہ اس قدر اجنبی لگتی، اس قدر بیگانہ محسوس ہوتی، لیکن وہ آواز جلد ہی معدوم ہو جاتی جیسے پانی کا ایک قطرہ ریت میں گر گیا ہو۔

ہائی جیک:

فسٹ کلاس کے قہقہے کی آواز پر میں چونک پڑتا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے وہاں ہائی جیکرز چھپے ہوئے ہوں اور اپنے کارنامے کی کامیابی پر ہنس رہے ہوں۔

دراصل سارا قصور میرے قلب کا ہے۔ میرے قلب میں مجذوبیت کا عنصر غالب ہے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو عالم خوشی میں ناچتے گاتے ہیں، حال کھیلتے ہیں، جن کے اظہار میں والہانہ پن ہوتا ہے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ زائرین اٹھ کر ناچیں نعرے لگائیں۔

"لبیک اللھم لبیک"

یا اللہ میں حاضر ہوں۔ یا اللہ میں تیرے حضور حاضری دینے کے لیے جا رہا ہوں۔ یا اللہ میں کتنا خوش نصیب ہوں، یا اللہ تو کتنا رحیم و کریم ہے کہ تو نے مجھے حاضری کی سعادت بخشی۔

میرا جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر اپنے ہمراہیوں کو بتاؤں کو بھائیو ہم ہائی جیک نہیں ہو رہے بلکہ اللہ کے حضور حاضری دینے کے لیے جا رہے ہیں۔ لیکن میرے حلق میں آواز نہیں تھی۔ شاید میں ڈرتا تھا کہ میرا والہانہ پن بے ادبی نہ ہو۔

ہمراہیوں سے مایوس ہو کر میں نے کھڑکی سے نیچے جھانکنا شروع کر دیا۔

جب سورج طلوع ہو گیا تو نیچے زمین کالی سی لکیر کی صورت میں نظر آنے لگی۔

معاً مجھے حج کی ایک کتاب میں سے جس کا میں نے مطالعہ کیا تھا متعلقہ حصہ

یاد آ گیا۔

''اللہ اللہ! یہ وہ ارض مقدس ہے، وہ سر زمین ہے یہاں جو گیا
اس کو امان مل گئی۔ یہاں کا ذرہ ذرہ نورانی ہے، چپہ چپہ متبرک
ہے اور گوشہ گوشہ رحمت بھرا ہوا ہے۔''

میں نے بار بار شدت سے کوشش کی کہ مجھ میں بھی ایسے تقدیس بھرے جذبات جاگیں۔ بدن میں سوئیاں چبھیں، دل میں مدوجزر اٹھیں۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ وہ کالی لکیر کالی لکیر ہی رہی۔

سالک اور مجذوب:

کیوں کیوں؟ آخر میرے قلب میں کیوں حرکت پیدا نہیں ہو رہی۔ میرے دل میں تقدیس بھرے جذبات کیوں نہیں ابھر رہے۔ کیا میرا ایمان خام ہے؟ کیا میرا قلب مردہ ہے۔ میرے دل میں کئی ایک سوال کیوں، کس لیے، کیسے چیونٹیوں کی طرح رینگنے لگے۔ مجھے اپنے آپ پر شکوک پیدا ہونے لگے۔

مجھے علم ہے کہ میرا ایمان خام ہے لیکن میرا جذبہ تو خام نہیں۔ میرے جذبے میں جان ہے، شدت ہے، دیوانگی ہے۔ مجھ میں جذبے کے سوا اور ہے ہی کیا۔

میں نے ایک بار پھر اپنے ہمراہیوں کا جائزہ لیا۔ وہ سب اللہ کے کلام سے بھیگے ہوئے تھے۔ وہ سب سالک تھے۔ صرف میں ایک مجذوب تھا اور میرا جذب بھی خام تھا۔ ورنہ میں اکیلا نعرہ لگا سکتا ہے۔ میں اس کھڑے پانی میں اللہ اکبر کا کنکر پھینک کر حرکت پیدا کر سکتا تھا۔

لیکن میں بھی چپ بیٹھا رہا۔

طیارے پر وہی خاموشی، متفکر، اداس، تقدس بھری کیفیت طاری رہی۔ ہونٹ ہلتے رہے تسبیحیں رینگتی رہیں، دلوں پر بوجھ بڑھتا رہا، اداسی دبیز تر ہوتی

گئی۔طیارہ ہائی جیک ہوتا رہا۔

صدیاں بیت گئیں۔

پھر دفعتاً کپتان کی آواز سن کر سب چونک پڑے: "پیٹیاں باندھ لیجئے، سگریٹ بجھا دیجئے۔تھوڑی دیر میں ہم جدہ ائیر پورٹ پر لینڈ کرنے والے ہیں"۔

جہاز رک گیا......

جدہ ائیر پورٹ:

ہم سب باری باری طیارے سے باہر نکلے۔سامنے ایک عام سا میدان تھا۔ ویسی ہی زمین جیسی ہمارے ہاں ہوتی ہے، ویسی ہی مٹی اور دور ویسی ہی چھوٹی پہاڑیاں جیسے کہ ائیر پورٹ کے پس منظر میں ہوتی ہیں۔پتہ نہیں کیوں میں سمجھتا تھا وہاں کی مٹی اور رنگ کی ہو گی......صدیاں پرانی، بے جان......کالی کالی، لیکن وہ تو تازہ تھی۔ہوا بھی ویسی ہی چل رہی تھی جیسی ہمارے ائیر پورٹ پر چلتی ہے۔کوئی بھی فرق نہ تھا۔اس وقت میری کیفیت بالکل اس نائی بوائے کی سی تھی جو اپنے گاؤں سے بھاگ کر سکاٹ لینڈ پہنچا تھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ وہاں کی زمین اتنی ہی سخت تھی، وہاں کے بیرو ویسے ہی مٹیالے تھے، وہاں کا گز اتنا ہی لمبا تھا۔

دیر تک میں اپنے جوتوں میں کھڑا حیرت اور مایوسی سے چاروں طرف دیکھتا رہا۔کوئی چیز بھی تو مختلف نہ تھی......پھر دفعتاً میری نگاہ زائرین پر جا پڑی۔ڈھیلے ڈھالے احرام پہنے۔ٹوکریاں بیگ، کمبل، تھیلے اٹھائے، سر لٹکائے وہ سب چپ چاپ کھڑے تھے۔دفعتاً مجھے خیال آیا کہ اس منظر میں سب سے عجیب و غریب چیز ہم خود ہیں......زائرین

اس کے باوجود میرا جی چاہتا تھ کہ ہم میں سے کوئی اس مقدس سرزمین پر پاؤں رکھنے کی خوشی میں والہانہ انداز میں دونوں بازو اٹھا کر "یا علی" کا نعرہ لگائے

اور پھر وجدان کی کیفیت میں "چلائے" یا اللہ میں حاضر ہوں اور پھر حضوری کی خوشی سے بےخود ہو کر دمادم مست قلندر کی دھمال شروع کر دے۔ لیکن زائرین سر لٹکائے کھڑے رہے، کھڑے رہے، حتیٰ کہ ایک وسیع عریض بس آ کر ہمارے سامنے رک گئی اور ایک اعلان گونجا "خواتین و حضرات! بس میں تشریف رکھیے۔"

سامان سامان سامان:

بس زائرین کو لے کر ایک بڑے سے شیڈ کے سامنے جا رکی۔ لدے پھندے مسافر شیڈ کے ایک حصے میں رکھی ہوئی بنچوں پر بیٹھ گئے اور اپنے اپنے سامان کا انتظار کرنے لگے۔ سامان آیا تو ایک افراتفری مچ گئی۔ سب نے شیڈ کے اس حصے پر دھاوا بول دیا جہاں سامان اتارا جا رہا تھا۔ ہاتھوں میں ٹوکریاں، بیگ تھیلے، بوتلیں کندھوں پر لٹکتے ہوئے کمبل، لوئیاں، سنبھالتے ہوئے وہ سب سوٹ کیسوں ٹرنکوں اور بیگوں اور بستروں کی طرف بڑھے۔

پھر ایک شور اٹھا: "یہ سوٹ کیس میرا ہے"۔ "میرا بیگ کہاں ہے" "میری ٹوکری یہاں پڑی تھی؟" "میرا سامان نہیں آیا"۔ "میرا سامان"۔ دو گھنٹے تک متواتر شیڈ میں نفسا نفسی کا عالم رہا۔ دو گھنٹے مسلسل سامان، سامان، سامان، سامان کی آوازیں گونجتی رہیں: "سامان کدھر گیا؟" "سامان سنبھالو" "سامان چیک کر لو" "سامان گم نہ کرنا" "سامان پکڑو" "سامان دے دو" "میرا سامان؟" "ہائے میرا سامان"۔

وہ ہونٹ جو طیارے میں ہل رہے تھے شیڈ میں ساکت ہو گئے۔ تسبیحیں جو سفر کے دوران انگلیوں میں رینگتی رہی تھیں۔ رک کر کلائیوں پر چڑھ گئیں۔ چہرے جو تقدیس بھری امیدوں سے منور تھے، سامان کی لگن میں متفکر ہو کر بجھ گئے۔

اس وقت ایسے لگتا تھا جیسے ہم سب نے اتنا لمبا سفر صرف اس لیے اختیار کیا

تھا کہ جدہ ایئر پورٹ کے اس شیڈ سے اپنا سامان حاصل کر سکیں...... اس وقت سامان کے سوا کائنات میں کچھ بھی نہ تھا۔ سامان ہماری منزل تھا، سامان ہمارا مقصود تھا، سامان ہمارا مطمح نظر تھا۔ کسی کو یاد نہ رہا تھا کہ ہم زائرین ہیں کہ ہم وہاں حج کرنے کی غرض سے آئے ہیں۔ کسی شعور نہ تھا کہ یہ وہ سرزمین ہے جہاں بے سرو سامانی سامان بن جاتی ہے۔ وہ سب چلا رہے تھے: "اے سامان میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، اے سامان میں حاضر ہوں"۔

آہستہ آہستہ بھیڑ چھٹ گئی۔ باری باری سب اپنا اپنا سامان سینے سے لگائے شیڈ سے باہر نکل گئے۔ جب میں باہر نکلنے لگا تو دروازے پر کھڑے افسر کے میرا پاسپورٹ دیکھ کر کہا:

"آپ ایئر پورٹ سے باہر نہیں جا سکتے"۔

"کیوں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"کیوں کہ آپ نے ابھی تک معلم نامزد نہیں کیا اور واجبات ادا نہیں کئے"۔

"معلم کہاں ملیں گے"؟ میں نے پوچھا۔

"ادھر حاجی کیمپ میں"۔

جدہ حاجی کیمپ:

حاجی کیمپ ایک وسیع و عریض سہ منزلہ عمارت تھی۔ صحن کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جگہ جگہ سامان کے انبار لگے ہوئے تھے۔ سوٹ کیس، ٹرنک، بستر، ٹوکریاں، بیگ، تھیلے۔ سامان کے اردگرد اور اوپر ملک ملک کے زائرین بیٹھے تھے۔ کھوئے ہوئے۔ متفکر، پریشان حال۔ ان کے اردگرد کھلے برآمدے میں بنے ہوئے سٹالوں میں سعودی حکومت کے مختلف محکموں کے کارندے مصروف کار تھے۔ سٹالوں پر بورڈ آویزاں تھے: "وزارت حج" "وزارت اطلاعات" "وزارت صحت" "شعبہ

انتظامیہ"۔

"معلم! معلم!" میں نے چلا چلا کر چار ایک راہ گیروں سے پوچھا۔ کسی نے میری طرف توجہ نہ دی۔ ہر کوئی شدت سے مصروف تھا، اپنے آپ میں گم تھا۔ "معلم!" اطلاعات کے کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر میں چلایا۔ کاؤنٹر پر کھڑے کارکن نے جواب میں قرآن کریم کی ایک آیت پڑھ دی اور پھر اپنے کام میں لگ گیا۔

پہلی بار میں نے محسوس کیا میں اکیلا ہوں، اتنی بھیڑ میں اکیلا ہوں۔ اس سر زمین پر اکیلا ہوں، اجنبی ہوں، جس کا نام لیتے وقت میں گذشتہ پچاس برس اپنی انگلیاں چوم کر آنکھوں پر لگاتا رہا ہوں۔ اس گھر کی دہلیز پر اکیلا ہوں جس کے نام سے زندگی بھر میرے جسم پر رونگٹے کھڑے ہوتے رہے ہیں۔

دیر تک میں حاجی کیمپ کے وسیع و عریض صحن میں تن تنہا آوارہ پھرتا رہا۔ پھر دو عرب جھگڑتے ہوئے میرے پاس سے گزرے۔ وہ بار بار معلم معلم کی تکرار کر رہے تھے۔ میں ان کے پیچھے چل پڑا، اس امید پر کہ شاید کسی معلم تک پہنچ جاؤں۔ حاجی کیمپ کے ایک کونے میں وہ دونوں زینہ چڑھنے لگے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے لگا رہا۔ اوپر برآمدے میں پہنچا تو ایسا ریلا آیا کہ وہ دونوں نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں پھر اکیلا رہ گیا، دیر تک اس بھیڑ میں اپنے کندھے چھیلتا رہا۔

ناگاہ میری نظر کمروں کے دروازوں پر جا پڑی۔ دروازوں پر جگہ جگہ معلموں کے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ معلم ہی معلم، معلم ہی معلم۔ اب سوال یہ تھا کہ کون سے معلم کے پاس جاؤں، کوئی ایسا معلم ہو جو پاکستانی زائرین سے متعلق ہو۔

معلم:

حاجی کیمپ کے اس برآمدے میں گھومتے پھرتے میں نے محسوس کیا جیسے میں

کسی پاکستانی کچہری کی اس جانب آ پہنچا ہوں جہاں وکیلوں کے منشی بڑے بڑے تختوں پر ڈسک رکھے ہوئے بیٹھے ہوتے ہیں۔

برآمدے میں لوگوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ ان میں زائرین بھی تھے اور دوسرے بھی۔ سبھی اپنے اپنے کاموں میں کھوئے ہوئے تھے۔ بحث مباحثے میں مصروف تھے، جیسے کچہریوں میں موکل اپنے اپنے مقدمے کی تفصیلات پر تبصرے کرتے ہوئے ادھر اُدھر گھومتے پھرتے ہیں۔

کمروں کے اندر موکلوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ وکیل اور معلم اپنے اپنے ڈسک پر بیٹھے کاغذات کی پڑتال کر رہے تھے۔ لوگوں کو سمجھا بجھا رہے تھے۔ رقمیں وصول کر رہے تھے۔ کاغذات پر مہریں ثبت کر رہے تھے۔ آدھ گھنٹہ گھومنے پھرنے کے بعد میں محسوس کرنے لگا جیسے مجھ پر کسی نے مقدمہ کر رکھا ہو، اور میں اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے لاہور کی کسی چھوٹی کچہری میں وکیل کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ حج کا خیال تو ذہن سے بالکل نکل چکا تھا۔

"السلام علیکم"۔ ایک پاکستانی صاحب میرے پاس آ کھڑے ہوئے۔

"آپ کا نام ممتاز مفتی ہیں کیا؟" میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ "جی ہاں"۔ میں نے جواب دیا۔ "ہاں میں ممتاز مفتی ہوں"۔

میں نے اپنی یادداشت کو للکارا، لیکن لاحاصل۔ وہ میرے لیے اجنبی تھے۔ کہنے لگے، "آپ کو معلم نامزد کرنا ہے نا؟"

"جی!" میں نے کہا۔

"تو آئیے" وہ بولے میں ضروری کاروائی کرا دوں"۔

وہ صاحب مجھے ایک کمرے میں لے گئے۔ دیر تک وہ معلم سے عربی میں بات کرتے رہے، پھر مجھ سے رقم لے کر ادائیگی کی۔ کاغذات پر مہریں لگوائیں اور

آخر میں اطمینان کا سانس لے کر کہنے لگے ''لیجئے صاحب یہ کام تو طے ہو گیا۔'' انہوں نے کاغذات میرے ہاتھ میں تھما دیئے۔ ''لیکن آپ ہیں کون''؟ میں نے ان سے پوچھا ''معاف کیجئے میں نے آپ کو پہچانا نہیں'' وہ مسکرا دیئے ''آپ نے مجھے اس لیے نہیں پہچانا کہ ہم پہلے کبھی نہیں ملے۔ میں سفارت پاکستان کا ایک رکن ہوں۔'' انہوں نے جواب دیا ''دراصل مجھے ایئرپورٹ پر جلد پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میں شہاب صاحب کو ریسیو کرنے آیا ہوں۔ مجھے پہلے سے ہی علم تھا کہ آپ شہاب صاحب کے ساتھ آ رہے ہیں۔ یہ سب فارمیلٹیز سرانجام دینا میں نے اپنے ذمے لیا تھا۔''

''لیکن قدرت اللہ شہاب کہاں ہیں''؟ میں نے ان سے پوچھا۔

''دراصل ان کو آپ سے پہلے یہاں پہنچنا جانا چاہیے تھا لیکن ان کا جہاز لیٹ ہو گیا ہے۔ وہ بعد از دوپہر یہاں پہنچیں گے۔ آیئے اب میں آپ کو وہاں پہنچا دوں جہاں آپ کو ان کا انتظار کرنا ہے۔''

ہنی مون کمرا:

سفارت کا وہ کارکن مجھے ایک کوٹھی میں لے گیا جس کا وسیع وعریض بیرونی صحن خوبصورت ٹائلوں سے بنا ہوا تھا۔ کوٹھی سے باہر صحن کے ایک جانب ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ ان صاحب نے اس ملحقہ کمرے میں میرا سامان رکھوا دیا۔ اس لیے کہ اس ہنی مون کمرے میں کوئی آ کر مجھے کہے ''ہائی''۔ میں نے ایک جست بھری اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

خالی صحن:

برآمدے کے فرش پر بیٹھ کر میں نے دیوار سے ٹیک لگا لی۔ سامنے ٹائلوں

سے بنا ہوا وسیع صحن تھا۔ دیر تک میں اس صحن کو دیکھتا رہا۔ ظاہر تھا کہ وہ کوٹھی سفارت پاکستان سے متعلق تھی۔ دفتر یا شاید گھر، یا مہمان خانہ، پتہ نہیں کیا۔ لیکن وہ صحن خالی کیوں تھا۔ حج کے دنوں میں پاکستانی سفارت کا اتنا وسیع وعریض ٹائلوں سے بنا ہوا صحن خالی کیوں ہو۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس صحن کی ایک ایک ٹائل پاکستانی زائرین کے لیے رو رہی ہو، چلا رہی ہو، بین کر رہی ہو۔

پھر آہستہ آہستہ وہ بین سسکیوں میں بدل گئے جیسے کوئی سسکیاں لے لے کے آہ وزاری کر رہا ہو: "اے اللہ کیا میرا وجود اتنا ہی بے مصرف ہے کہ ان متبرک دنوں میں بھی مجھ سے کوئی کام نہیں لیا جا سکتا؟"

دفعتاً ایک دھماکے سے صدر دروازہ کھل گیا۔ زائرین کا ایک ریلا اندر گھس آیا۔ پھر ان کا تانتا بندھ گیا۔ اپنا اپنا سامان اٹھائے وہ صحن میں گھستے چلے آئے، حتیٰ کہ وہاں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔

گروہوں کی صورت میں وہ سارے صحن پر پھیل گئے۔ کچھ لوگ بستر کھولنے میں مصروف ہو گئے، کچھ چائے بنانے کے لیے چولہے جلانے لگے۔ کئی ایک نے مصلے بچھا کر نماز پڑھنا شروع کر دیا۔ صحن میں عجیب گہما گہمی پیدا ہو گئی۔ اس گہما گہمی کو دیکھ کر پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ میں حج کرنے کے لیے آیا ہوں۔ پہلی مرتبہ میرے دل کی گہرائیوں سے آواز اٹھی: "اے اللہ میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں۔ میں حاضر ہوں اے اللہ"۔

پھر ایک خوف ناک کتا کوٹھی سے نکلا اور بھونکتا ہوا زائرین کی طرف لپکا۔ اس خوفناک کتے کو دیکھ کر زائرین خوف سے اٹھ کر صدر دروازے کی طرف بھاگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے صحن زائرین سے خالی ہو گیا۔ دیر تک کتا صدر دروازے میں کھڑا ہو کر بھاگتے ہوئے زائرین پر بھونکتا رہا۔ پھر وہ مڑا۔ میری طرف دیکھا۔ رک گیا۔

پھر مجھے بھونکنے لگا۔ لیکن یہ بھونک اور رنگ کی تھی۔ اس میں دھمکی نہ تھی، تمسخر تھا، جیسے طعنے دے رہا ہو: "تو یہاں کیا کر رہا ہے، تیرا یہاں کیا کام، جا چلا جا۔" میں نے لپک کر اپنا تھیلا اٹھایا اور بھاگ کر صدر دروازے سے باہر نکل گیا۔ گلی میں کچھ دور تک میں بھاگتا رہا، پھر چلنے لگا۔ کتے کے بھونکنے کی آواز دور تک سنائی دیتی رہی حتیٰ کہ موڑ مڑ کر میں بازار میں داخل ہو گیا۔

بازار:

بازار میں لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ راہ گیر اپنی اپنی دھن میں چلے جا رہے تھے۔ ان کے چہروں پر مصروفیت کی مکھیاں بھنبھنا رہی تھی، انداز میں خشک کاروباری چستی تھی۔ ان کی آنکھوں میں خوابوں کے دیئے روشن نہ تھے بلکہ ان پر حقائق پسندی کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ انداز سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے انہیں خبر ہی نہ ہو کہ ان کی سر زمین پر ایک عظیم واقعہ ہونے والا ہے۔ ایسا عظیم واقعہ جس کے لیے دنیا کے گوشے گوشے سے لوگ وہاں اکٹھے ہو رہے ہیں۔

جدہ کے بازاروں میں زائرین احرام باندھے ہوئے گھوم پھر رہے تھے لیکن دوکانداروں کے سوا کسی کو ان کی موجودگی کا احساس نہ تھا۔ وہاں کوئی زائر نہیں تھا، صرف خریدار، گاہک۔ یہ میں کہاں آ گیا ہوں۔ مجھے شدت سے احساس ہوا کہ شاید میں غلطی سے کسی اور جگہ آ گیا ہوں۔ نہیں نہیں، یہ وہ سر زمین نہیں ہے۔ پی آئی اے والے غلطی سے مجھے یہاں لے آئے ہیں۔ یہ مکہ شریف کی دہلیز نہیں بلکہ کوئی اور شہر ہے ورنہ انہیں خبر ہوتی، احساس ہوتا۔

لوگوں سے مایوس ہو کر میری نظر سڑک کے دو رویہ کھڑی عمارتوں کی طرف مبذول ہو گئی۔ کتنی عالی شان عمارتیں ہیں۔ جب میں ان خوبصورت عالی شان عمارتوں کو دیکھ رہا تھا تو مجھے کسی نے کہنی ماری اور زیر لب کہا۔ اونہوں یہ وہ جگہ نہیں۔

پھر مجھے راولپنڈی کے کوئلہ سنٹر والے بابا کا کمرہ یاد آ گیا۔

کوئلہ سنٹر والے بابا:

۱۹۵۲ء کی ایک شام کو راولپنڈی صدر میں گھومتے ہوئے میرا ایک بہت پرانا دوست مل گیا۔ دیر تک ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے بازار میں کھڑے باتیں کرتے رہے۔ پھر میں نے اس سے کہا "چلو کہیں بیٹھ کر باتیں کریں۔ ہوٹل میں چلتے ہیں"۔

"ہوٹل کیوں"؟ بابا کی کوٹھڑی جو ہے۔ وہاں چائے بھی ملے گی۔ عمدہ چائے اور پھر مفت۔ تم کوئلہ سنٹر کے بابا کو نہیں جانتے کیا؟ حیرت ہے"!

چند ایک قدم چلنے کے بعد ہم بابا کی کوٹھڑی میں جا داخل ہوئے۔

وہ ایک اندھیری کوٹھڑی تھی۔ چند ساعت کے لیے تو نگاہ دھندلائی رہی۔ پھر شکلیں ابھریں۔ سامنے کھدر کا جبہ پہنے بابا براجمان تھے۔ ان کے روبرو پتھر کے طباخ میں مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ دیئے کی دھندلی روشنی میں دیواروں کے ساتھ ساتھ دورویہ بیٹھے ہوئے لوگ نیم دروں، نیم بروں یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے ہستی اور نیستی کے درمیان جھول رہے ہیں۔

ہم دونوں ایک طرف بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد اس دھندلی روشنی نے منظر کو ایک بے نام تاثر سے بھگو دیا۔ ہم پر ایک عجب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ کچی دیواریں، کھدر میں ملبوس بابا، چٹائیوں پر بیٹھے ہوئے سب لوگ عجز کی اس بے نام کیفیت سے سرشار تھا جو طاری ہو جائے تو ساری کائنات سربسجود ہو جاتی ہے۔

کئی ایک مہینوں کے بعد ہمیں پھر اسی بازار سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے اپنے دوست سے کہا۔ "چلو یاد کچھ دیر کے لیے بابا کی کوٹھڑی میں جا کر بیٹھیں۔"

بابا کے کمرے میں داخل ہو کر میں بھونچکا رہ گیا۔ "نہیں نہیں یہ وہ کمرہ نہیں، ہم غلطی سے کسی اور جگہ آ گئے ہیں۔۔ وہاں تو سماں ہی اور تھے۔ کچی کوٹھڑی کی جگہ چمکتی ہوئی ٹائلوں کا بنا ہوا کمرہ جو دودھیا ٹیوبوں کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ سامنے تخت پر بابا سبز چغہ پہنے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی مغلیہ شہنشاہ اپنے نورتنوں کے ساتھ محفل سجائے بیٹھا ہو۔ میرے دوست نے مجھے کہنی ماری اور زیرِ لب کہا۔ "چلو چلیں اب یہاں وہ بات نہیں رہی۔"

جدہ کی عالی شان عمارتوں، کارپٹ سڑکوں اور کاروباری بے اعتنائی کو دیکھ کر میں نے محسوس کیا جیسے میں بابا کے منور کمرے میں آ گیا ہوں۔ پھر مجھے کسی نے کہنی ماری، زیرِ لب آواز آئی۔ "چلو یار چلیں، اب یہاں وہ بات نہیں۔"

سچ جانئے میں ایک خاصا لکھا پڑھا فرد ہوں اور آج کی دنیا کے متعلق خاصی بنیادی معلومات رکھتا ہوں۔ مجھے علم ہے کہ جب سے سرزمین حجاز پر تیل نے دھاوا بولا ہے۔ تاریخ کے سوا وہاں سب کچھ بدل گیا ہے۔ اس کے باوجود پتہ نہیں کس اصول کے تحت میں سمجھتا تھا کہ جب میں سرزمین جدہ پر قدم رکھوں گا تو ٹائم مشین پیچھے گھوم جائے گی۔ جدہ وہی پرانا جدہ ہو گا جس کا نقشہ برٹن صاحب اور رکین صاحب نے کھینچا ہے۔ عرب وہی عرب ہوں گے، شہر وہی شہر ہوں گے۔ سڑکوں پر اونٹوں کے قافلے چل رہے ہوں گے اور شہر سے باہر چاروں طرف تاحدِ نظر ریت ہی ریت، ریت ہی ریت۔

مکہ روڈ

ڈبے ہی ڈبے:

جدہ کے بازار میں چلتے چلتے مجھے ٹھوکر لگی، رک گیا۔ سامنے فٹ پاتھ پر ایک بہت بڑی پیٹی رکھی ہوئی تھی۔ ایسا صندوق جس میں ہم گھر میں رضائیاں اور لحاف رکھتے ہیں۔ پیٹی پر ڈھکنا نہیں تھا۔ میں نے پیٹی کے اندر جھانکا۔ ڈبے ہی ڈبے، ڈبے ہی ڈبے۔ ساری پیٹی رنگا رنگ ڈبوں سے بھری ہوئی تھی۔ گلاسوں جتنے بڑے ٹین کے ڈبے، جن پر خوبصورت رنگوں میں لیبل چھپے ہوئے تھے اور ان ڈبوں کے اردگرد برف کے ٹکڑے پڑے تھے۔

ایک راہ گیر رک گیا، اس نے پیٹی میں ہاتھ ڈالا، ایک ڈبہ نکالا۔ اٹلی کا بنا ہوا جوس، دوسرا نکالا، میڈ ان پیرس، ہالینڈ، سپین۔ اس نے ایک ڈبے میں چھید کیا۔ غٹا غٹ جوس پیا۔ پیسے صندوق پر رکھے اور چل پڑا۔

ارے یہاں تو پانی کی بالٹی دو روپے میں ملا کرتی تھی لیکن یہ ملک ملک کے بنے ہوئے جوس کے اتنے سارے ڈبے! میں نے حیرت سے ایک بار پھر ڈبوں کی طرف دیکھا۔ ڈبوں میں حرکت ہوئی۔ پھر باری باری سارے ڈبے پیٹی سے باہر نکل آئے اور فٹ پاتھ پر دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔

آخری دن:

''دیکھا اسے کہتے ہیں افراط''۔ اوپر کے ڈبے پر چھپی ہوئی شکل چلائی۔ پھر لیبلوں کی تمام اشکال قہقہے مار کر ہنسیں ''افراط، افراط''۔

دفعتاً میرے ذہن کی گراری نے بیک ماری۔ فلیش بیک......

اس روز قدرت اور میں باتیں کر رہے تھے۔ پتہ نہیں کیسے افراط کا ذکر چھڑ گیا

تھا۔

''افراط باعثِ برکت نہیں ہوتی۔'' وہ بولے۔

''افراط تو خود برکت کا دوسرا نام ہے''۔ میں نے جواب دیا۔

''نہیں'' وہ مسکرائے ''پہلے میرا بھی یہی خیال تھا، پھر بدل گیا''۔

''کب بدلا؟'' میں نے پوچھا۔

''جب میں پہلی مرتبہ حج پر گیا تھا''۔

''جہاں نالے کے کنارے کا نالے کا کنارہ تھا؟ جہاں آپ نے دری بچھا کر قیام کیا تھا؟''

''وہاں'' وہ بولے ''وہاں میں نے پہلی بار کنجڑے کی دوکان پر افراط کا عالم دیکھا۔ ایک چھابے میں آلو پڑے تھے، دوسرے میں پیاز، تیسرے میں سوئیرزلینڈ کی بنی ہوئی رسٹ واچز تھیں۔''

''رسٹ واچز کنجڑے کی دکان پر!؟''

''ہاں ہاں'' وہ بولے ''ایک چھابہ رسٹ واچز سے بھرا ہوا تھا، ایک جدید ترین کل دار کھلونوں سے، ایک طرف ریڈیو سیٹوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور پیچھے چار فرج کھڑے تھے۔''

''کنجڑے کی دوکان پر فرج؟''

''ہاں ہاں فرج'' وہ بولے۔

''اور وہ بکاؤ تھے؟''

''ہاں بکاؤ تھے۔ اس وقت میں اس افراط کو دیکھ کر حیران بھی ہوا تھا اور خوش بھی۔ عین اس وقت پیچھے سے آواز آئی: ''اس افراط کے متعلق حضورِ اعلیٰ خود نشاندہی کی تھی۔'' میں نے مڑ کر دیکھا۔ نورانی شکل وصورت کے ایک بزرگ کھڑے تھے

"کیا نشان دہی کی تھی حضور نے؟" میں نے پوچھا۔ بزرگ نے جواب دیا کہ حضور نے فرمایا تھا، ایک ایسا دن بھی آئے گا جب اس سرزمین پر اشیاء اور زر کی افراط ہو جائے گی۔ وہ آخری دن ہونگے۔

"آخری دن! "آخری دن!" جوس کے ڈبوں میں چھپی ہوئی شکلیں قہقہے مارنے لگیں۔

اس بازار سے تو سفارت کی کوٹھی کا وہ خالی بے مصرف صحن ہی اچھا تھا۔ میں نے سوچا۔

چھوڑو یہاں بازار میں کیا رکھا ہے۔ صرف آخری دن۔ میں واپس جانے کے لیے مڑا۔

کتا کوٹھی سے نکل میرے طرف لپکا۔ اس کی بھونک میں دھمکی کا عنصر واضح تھا۔

ڈر کر میں فٹ پاتھ سے نیچے اتر گیا۔ بھوں بھوں کرتی ہوئی ایک کالی موٹر میری طرف لپکی۔ بریک نے چیخ ماری۔ موٹر رک گئی۔ موٹر میں قدرت اللہ اور ان کی بیگم ڈاکٹر عفت بیٹھے ہوئے مسکرا رہے تھے۔

"آیئے آجایئے" ۔قدرت نے مجھے اشارہ کیا…… "بیٹھ جایئے"۔

"آپ یہاں؟" میں نے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ہم ایئر پورٹ سے آرہے ہیں۔ ہماری فلائٹ لیٹ ہوگئی تھی۔ آپ تو ٹھیک ہیں نا؟"

"ٹھیک"؟ میں چلایا "یہ آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں، یہ تو وہ جگہ نہیں۔ یہ تو منزل نہیں، نہیں یہ تو منزل نہیں"۔

قدرت مسکرائے۔

"یہ اونچی اونچی عمارتیں، یہ سازو سامان، کاروباری لوگ، یہ افراط سے لدی ہوئی دوکانیں یہ سب کیا ہے؟"

"یہ سب کچھ کچھ بھی نہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"اگر دیکھو تو یہ سب کچھ، دکھتا ہے"۔ قدرت نے کہا "نہ دیکھو تو یہ "سب کچھ" کچھ بھی نہیں۔

"کیسے نہ دیکھیں؟"

لک اور سی:

"سی بٹ ڈونٹ لک"۔ قدرت نے انگریزی کا سہارا لیا۔

"کیا مطلب؟"

"نظر آتا ہے تو پڑا آئے۔ پر دیکھنے کی کیا ضرورت ہے"۔

"پر دکھتا جو ہے"۔ میں نے کہا۔

"دکھتا ہے تو پڑا دکھے"۔ وہ بولے "اسے اہمیت کیوں دیتے ہیں آپ؟"

"میرے اہمیت دینے یا نہ دینے سے کیا فرق پڑتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اہمیت دینے سے ہی تو فرق پڑتا ہے۔" قدرت اللہ نے کہا۔ "بہت فرق پڑتا ہے۔ مولانا ارشد علی تھانوی روز ریل میں اپنے گاؤں سے شہر جایا کرتے تھے۔ ڈبے میں بیٹھ کر وہ کھڑکیوں پر لکڑی کے تختے چڑھا دیا کرتے۔ ایک روز ایک معتقد نے پوچھا: "حضرات! آپ اتنے اہتمام سے کھڑکیوں پر تختے کیوں چڑھا دیتے ہیں؟" فرمایا "تاکہ توجہ منزل پر مرکوز رہے۔ راستے کے مناظر میں بھٹکتی نہ پھرے۔ راستے کے مناظر میں نہ الجھو تو منزل پر پہنچنے پر آنکھیں تھکی ہوئی نہیں بلکہ تازہ دم ہوں گی۔"

میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ حتی الواسع قدرت اللہ جیسوں کی باتوں میں نہ آنا، اور سکھی رہنا چاہتے ہو تو مولانا ارشد علی تھانوی جیسے بزرگ کے ارشادات کو پلے نہ باندھنا۔

قدرت اللہ کی باتیں ایک وقت مجھے ایسے لگتی ہیں جیسے منہ زبانی ہوں۔ خالی باتیں، کتابوں سے چنے ہوئے چمکدار جملے۔ دوسرے لمحے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے ایک جملے میں ایک دنیا آباد ہو۔ جیسے ہر جملہ حرف آخر ہو۔ پھر میرے دل پر ایک آرا چلتا ہے۔ حرفِ آخر بے معنی حرف آخر، حرف بے معنی۔

شخصیت کے تحفظ کے بارے میں زرتشت کہتا ہے۔ دیکھ اپنی میں، میں آرا چلنے نہ دیجو، ورنہ، نہ میں رہے گی نہ تو تک پہنچ پائے گا۔"

جدہ پیلس پر موٹر رک گئی۔ جدہ پیلس جدے کا سب سے بڑا ہوٹل ہے جہاں قدرت اور ان کی بیگم کے لیے کمرہ پہلے سے ریزرو تھا۔ وہ کمرہ نیچی چھت کا بنا سجا کبوتر خانہ تھا۔ سارا جدہ پیلس، کمرے، برآمدے، باتھ، تیز اور شدید ایئر کنڈیشن میں ٹھٹھر رہے تھے۔

پتہ نہیں کیوں ایئر کنڈیشن موسم کا ردعمل پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ برفانی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ گرمیوں میں اس کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ مکینوں کے دانت بجیں۔ دانتوں کے علاوہ میرا گلا بھی بجنے لگتا ہے، دم گھٹتا، ہے نہ جانے؟

کتے اور قافلے:

میں نے قدرت سے کہا "میں اب چلتا ہوں"۔

"اچھا" وہ بولے۔ کل صبح تیار رہئے، ہم سویرے ہی مکہ شریف کو روانہ ہو جائیں گے۔ انشاءاللہ۔"

"کیوں؟"

"میرے لیے یہاں رات بسر کرنا بہت مشکل ہے۔"

"کیوں؟ کیا جگہ تکلیف دہ ہے؟"

"ہاں" میں نے کہا "بہت تکلیف دہ"۔

"کیا تکلیف ہے؟"

"میرے کمرے کے سامنے ٹائلوں کا بنا ہوا وسیع و عریض صحن ہے"۔ میں نے جواب دیا۔

"اس میں تکلیف کیا کیا بات ہے؟" وہ مسکرائے۔

"وہ وسیع و عریض صحن خالی پڑا ہے۔ حج کے دنوں میں خالی پڑا ہے۔"

وہ مسکرائے "تو اسے زائرین سے آباد کر لیجیے۔"

"لیکن کوٹھی کا خوفناک کتا۔ وہ بھونک کر زائرین کو بھگا دیتا ہے۔"

"کتے کی آواز نہ سنئے"۔ قدرت نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیسے نہ سنوں؟"

"کتے بھونکتے رہتے ہیں، قافلے چلتے رہتے ہیں" وہ بولے۔

"میرا قافلہ نہیں چلتا نا۔"

قدرت نے میری بات ان سنی کر دی۔ بولے "دنیا میں بھونکنے والے کتے بہت ہیں۔ جینا چاہتے ہیں تو ان کی آواز نہ سننے کی صلاحیت پیدا کریں۔"

پچھلی رات تک کتا وقفوں سے بھونکتا رہا۔ زائرین کے قافلے آتے رہے جاتے رہے۔ صحن آباد ہوتا رہا، ویران ہوتا رہا۔ میں برآمدے کے فرش پر دیوار سے سر ٹیکے بیٹھا رہا۔ کمرے میں جاتا تو وحشت سی سوار ہو جاتی۔ اپنے احرام کو دیکھتا تو ایسے لگتا جیسے فقیر محل میں آ گھسا ہو۔ کئی بار جی چاہا کہ احرام کو اتار کر سلیپنگ سوٹ پہن لوں اور ڈبل بیڈ پر لیٹ کر لمبے بالوں والی لڑکی کا انتظار کروں جو آ کر مجھے

''ہائی'' کہے۔ پھر احرام پر نظر پڑ جاتی۔ شرمندہ ہو جاتا۔

احرام سمیت بیڈ پر لیٹتا تو کمرے میں لگا ہوا ائیر کنڈیشن بہ آواز بلند طعنے دیتا ''اے اللہ میں حاضر ہوں''۔ پھر قہقہے لگاتا۔

اس روز جدے میں تو میں بالکل غیر حاضر تھا۔ اس کی نسبت تو اپنے گھر میں چٹائی پر بیٹھے ہوئے میں کہیں زیادہ حاضر رہا کرتا تھا۔ ان جانے میں حاضر ہو جاتا۔ اپنی طبعی ناشکری کے باوجود شکر گزاری کی ایک لہر اٹھتی۔ ''اے اللہ! تو نے مجھے اتنا کچھ دے رکھا ہے، اتنا کچھ۔ پھر تو مجھے قدم قدم پر سنبھالتا ہے، سہارا دیتا ہے''۔

شکر گزاری کی یہ لہر مجھے حضوری میں لے جاتی۔

لیکن جدے میں تو اللہ تعالی میری زندگی سے بالکل خارج ہو چکے تھے۔ میری زندگی سے ہی نہیں بلکہ یوں لگتا تھا جیسے ساری کائنات سے خارج ہو چکے ہوں۔

ائیر کنڈیشن مجھے اللہ کی یاد نہیں دلا رہا تھا۔ وہ تو مجھے احرام پہنے پر طعنے دے رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اٹھ کر بھاگ جاؤں، صدر دروازے سے باہر نکل جاؤں اور کسی بدرو کے کنارے دری بچھا کر سو جاؤں۔

میں لپک کر باہر نکلا۔ صحن میں زائرین کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ وہ سب اپنی اپنی دریوں پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ میں نے اپنی دری برآمدے میں فرش پر بچھا لی اور اونگھنے لگا۔

روانگی:

اگلے روز نو بجے کے قریب ایک کالی سیاہ اتنی لمبی مرسڈیز صدر دروازے پر آ رکی۔ اس میں سے ایک خوش شکل بانکا عرب جوان نکلا۔ وہ سیدھا میری طرف آیا۔

''سلام علیکم''۔ وہ بولا ''چلئے آپ انتظار ہو رہا ہے۔ ہمیں فوراً مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہو جانا چاہیئے۔''

''آپ کی تعریف؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا نام غنی ہے۔ سعودی حکومت نے مجھے شہاب صاحب کا رابطہ افسر مقرر کیا ہے۔''

''تو کیا شہاب صاحب سیکرٹری تعلیم کی حیثیت سے یہاں آئے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں'' وہ بولا ''سعودی حکومت نے انہیں کیو۔ یو۔ شہاب کی حیثیت سے یہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ ہمارے ہاں قاعدہ ہے کہ ہر مہمان کے ساتھ ایک رابطہ افسر مقرر کیا جاتا ہے، تاکہ مہمان کی ضروریات کا خیال رکھے اور مناسب انتظامات کرے۔''

''ہوں! تو قدرت پر اللہ یہاں مہمان کی حیثیت سے آئے ہیں، زائر کی حیثیت سے نہیں۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔

''نہیں'' غنی مسکرایا ''وہ مہمان زائر کی حیثیت سے تشریف لائے ہیں۔ ہر سال سینکڑوں مہمان زائر یہاں تشریف لاتے ہیں۔''

کچھ دیر کے بعد ہماری مرسڈیز مکہ معظمہ کی طرف جا رہی تھی۔ دونوں طرف بنجر زمین پر پھیلی ہوئی تھی جو نہ تو ریت تھی نہ مٹی اور نہ پتھر۔ درمیان میں ایک فراخ کالی سڑک دوڑ رہی تھی۔

مہمان زائر:

''اچھا تو آپ مہمان زائر ہیں'' میں نے قدرت اللہ سے کہا۔

قدرت اللہ نے غور سے میری جانب دیکھا۔

''آپ سعودی حکومت کی دعوت پر آئے ہیں نا۔'' آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔''

''لیکن'' وہ بولے ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے''۔

''بہت فرق پڑتا ہے''۔ اب آپ کیا اور میرا کیا ساتھ۔ آپ مہمان زائر ہیں اور میں......''

وہ ہنسے۔ ''شاید آپ بھی زائر ہوں''۔

''وہ کیسے؟''

''صرف سعودی حکومت ہی نہیں۔'' قدرت نے کہا ''اور بھی بہت سی ایجنسیز AGENCIES ہیں جو زائرین کو دعوت دے کر یہاں بلواتی ہیں۔ مہمان کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ مہمان زائر ہے احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ آیا نہیں لایا گیا ہے۔ کون جانتا ہے کہ یہاں کون کون مہمان زائر ہے''۔

میری ہنسی نکل گئی ''کتنا عمدہ دل بہلاوا ہے''۔

''دل بہلاوہ نہیں، حقیقت ہے'' قدرت نے سنجیدگی سے کہا۔

''بعید از عقل بات ہے''۔

قدرت اللہ مسکرا دیئے ''بنیادی باتیں ہمیشہ بعید از عقل ہوتی ہیں''۔

فوارہ چوک کا مست، مرسڈیز کے سامنے آ کھڑا ہوا اور چلانے لگا ''توجہ پہ جائے گا توجہ پہ جائے گا''۔

ایلگن روڈ کے نوجوان فقیر نے کھڑکی سے جھانکا ''میں نے کہا نہیں تھا کہ تیری فائل بنی ہوئی ہے۔''

پھر مرسڈیز کی ہر کھڑکی کے فریم پر میرے گذشتہ خوابوں کے منظر یوں روشن ہو گئے جیسے وہ فریم نہیں بلکہ ٹی وی کے متعدد سکرین ہوں۔

قدرت اللہ کی باتوں میں اثر ہے یا نہیں، مجھے نہیں پتہ۔ البتہ ان کی باتیں عجیب وغریب قسم کے HALLUCINATION قائم کر دیتی ہے۔ بالکل ویسے ہی HALLUCINATION جیسے خاور صاحب کے سامنے قائم کر دیئے گئے تھے۔

خاور:

خاور فیشن زدہ، رومان پسند، آوارہ مزاج نوجوان تھا۔ اسے صرف دو باتوں سے دلچسپی تھی...... خود بننا سنورنا اور خوش شکل عورتوں کو پھنسانا۔

ایک روز لاہور کی ایک ویران سڑک پر اس نے ایک خوش شکل رنگ رنگیلی عورت کو دیکھا جو بار بار مڑ کر خاور کی طرف دیکھتی اور مسکاتی تھی۔ ایسی جاذب توجہ الھڑ کو مائل بہ کرم دیکھ کر خاور اپنی تمام مصروفیات بھول گیا اور اس نازنین کا پیچھا کرنے لگا۔

جب سڑک سنسان ہو گئی تو اس نے چار ایک لمبے ڈگ بھرے اور نازنین کے مقابل جا کر اس کی بانہہ پکڑ لی۔ نازنین نے مسکرا کر خاور کی طرف دیکھا۔

ارے نازنین کے چہرے پر تو اتنی لمبی داڑھی تھی۔ خاور گھبرا کر پیچھے ہٹا تو وہ نازنین نما بزرگ بولے "نہیں، نہیں، کوئی فرق نہیں۔ غور سے دیکھو میاں تو کوئی فرق نہیں۔ بات ایک ہی ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے خاور کی بانہہ پکڑ لی۔ خاور ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا اور آج وہ خود چھاج سی لمبی داڑھی لیے واپڈا کے ایک اکاؤنٹ آفس میں بیٹھا ہے۔

قدرت اللہ کی بھی وہی مصداق ہے۔ کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے وہ ایک شوخ مزاج رنگیلے دانشور ہوں اور کبھی وہ منہ موڑ کر دیکھتے ہیں تو ان کے چہرے پر لمبی داڑھی دیکھ کر گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے۔

سرِ راہ ہوٹل:

ایک دھچکا لگا۔موٹر رک گئی۔

سڑک کی ایک جانب ایک بھدی سی عمارت بنی ہوئی تھی، دوسری جانب ایک لمبا چوڑا شیڈ تھا۔شیڈ میں بے ڈھب سی میزیں پڑی تھیں جن کے اردگرد کھجور سے بنی ہوئی چھوٹی چارپائیاں تھیں،جنہیں مسافر کرسیوں کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔

شیڈ کے ایک طرف چائے کی دوکان تھی۔دھوئیں سے کالی کیتلیاں چولھوں پر رکھی ہوئی تھیں۔میل سے اٹے موٹے ڈبے پاس دھرے تھے۔دوسرے کونے پر ایک عارضی چولھے پر بہت بڑی کالی سیاہ کڑاہی چڑھی ہوئی تھی جس میں روغن تھا۔ پاس ہی میل چکٹ چادر میں نمک اور ہلدی لگی ہوئی کئی ایک چھوٹی بڑی مچھلیاں لپٹی ہوئی تھیں۔

اس منظر کو دیکھ کر میں نے محسوس کیا جیسے ہم صوبہ سرحد کے کسی قبائلی علاقے کی سڑک پر بنے ہوئے ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔

غنی کے کہنے پر ہمیں ایک الگ کمرہ کھلوا دیا گیا جس میں چٹائی بچھی ہوئی تھی۔

وہاں ہم ایک ڈیڑھ گھنٹہ رکے۔نان مچھلی کھائی، چائے پی،ظہر کی نماز پڑھی اور پھر سے مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

میں نے قدرت سے کہا "یہ ماحول جانا پہچانا لگتا ہے"۔

ڈاکٹر عفت ہنسنے لگی، بولی "کیوں نہ ہو جانا پہچانا، ہمارے تمدن کا مخرج و منبع جو ہوا۔ہمارے آباء یہی ماحول لے کر برصغیر میں آئے تھے۔"

"ہاں جبھی"۔میں نے کہا اور پھر سڑک کی جانب دیکھنے لگا۔

کالی سڑک مسلسل دوڑ رہی تھی۔ اس پھیلے ہوئے ویرانے میں وہ کالی سڑک عجیب سی معلوم ہو رہی تھی جیسے کسی گاؤں کی گنوار نے سر پر نائلون کا ربن باندھ رکھا ہو۔

سڑک دوڑ رہی تھی، منظر ساکت تھا۔

کبھی کبھار دور چھوٹے چھوٹے ٹیلے دکھائی دیتے۔ ویران بنجر ٹیلے، بے آب و گیاہ ہمارے ہاں کے بنجر ٹیلوں میں بھی زندگی اور تازگی کی رمق ہوتی ہے لیکن ان ٹیلوں کے پتھروں پر عجیب سی مردنی چھائی ہوئی تھی۔ چاروں طرف مردنی اور اداسی کے انبار لگے ہوئے تھے۔

''انشاءاللہ ہم ایک گھنٹے تک مکہ معظمہ میں ہوں گے۔'' قدرت اللہ نے کہا۔

''مجھے تو مدینہ منورہ سے دلچسپی ہے'' میں نے جواب دیا۔

''اور مکہ معظمہ سے؟'' ڈاکٹر عفت نے پوچھا۔

''کہاں میں کہاں اللہ میاں۔ میں انہیں نہیں جانتا''۔ میرے منہ سے نکل گیا۔

موٹر میں ایک گہری خاموشی طاری ہو گئی جیسے کنوئیں میں پتھر گرنے کی آواز کے بعد پر اسرار عمیق و بسیط خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔

انہیں کتنا دکھ ہوتا:

میں نے قدرت کی طرف دیکھا ان کا چہرہ ریزہ ریزہ ہو رہا تھا جیسے چوٹ لگنے سے شیشہ چور چور ہو جاتا ہے۔

دفعتاً مجھے یاد آیا یہ تو وہی چہرہ ہے، وہی چہرہ۔ حیرت سے میں بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔

پاکستان سے روانگی سے سات آٹھ دن پہلے میں سکوٹر پر اسلام آباد سے

پنڈی آ رہا تھا۔ راستے میں ایک دوست مل گئے۔ میں رک گیا۔ سڑک سے ہٹ کر ہم دونوں باتیں کرنے لگے۔ قریب ہی ایک سفید ریش بزرگ نماز پڑھنے میں مصروف تھے۔

''سنا ہے تم بیت اللہ جا رہے ہو'' میرے دوست نے پوچھا۔

''یار!'' میں نے حسبِ عادت بے سوچے سمجھے جواب دیا۔ ''مجھے اللہ سے کیا لینا دینا البتہ جی چاہتا ہے کہ مدینہ منورہ میں حاضری دوں۔ حضور اعلیٰ کو سلام کروں''۔

سفید ریش بزرگ نے سلام پھیر کر دیکھا۔ ان چہرہ ریزہ ریزہ ہو رہا تھا، جیسے چوٹ لگنے سے شیشہ چور چور ہو جاتا ہے۔

دفعتاً میں نے محسوس کیا جیسے وہ چہرہ بہت مانوس ہو، جیسے میں نے اسے بارہا دیکھا ہو کہاں؟ کب؟ یہ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔

''آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں'' بزرگ بولے۔

''جی فرمائیے''۔

''آپ کو رسول اللہ سے اتنا لگاؤ ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے متعلق جو کلمات آپ نے کہے ہیں، اگر حضورؐ سن لیتے تو انہیں کتنا دکھ ہوتا۔ کیا آپ کو اس کا اندازہ ہے؟''

بزرگ کی بات سن کر میں بہت شرمسار ہوا، لیکن میں نے کوشش کر کے ان جذبات کو دبا دیا۔ اگر میں غلطی کر بیٹھوں تو احساسِ ندامت کر دبا دیا کرتا ہوں۔ یہ میری پرانی عادت ہے۔

دوست کو خدا حافظ کہہ کر میں سکوٹر پر سوار ہو کر چل پڑا۔

''انہیں کتنا دکھ ہوتا''۔ میرے دل سے آواز ابھری۔ میں نے کوشش کر کے اسے دبا دیا لیکن وہ پھر ابھری، حتیٰ کہ سڑک پر چلتی ہوئی موٹروں کے ہارن چلا چلا کر

کہنے لگے: ”انہیں کتنا دکھ ہوتا، انہیں کتنا دکھ ہوتا“۔ پھر ساری فضا اس آواز سے گونجنے لگی۔

کالی سڑک دوڑ رہی تھی۔ موٹر میں گہری خاموشی طاری تھی۔ ڈاکٹر عفت بت بنی بیٹھی تھی۔ قدرت اللہ کا چہرہ ریزہ ریزہ تھا۔ اس پر عجز و انکساری اور التجا کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر اتنا تاسف تھا، اتنی ندامت تھی جیسے اللہ تعالیٰ کے متعلق وہ کلمات میں نے نہیں بلکہ انہوں نے خود کہے ہوں۔ ان کے چہرے کا ریزہ ریزہ کہہ رہا تھا: ”انہیں کتنا دکھ ہوا ہوگا، انہیں کتنا دکھ ہوا ہوگا“۔

پھر دفعتاً مجھے وہ بات یاد آ گئی۔

ایک روز میں نے قدرت سے پوچھا تھا ”آپ نزدیک افضل ترین عبادت کون سی ہے؟“

بولے ”افضل ترین عبادت ہم آہنگی ہے“۔

”میں سمجھا نہیں“۔

”جسے آپ IDENTIFICATION کہتے ہیں۔ باری تعالیٰ کی کسی صفات کو اپنے پر طاری کر لینا۔“

”اونہوں“ میں نے جواب دیا ”باری تعالیٰ کو میں نہیں سمجھ سکتا۔ جو پانچ حواسوں میں مقید ہو وہ ایک غیر مرئی، عظیم اور لا محدود طاقت کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔ پھر ہم آہنگ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔“

”حضور اعلیٰ جو ہیں۔ ان کے ساتھ تو IDENTIFICATION ہو سکتی ہے نا“۔ قدرت نے جواب دیا۔

”ہاں وہ ہم میں سے ہیں۔ عظیم ہونے کے باوجود ہم میں سے ہیں۔“ میں نے جواب دیا

ان سے IDENTIFICATION افضل ترین عبادت ہے۔" قدرت نے کہا۔ "ان کی زندگی کے واقعات پر غور کرو، ان کی مشکلات کو جانچو، ان کے دکھوں کو محسوس کرو"۔

میں نے پھر سے قدرت کے ریزہ ریزہ چہرے کی طرف دیکھا۔ انہیں اتنا دکھ ہو رہا ہے۔ کیا قدرت افضل ترین عبادت میں مصروف ہیں......؟

ڈاکٹر عفت نے سر اٹھا کر غور سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور پھر ایک لمبی آہ بھر کر آنکھیں جھکا لیں۔ کیا یہ اپنے شوہر کے دکھ کر محسوس کر رہی ہیں؟ میں نے سوچا۔

ندامت سے میری پیشانی بھیگ گئی۔

دیر تک میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔

قدرت اور عفت دونوں خاموش تھے۔

رابطہ افسر غنی پہاڑیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

عرب ڈرائیور چپ چاپ گاڑی چلا رہا تھا۔

پتہ نہیں ہم سب کتنی دیر یوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر دفعتاً غنی کی آواز نے ہمیں چونکا دیا: "ہم مکہ معظمہ میں داخل ہونے والے ہیں"۔

مکۂ معظمہ

موٹر ایک پرانی وضع کے قصبے میں داخل ہو گئی۔ تنگ کھڑکیوں والی بھدی بوجھل دیواریں بے ڈھب حویلیاں، جنگلے، دالان، کوٹھڑیاں۔ خم کھاتی ہوئی تنگ گلیاں۔

قصبہ:

قصبے کے اردگرد چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ شہر خود ایک اونچے بے پر واقع تھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے غلطی سے مکے کی بجائے ہم سیالکوٹ جا پہنچے ہوں۔

میں نے شدت سے کوشش کی کہ جذبۂ احترام سے میرا بند بند بھیگ جائے، لیکن بے سود۔

میں نے سوچا حضورؐ ان گلی کوچوں میں گھوما پھرا کرتے تھے۔ ان ٹیلوں پر انؐ کے قدموں کے نشانات ابھی بھی موجود ہوں گے۔ اس فضا میں انؐ کی آواز لہریں ابھی تک رواں دواں ہوں گی۔

ایسی پاکیزہ سوچیں دل میں لانے کی میں نے شدید کوششیں کیں لیکن پھر بھی نہ ہوا۔ میری نگاہ میں وہ قصبہ عام سا قصبہ ہی رہا۔ ان سڑکوں دیواروں مکانوں میں کوئی تقدس پیدا نہ ہو سکا۔

موٹر رک گئی۔ "ایک منٹ"۔ غنی نے موٹر سے اتر کہا۔ اور پھر وہ ایک بارک میں داخل ہو گیا۔

"آپ تو مہمان خانے میں رہیں گے"۔ میں نے قدرت سے کہا۔

"پتہ نہیں" وہ بولے۔

"مجھے اپنے معلم کا ڈیرا تلاش کرنا ہو گا۔"

"ہاں"۔ وہ بولے "لیکن آپ فکر نہ کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ انشاء اللہ ہم زیادہ وقت اکٹھے ہی گزاریں گے۔"

غنی واپس آ گیا موٹر پھر چل پڑی۔

دیر تک ہم اس قصبے میں گھومتے رہے۔

پھر غنی چلایا "ذرا روکو" عرب ڈرائیور نے موٹر روک لی۔ "ایک منٹ" کہہ کر غنی پھر ایک عمارت میں داخل ہو گیا۔

گھنٹہ بھر ہم اس قصبے میں چکر لگاتے رہے۔ غنی کئی ایک بار مختلف عمارتوں میں گیا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" میں نے غنی سے پوچھا۔

"پہلے شہاب صاحب کی آمد کی رپورٹ کی تھی، اب مہمانداری کے دیگر انتظامات کر رہا ہوں"۔ غنی نے جواب دیا۔

فندق الکعکی :

آخر موٹر ایک بھدی سی پرانی مگر جدید وضع کی عمارت کے سامنے جا رکی۔

صدر دروازے پر جلی قلم سے لکھا تھا۔ "فندق الکعکی"۔

"آیئے تشریف لایئے"۔ غنی نے کہا۔ "اس ہوٹل میں آپ کے قیام کا بندوبست کیا گیا ہے۔"

وہ ایک پرانی وضع کا ہوٹل تھا، جیسے کمپنی بہادر کے دور میں سکہ بند انگریزوں کے ہوٹل ہوا کرتے تھے۔ ضخیم دیواریں، بھاری بھر کم ستون، اونچی چھتیں، فراخ زینے۔

صدر دروازے سے داخل ہوتے ہی ایک بڑا سا برآمدہ تھا۔ سامنے اندرونی صحن میں پرانی وضع کا باغیچہ تھا جس میں بڑے بڑے اور بھدے صوفے رکھے

ہوئے تھے۔ ان صوفوں پر دوہرے بدن کی میمیں اور صاحب بیٹھے تھے۔ اگرچہ صاحب احرام باندھے ہوئے تھے لیکن انداز سے یوں لگتا تھا جیسے سوٹ میں ملبوس ہوں۔ قریب جا کر پتہ چلا کہ وہ انگریز نہیں بلکہ مصری اور ترک ہیں۔

ڈائننگ ہال کے قریب وردی میں ملبوس "چاق و چوبند" بیرے سٹولوں پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ سارے ہوٹل پر خواب آلود کیفیت طاری تھی۔

ایک پرانی اور بھدی بھدی لفٹ کے ذریعے ہم فسٹ فلور پر پہنچے۔ غنی ہمیں کونے کے کمرے میں لے گیا۔ ایک جہازی ڈبل بیڈروم میں اس نے سامان رکھوا دیا اور قدرت سے کہنے لگا۔ "یہ آپ کا اور بیگم صاحب کا کمرہ ہے"۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہو کر بولا

"اور اس سے ملحقہ سنگل روم آپ کا ہے"۔

"میرا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی آپ کا" وہ بولا۔

"لیکن میں تو مہمان تو نہیں ہوں"۔

"پتہ نہیں کیسے لیکن وزارت کو پہلے سے ہی علم ہو چکا تھا کہ آپ شہاب صاحب کے ساتھ آئے ہیں اس لیے انہوں نے آپ کے لیے بھی ایک کمرہ بک کروا دیا ہے۔"

لیکن مجھے تو اپنے معلم کے پاس ٹھہرنا ہے" میں نے کہا۔

آپ کی مرضی ہے۔" غنی جواب دیا "یہ کمرہ بہرحال خالی پڑا رہے گا چونکہ آپ کے نام پر ہے۔"

وہ پھر شہاب سے مخاطب ہوا، بولا: "ایک موٹر اور ڈرائیور چوبیس گھنٹے آپ کی ڈسپوزل پر رہیں گے اور میں خود آتا جاتا رہوں گا۔ خدا حافظ۔"

غنی کے جانے کے بعد میں نے بڑی بے بسی اور لاچارگی بھری نگاہ سے قدرت کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے"۔ وہ بولے "جو آپ کا جی چاہے وہی کریں۔ جیسے بھی آپ چاہیں، لیکن فی الحال کچھ دیر کے لیے یہیں آرام کرلیں، پھر حرم شریف میں حاضری دیں گے۔"

"آرام؟" میں چلایا "کیا ہم یہاں آرام کرنے کے لیے آئے ہیں؟" میں نے دل میں کہا۔

قدرت نے اثبات میں سر ہلا دیا "میری طبیعت ٹھیک نہیں۔"

اپنے کمرے میں جا کر میں دھڑام سے پلنگ پر پڑ گیا۔

انگریز کی بو:

کمرے کی ہر چیز سے انگریز کی بو آ رہی تھی۔ ہر چیز پر اس کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ اس زمانے کے انگریز کی جب سلطنت برطانیہ پر سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا۔

مکہ معظمہ میں انگریز کی بو: لیکن وہ بو اس قدر واضح تھی کہ مجھے شک پڑنے لگا کہ ہم مکہ معظمہ کی بجائے کسی اور شہر میں آوارد ہوئے ہیں۔

پتہ نہیں کیوں مکہ معظمہ میں قیام کے متعلق میرے ذہن میں ایک اور ہی تصویر تھی۔ ایک بدرو تھی جس کے کنارے دری بچھی ہوئی تھی اور دری پر میں اکڑ بیٹھا تھا۔ میرے اردگرد طرح طرح کے زائرین عبادت میں مصروف تھے۔

کچھ دیر تو میں پلنگ پر پڑا رہا۔ پھر انگریز کی بو اس قدر شدت اختیار کر گئی کہ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ جی چاہا کہ قدرت سے جا کر پوچھوں کہ یہ سب کیا ہے۔ پھر خیال آیا کہ بیکار ہے۔ قدرت کہیں گے کیا فرق پڑتا ہے۔

جب بھی میں قدرت سے پوچھتا ہوں تو وہ کہتے ہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ انہیں اتنی بھی سمجھ نہیں کہ کتنا فرق پڑتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔ شاید قدرت ایسے مقام پر جا پہنچے ہوں جہاں فرق نہیں پڑتا۔ لیکن میں قدرت تو نہیں ہوں۔ میں تو ممتاز مفتی ہوں ممتاز مفتی۔ میرے لیے تو شیشے کے گلاس میں پانی پینے سے فرق پڑ جاتا ہے، سوٹ پہننے سے فرق پڑ جاتا ہے۔ اور پھر قدرت کس معصومیت سے کہتے ہیں کچھ دیر کے لیے آرام کر لیں۔ آرام؟ ہم کیا یہاں آرام کرنے آئے ہیں؟ اس ہوٹل میں پھیلی ہوئی انگریز کی بو سونگھنے آئے ہیں؟ میں نے غصے میں پلنگ کے قریب کھڑی میز کو لات ماری اور......

دروازے میں ڈاکٹر عفت کھڑی حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

''خیریت تو ہے؟'' وہ بولیں۔

''بالکل نہیں''۔ میں نے جواب دیا۔

''کیوں؟'' وہ سنجیدہ ہو گئیں۔

''پتہ نہیں آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں۔ نہ جانے یہ ڈبلن ہے یا ویلڈی مور۔ بہرطور مکہ معظمہ نہیں ہے۔''

ڈاکٹر عفت ہنس پڑیں۔ بولیں ''آپ حرم شریف چلے جائیں نا''۔

''تو چلئے نا''۔ میں نے بے تابی سے کہا۔

''شہاب کی طبیعت اچھی نہیں'' وہ بولیں ''آپ اکیلے ہو آئیں''۔

''نہیں''۔ میں نے جواب دیا۔ ''میں اکیلا نہیں جاؤں گا''۔

''پتہ نہیں ان کی طبیعت کب ٹھیک ہو''۔

''جب بھی ہو، میں اکیلا نہیں جاؤں گا''۔ میں اٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

''انہیں کیا تکلیف ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اس قابل نہیں کہ مسجد الحرام تک چل کر جا سکیں۔''

''کچھ میں نہیں آتا۔'' وہ بولیں۔ ''کہتے ہیں ویسے ہی بالکل ٹھیک ہوں لیکن جب حرم شریف جانے کا ارادہ کرتا ہوں تو ہڈیوں کے جوڑ اکڑ جاتے ہیں، حرکت کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔''

''ارے! یہ کیسی بیماری ہے ڈاکٹر صاحبہ'' میں نے کہا۔

''ڈاکٹر لوگ صرف دوائیوں سے واقف ہوتے ہیں، بیماریوں سے نہیں۔ میں سمجھتی ہوں۔ یہ RESISTANCE ہے۔ اسے ENCOURAGE نہیں کرنا چاہیے ورنہ پتہ نہیں کیا ہو جائے۔ کیوں نہ انہیں زبردستی حرم شریف لے چلیں۔'' ''ڈاکٹر عفت نے کہا'' ''آئیے'' وہ بولیں۔

قدرت کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے میرے دل میں کئی ایک سوالات ابھرے۔ RESISTANCE؟ کیسی RESISTANCE کس کی RESISTANCE؟ کس کے خلاف RESISTANCE؟

''چلئے اٹھئے''۔ ڈاکٹر عفت نے قدرت کو یوں ڈانٹا جیسے وہ بچہ ہو۔

قدرت نے بے بسی سے ہماری طرف دیکھا۔ ''نہیں''۔ انہوں نے اشارے سے التجا کی۔

''نہیں''۔ ڈاکٹر عفت نے کہا ''آپ حرم شریف جا رہے ہیں ابھی ہمارے ساتھ، چاہے آپ کے جوڑ کام کریں یا نہیں۔''

حرم:

چند ایک منٹ کے بعد ہم تینوں حرم شریف کی طرف جا رہے تھے۔ ہم دونوں نے قدرت اللہ کو سہارا دے رکھا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ قدم قدم چل رہے تھے اور ہر چار ایک قدموں کے بعد سانس لینے رک جاتے تھے۔

آدھ گھنٹے میں ہم نے ایک فرلانگ کی مسافت طے کی۔ حرم شریف کے قریب پہنچ کر قدرت کی حالت دفعتاً سدھر گئی۔ وہ روبصحت ہو گئے۔

"اگر تم زبردستی نہ لاتیں تو میں کبھی نہ آ سکتا۔" قدرت نے ڈاکٹر عفت سے کہا۔ ان کی آنکھیں شکرگزاری کے جذبے سے چھلک رہی تھیں۔ "اب میں ٹھیک ہوں، اب میں چل سکتا ہوں"۔

"میں اس RESISTANCE سے اچھی طرح واقف ہوں"۔ ڈاکٹر نے فاتحانہ مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا۔

دفعتاً میری نگاہ سامنے کی طرف اٹھ گئی۔ سامنے حرم شریف کی سلیٹی سنگ مرمر کی عظیم دیواریں کھڑی تھیں جن میں اونچی اور عظیم الشان محرابیں بنی ہوئی تھیں۔ دور چاروں طرف بلند و پروقار مینار کھڑے تھے۔

میں نے حیرانی سے ان عظیم الشان دیواروں کی طرف دیکھا۔ سنگ مرمر کی سلوں پر رگ سنگ کے عجیب و غریب لیکن خوشنما نقوش ابھرے ہوئے تھے۔

ان عظیم الشان دیواروں، ستونوں اور محرابوں کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ اگرچہ میری حیرت میں خوشی کا عنصر موجود تھا، پھر بھی پس منظر میں مایوسی کی جھلک موجود تھی۔ میری یہ خوشی ایسی تھی جیسے فرنگی سیاح تاج محل کو دیکھ کر محسوس کرتا ہے یا جیسے کوئی فن کار خوبصورت چیز کو دیکھ کر ایک بے نام فرحت محسوس کرتا ہے۔

اس خوشی میں عقیدت بھرے جذبات کا عنصر نہ تھا۔

ایمانداری کی بات ہے کہ میرے دل کی تہوں میں یہ گمان بھی نہ تھا کہ میرے اللہ کا گھر سنگ مرمر کی عظیم الشان دیواروں، محرابوں اور ستونوں سے سجا ہوا ہو گا۔ پتہ نہیں کیوں میرے دل میں یہ ایمان تھا کہ میرا اللہ سجاوٹ اور زیبائش سے بے نیاز ہے۔ وہ جو خود جاہ و حشم ہے اسے ایسے جاہ و حشم سے کیا واسطہ۔

بچپن میں بڑے بوڑھوں نے، مولوی صاحب نے، ماسٹر جی نے، سب نے بڑی محنت سے مجھے سمجھایا تھا کہ اللہ میاں بہت بڑے ہیں اور وہ بہت زود رنج ہیں۔ بات بات پر غصہ کھاتے ہیں۔ ان کی لاٹھی بے آواز ہے جسے گھمانے میں وہ اپنا بیشتر وقت صرف کرتے ہیں۔ وہ دوزخ کے دروازے پر بیٹھے ہیں اور ان کا واحد یہ مشغلہ یہ ہے کہ گنہگاروں کو پکڑ پکڑ کر دوزخ میں جھونکتے رہیں۔

سال ہا سال اللہ تعالیٰ کی یہ تصویر میرے سینے پر نقش رہی۔

ایک عمر گزرنے کے بعد میں نے جانا کہ اللہ تعالیٰ تو ایک گڈریا ہیں جنہیں اپنی بھیڑوں سے اتنی محبت ہے کہ ہر وقت انہی کے خیال میں محو رہتے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ میرے اللہ کے گھر کے گرد مٹی یا ناکندہ پتھروں سے بنی ہوئی دیوار ہوگی۔

عظیم الشان دیواریں تو مقبروں کی ہوتی ہیں، میرے اللہ تو زندہ ہیں۔

عظیم الشان دیواریں تو مندروں کی ہوتی ہیں، میرے اللہ بت تو نہیں۔

بڑے غور سے ان حسین اور عظیم دیواروں کو دیکھتا ہوا میں صدر دروازے سے حرم شریف میں داخل ہو گیا۔

اس عظیم مسجد میں چاروں طرف لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان گنت لوگ، ایک عظیم ہجوم، میں اس ہجوم کا جائزہ لینے لگا۔

خانۂ خدا:

قدرت نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی مسکراہٹ چمک رہی تھی۔ بولے "جب خانۂ خدا پر نظر پڑے تو چوتھا کلمہ پڑھنا۔"

"چوتھا کلمہ؟" میں نے دہرایا۔ میں تو صرف ایک کلمے سے واقف تھا۔

''خالی اللہ اکبر پڑھ لینا''۔ وہ بولے۔

میں نے سر اثبات میں ہلا دیا۔ دفعتاً ترکی تعمیر کا حصہ آگے سے ہٹ گیا اور خانۂ خدا میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

کالے پتھروں سے بنا ہوا ایک بھدا بے ڈھب کوٹھا جس پر سیاہ غلاف چڑھا تھا۔

پیشتر اس کے کہ میں اللہ اکبر کہہ پاتا، کوٹھے کی چھت سے کسی نے سر نکالا۔ چہرے کی جھریوں میں محبت کا ایک طوفان ابھر سمٹ رہا تھا۔ آنکھیں ہمدردی کے بے پناہ جذبے سے پرنم تھیں پیشانی منور تھی۔ ہونٹوں پر لگاؤ بھری مسکراہٹ تھی۔ اس مسکراہٹ نے پتہ نہیں کیا کیا۔

میرے وجود کے فلیتے کو گویا چنگاری دکھا دی گئی۔ اور وہ زو۔ زو۔ زو۔ ل سے راکٹ کی طرح فضا میں اڑ گیا۔

میرے بدن پر سرخ چیونٹے رینگنے لگے۔ ان سرخ چیونٹوں کے سروں پر جلتے دیئے تھے۔ ان دیوں کے شعلے گویا انگلیاں تھیں جو سب کوٹھے کی طرف اشارے کر رہی تھیں۔ میری نس نس میں سوڈے کی بوتلیں کھل گئیں اور ان سے بلبلے اٹھنے لگے۔ پھر میرے قلب میں ایک دھماکا ہوا۔ میرے وجود کی دھجیاں اڑ گئیں اور سارے حرم شریف میں بکھر گئیں۔

وہ عظیم الشان مسجد معدوم ہو گئی، زائرین کا وہ بے پناہ ہجوم چیونٹیوں میں بدل گیا۔ صرف کوٹھا رہ گیا۔ پھر وہ کوٹھا ابھرا، ابھرتا گیا، حتیٰ کہ ساری کائنات اس کی اوٹ میں آ گئی۔

نہ جانے میں کہاں تھا، کیا کر رہا تھا۔ ساری کائنات گویا فنا ہو چکی تھی۔ ملبے کا ایک عظیم ڈھیر۔ اس ڈھیر پر اللہ میاں بیٹھے تھے۔

طواف:

پھر ایک نوجوان ملا پوچھ رہا تھا: "طواف کرو گے؟"

"طواف؟" میرے ذہن میں اس وقت اس لفظ کا کوئی مفہوم نہ تھا۔

"ہاں کریں گے۔" قدرت اللہ کی آواز آئی۔

"ہاں کریں گے"۔ قدرت اللہ کی آواز آئی۔

"گیارہ ریال ہوں گے" نوجوان ملا نے کہا۔

قدرت اللہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ ملا بولا "جو میں پڑھوں اسے دہراتے جاؤ"

ہم دونوں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

چار ایک قدم چلنے کے بعد قدرت گر پڑے۔ ان کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ چہرے پر بے بسی اور لاچاری بھری سلوٹیں رینگ رہی تھیں۔

میں رک گیا۔

"جائیے جائیے"۔ قدرت نے اشارہ کیا۔

"لیکن آپ؟" میں نے کہا۔

"مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے، جائیے"۔

اگر اس وقت میرے ہوش و حواس قائم ہوتے تو میں رک جاتا۔ مجھے احساس ہوتا کہ قدرت اللہ کو ENGINA کا دورہ پڑ چکا ہے، اور انہیں میری ضرورت ہے۔ ویسے بھی میں قدرت کے بغیر اکیلا کبھی طواف نہ کرتا۔ لیکن اس وقت میری سدھ بدھ ماری ہوئی تھی۔ اس وقت قدرت اللہ کی کوئی حیثیت نہ رہی تھی۔ اس وقت میرے نزدیک کسی کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ صرف تھا اور میرے اللہ تھے۔

میں دیوانہ وار جوان مُلا کے پیچھے پیچھے خانۂ خدا کے پھیرے لینے لگا۔ پتہ

نہیں وہ کیا گنگنا رہا تھا۔ میں بڑی کوشش کی کہ اس کی بولی ہوئی آیات کو دہراؤں، لیکن بے سود ابھی ایک چکر پورا نہ ہوا تھا کہ میں نے محسوس کیا وہ مُلا میرے اور میرے اللہ میاں کے درمیان واحد رکاوٹ تھی۔ میں نے دوڑتے ہوئے اپنا بیگ کھولا۔ گیارہ ریال نکالے۔ نوجوان مُلا کا چغہ پکڑ لیا۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے گیارہ ریال اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا ہوا چلا گیا۔

میں نے اپنے بیگ سے ڈی ایف پی کی شائع کی ہوئی کتاب ''احکام حج'' نکالی جس میں طواف کی آیات چھپی ہوئی تھیں اور جن کا عربی متن میں نے اردو میں لکھا ہوا تھا۔ وہ کتاب ہاتھ میں پکڑے آیات پڑھتے ہوئے میں خانہ خدا کے گرد گھومنے لگا۔

وہ کتاب میری ہاتھوں میں بوجھل ہوتی گئی، بوجھل ہوتی گئی۔

آیات میرے حلق میں کانٹوں کی طرح چبھنے لگیں۔ پھر وہ کتاب پھیلنے لگی، پھیلتی چلی گئی۔ وہ کتاب اتنی بڑی ہوگئی کہ وہ مسجد مطاف اور وہ کوٹھا اور اس پر وہ متبسم چہرہ سب کتاب کی اوٹ میں آ گئے۔

غصے میں میں نے کتاب کو دور پھینک دیا۔

اب میرے اور میرے اللہ کے درمیان کچھ حائل نہ تھا۔ نہ پہلا چکر نہ دوسرا نہ تیسرا۔ نہ کوئی مقام محمود تھا نہ مقام ابراہیم۔

زندگی میں پہلی بار میرے اللہ میری خاطر اس بے ڈھب سے کوٹھے میں محدود ہو گئے تھے۔ پہلی بار میری خاطر میرے اللہ ایک جسم میں مقید ہو گئے تھے۔

پہلی بار میرے اللہ میری خاطر بت بن گئے تھے تاکہ میرے دل میں چھپے ہوئے بت پرست کی تسکین ہو سکے۔

میرے اللہ میرے روبرو تھے اور میں ان کے گرد والہانہ گھوم رہا تھا۔

اس وقت میرے اللہ بت تھے اور میں بت پرست تھا۔ اس وقت اللہ کے طواف سے بڑھ کر کوئی عیاشی نہ تھی، کوئی لذت نہ تھی۔ جی چاہتا تھا کہ طواف جاری رہے، جاری رہے، جاری رہے۔

"جاری رہے گا"۔ کوٹھے کی چھت سے آواز آئی۔ پھر منیٰ، مزدلفہ، عرفات، مدینہ منورہ سب اس کوٹھے کی اوٹ میں آ گئے۔ اور طواف جاری رہا۔

مسجد الحرام

مکہ معظمہ کے قیام کے دوران زائرین کی کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ وقت حرم شریف میں گزاریں اس لیے حرم شریف ہر وقت زائرین سے کھچا کھچ بھرا رہتا ہے۔ وہاں بیٹھ کر لوگ نوافل پڑھتے رہتے ہیں یا تسبیح کرتے ہیں یا قرآن خوانی میں مصروف رہتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو وہاں بیٹھ کر مطافِ زائرین یا خانۂ خدا کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ اگر آپ وہاں بغیر کسی رسمی مصروفیت کے چوبیس گھنٹے خالی ہی دیکھتے ہی رہیں تو بھی آپ کا دل اکتاتا نہیں۔

حرم میں سب سے بڑی کشش خانۂ خدا ہے۔ جانے ان جانے میں زائرین کی نگاہیں اس کالے بے ڈھب کوٹھے پر مرکوز رہتی ہیں۔ پتہ نہیں خانہ خدا میں کیا کشش ہے کہ آپ کا جی چاہتا ہے اسے دیکھتے ہی چلے جائیں۔ پھر مطاف ہے۔ مطاف چوبیس گھنٹے طواف جاری رہتا ہے۔ طواف کرنے والوں پر ایک عجیب کیفیت طاری رہتی ہے۔ ایک ایسی کیفیت جسے دور بیٹھ کر دیکھنے سے ہی انسان شرابور ہو جاتا ہے۔ مطاف سے ہر وقت عقیدت، محبت اور عشق کے چھینٹے اڑتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ حرم کے صحن میں بیٹھے ہوئے زائرین میں بے پناہ کشش ہوتی ہے۔ زائرین لاکھوں کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ عورتیں، مرد بچے، نوجوان، بوڑھے۔ رنگا رنگ کے لوگ، مختلف قومیتوں کے لوگ حبشی، عرب، یورپی، چینی، جاپانی، روسی، روکی، ایرانی دنیا کے ہر ملک کے زائروں کے گروہ جگہ جگہ بیٹھے ہوتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر، ان کا جذبہ محسوس کر کے دل میں ایک عجیب تقویت محسوس ہوتی ہے، ایک بے نام فرحت۔

بیشتر زائرین حرم میں بیٹھ کر ذکر یا عبادت مصروف رہتے ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ میں بھی اس شغل کو اپناؤں لیکن میرا دل نہ مانا۔ جب محبوب سامنے

ہو، اس کی موجودگی کو آپ بند بند میں محسوس کریں تو پھر ذکر اور حمد و ثنا کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔

کالا کوٹھا:

میری نگاہیں خانہ خدا پر مرکوز تھیں۔ میں نے قدرت سے پوچھا: "میں نے کہا یہ کالا کوٹھا جو ہے، جو اس قدر بے ڈھبا بنا ہوا اس میں اس قدر کشش کیوں ہے؟ جی چاہتا ہے اس پر نثار ہو جائیں۔"

"ارے صاحب ادب سے بات کیجئے۔ آپ اسے کالا کوٹھا کہتے ہیں"۔ میرے پاس بیٹھے ہوئے میر صاحب نے غصے سے میری طرف دیکھا۔

"میر صاحب یہ اللہ کا کوٹھا ہی تو ہے"۔ میں نے جواب دیا۔ "میں پنجابی ہوں اور پنجابی میں خانہ کا مطلب کوٹھا ہوتا ہے۔ آپ اسے خانہ خدا کہتے ہیں، میں اسے اللہ کا کوٹھا کہتا ہوں۔"

میر صاحب مصر تھے کہ کوٹھے کے لفظ میں تحقیر کا عنصر ہے۔ دراصل وہ اہل زبان تھے اور انہیں پنجابی کے ہر لفظ سے تحقیر کا احساس ہوتا تھا۔ اس کے برعکس مجھے کوٹھے کا لفظ پیارا لگتا تھا۔ اس میں اپنائیت محسوس کر رہا تھا۔

میں نے زندگی میں بہت سے کوٹھے دیکھے ہیں لیکن خانہ خدا جیسا کوٹھا کبھی نہیں دیکھا۔ وہ کوٹھا انوکھی ساخت کا ہے۔ اس کے طول وعرض اور بلندی کا تناسب اس قدر منفرد اور انوکھا ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ یہ تناسب مروجہ اصولوں اور معیاروں سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔

اس کوٹھے میں کوئی دریچہ نہیں، کھڑکی نہیں، روشندان نہیں۔ صرف ایک دروازہ کھلتا ہے اور یہ دروازہ زمین سے ایک چوتھائی منزل اونچا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے اس کی اونچائی عجیب معلوم پڑتی ہے۔ پھر یہ بھی کہ اس کی دیواروں کے رخ

مسجد کی دیواروں کے رخوں سے ہم آہنگ نہیں۔

رہ رہ کر میرے دل میں خیال آتا کہ میرے اللہ کی شان نرالی ہے کہ اس نے اپنے کوٹھے کی تعمیر اس قدر منفرد کروائی جس میں نہ کوئی ڈھب ہے نہ ڈھنگ ہے اور اس بے ڈھبے کالے کوٹھے میں جاذبیت اس قدر کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے کہ زائر کی نگاہیں اس پر اس حد تک مرکوز ہو جاتی ہیں کہ وہ عظیم مسجد، خوبصورت اور پر ہیبت دیواریں، عظیم الشان محرابیں نگاہ میں ہیچ ہو کر رہ جاتی ہیں اور وہ کالا بے ڈھبا کوٹھا ابھرتا ہے، ابھرے چلا جاتا ہے حتیٰ کہ تمام کائنات اس کی اوٹ میں آ جاتی ہے۔

میں نے قدرت سے پوچھا: "کبھی کوئی اللہ کے اس کوٹھے میں داخل بھی ہوا ہے کیا؟"

"مجھے یہ سعادت حاصل ہے" وہ بولے۔

میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

قدرت نے کہا "ایک بار جب صدر ایوب کی معیت میں میں نے حاضری دی تھی تو شاہ سعود نے کمال مہربانی فرمائی اور ہمیں خانہ کعبہ کے اندر لے گئے۔ ہم نے وہاں نفل پڑھے تھے۔"

"آپ نے؟" میرے حلق میں نہ جانے کیا آ پھنسا تھا۔

"ہاں" وہ بولے "اندر نماز پڑھو تو دیواروں کی منہ کر کے کھڑے ہونا پڑتا ہے۔"

"لیکن لیکن۔ کیا آپ نے کچھ محسوس کیا تھا؟"

"اس وقت مجھ پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ اندر جاؤ تو ہیبت چھا جاتی ہے۔" وہ بولے "ہیبت" اور پھر موضوع بدلنے کے لیے کہنے لگے۔ "یہ آپ کے ہاتھ میں کیا ہے؟"

"یہ کاپی ہے" میں نے جواب دیا۔

"یہ کیسی کاپی ہے"؟ قدرت نے پوچھا۔

"اس میں دعائیں لکھی ہیں۔ میرے کئی دوستوں نے کہا تھا کہ خانہ کعبہ میں ہمارے لیے دعا مانگنا۔ میں نے وہ سب دعائیں اس کاپی میں لکھ لی تھیں۔"

قبولیت کا خطرہ:

"دھیان کرنا" وہ بولے۔ "یہاں جو دعا مانگی جائے وہ قبول ہو جاتی ہے۔"

"کیا مطلب؟" میری ہنسی نکل گئی۔ "کیا دعا قبول ہو جانے کا خطرہ ہے؟"

"ہاں، کہیں ایسا نہ ہو کہ دعا قبول ہو جائے"۔

میں نے حیرت سے قدرت کی طرف دیکھا۔

بولے "اسلام آباد میں ایک ڈائریکٹر ہیں۔ عرصہ دراز ہوا انہیں روز بخار ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر، حکیم، وید، ہومیو سب کا علاج کر دیکھا، کچھ افاقہ نہ ہوا۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئے۔ آخر چارپائی پر ڈال کر کسی درگاہ پہ لے گئے۔ وہاں ایک مست سے کہا بابا دعا کر کہ انہیں بخار نہ چڑھے...... انہیں آج تک بخار نہ چڑھا۔

اب چند سال سے ان کی گردن کے پٹھے اکڑے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی گردن ادھر اُدھر ہلا نہیں سکتے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ یہ مرض صرف اسی صورت میں دور ہو سکتا ہے کہ انہیں بخار چڑھے۔ انہیں دھڑا دھڑ بخار چڑھنے کی دوائیاں کھلائی جا رہی ہیں مگر انہیں بخار نہیں چڑھتا۔"

دعاؤں کی کاپی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ میں نے اللہ کے گھر کی طرف دیکھا۔ "میرے اللہ! کیا کسی نے تیرا بھید پایا ہے۔"

اب بولو:

خانہ خدا کی چھت سے ایک پراسرار چہرہ ابھرا۔ ماتھے پر تیوری، آنکھوں میں بے پناہ محبت، ہونٹوں میں ایک بلاوا۔ اس مسکراہٹ سے بجلی سی گری۔ میں دیوانہ وار اٹھ بھاگا اور کوٹھے کے پھیرے لینے لگا۔

وہ طواف نہیں تھا۔ طواف میں ایک رکھ رکھاؤ ہوتا ہے، ایک وقار ہوتا ہے، ایک نظم وضبط ہوتا ہے۔ دیوانگی نہیں ہوتی۔

مکہ معظمہ میں مَیں نے کبھی طواف نہیں کیا تھا۔ کوشش کے باوجود طواف نہیں کرسکا تھا اور اس کی وجہ وہ کوٹھا تھا۔ اس کی چھت سے کوئی سر نکال کر میری طرف دیکھتا۔ اس کی مسکراہٹ گویا رنگ بھری پچکاری چلا دیتی۔ میں شرابور ہو جاتا اور جو شرابور ہو جائے وہ کیا جانے کہ رکھ رکھاؤ کیا ہوتا ہے، وقار کسے کہتے ہیں۔

لوگو میں حاجی ممتاز مفتی ہوں، لیکن میں نے حج نہیں کیا۔ مجھ میں حج کرنے کی خواہش ضرور تھی۔ رسمی خواہش۔ میں نے منیٰ میں حاضری دی، مزدلفہ میں کنکر چنے، عرفات میں پہنچا۔ لیکن اس رنگ بھری پچکاری والے نے میری ہر منزل کھوٹی کردی۔

جہاں اور جب کبھی میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا سامنے اس کا کوٹھا ابھر آیا اور پھر ہر جگہ پر مقام اس کی اوٹ میں آگئے۔ اس نے مجھے حج نہیں کرنے دیا۔ اس نے مدینہ منورہ کو بھی اپنی اوٹ میں لے لیا اور پھر مسکرا کر کہنے لگا۔ ''تم کہا کرتے تھے مجھے اللہ سے کیا لینا دینا۔ میں تو صرف حضور اعلیٰ کو جانتا ہوں۔ اب بولو۔''

اذان:

سکھ لوگ اذان نہیں سنتے۔ پتہ نہیں یہ مذہبی حکم ہے یا بڑوں کی ریت ہے۔ جب بھی ان کے کانوں میں اذان کی آواز پڑتی ہے، وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ اور پھر بھاگ اٹھتے ہیں۔ اس لحاظ سے میں بھی سکھ ہوں۔ میری کوشش

ہوتی ہے کہ میں اذان کی آواز نہ سنوں۔

اذان کیا ہے؟ ایک بلاوہ...... آ جاؤ مسلمانوں۔ بھائیو، ساتھیوں، مزدورو آ جاؤ۔ آؤ کہ ہم اکٹھے مل کر اللہ کے حضور سجدہ کریں۔

ہمارے موذن اذان کو بلاوہ نہیں سمجھتے۔ پتہ نہیں کیوں وہ اسے ایک آہ سمجھتے ہیں۔ ایک کراہ، ایک لمبی سسکی۔ ان کی دردناک آواز میں اداسی کے انبار لگے ہوتے ہیں۔ وہ اداسی دھوئیں کی طرح چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ وہ اداسی دلوں پر بوجھ بن کر گرتی ہے۔ وہ اداسی امید کی لو بجھا کر مایوسی کے اندھیرے کو مسلط کر دیتی ہے۔ "اللہ اکبر اللہ اکبر" جیسے اللہ کا بڑا ہونا ایک افسوس ناک امر ہو، وہ اداسی پکار پکار کر کہتی ہے...... لوگو! ہم اپنے اللہ سے مایوس ہو چکے ہیں۔

اذان سن کر مجھے وہ نظم یاد آ جاتی ہے۔ جو پتہ نہیں کس شاعر نے لکھی ہے مگر کیا خوب لکھی ہے۔ کہتے ہیں:

؎ جب کھینچ کے آہِ سرد
کہتا ہے کوئی بندہ
جس حال میں بھی رکھے
صد شکر ہے اللہ کا
میں سوچنے لگتا ہوں
یہ شکر کیا اس نے
یا طعنہ دیا اس نے
رزاقِ دو عالم کو

حرم میں بیٹھے ہوئے جب پہلی مرتبہ اذان ہوئی تو میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ کیا چیز ہے! میں چونکا۔ یوں محسوس ہوا جیسے میں نے زندگی میں پہلی بار اذان سنی ہو۔ اس

اذان نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ کس نے بلایا مجھے۔ کس نے بلایا مجھے۔

حرم شریف کی اس اذان نے سوتوں کو جگا دیا، بیٹھوں کو اٹھا کر کھڑا کر دیا، کھڑوں کو دوڑا دیا...... بھاگ جانے کے لیے نہیں بلکہ پہنچنے کے لیے۔ میں آ رہا ہوں، میں آ رہا ہوں۔

وہ اذان بلاوہ تھی، وہ اذان رگوں میں خون بن کر دوڑتی تھی۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے نماز کے لیے نہیں بلکہ جہاد کے لیے بلایا جا رہا ہو۔

حرم میں جو ساؤنڈ لگا ہوا ہے اس کے ACOUSUICS اس نوعیت کے ہیں کہ اذان کی آواز ربڑ کے گیند اکٹھے گر کر اچھل رہے ہوں اور ان کی ٹپ ٹپ سے ایک عجیب سماں بندھ جاتا ہے۔

نماز:

اس وقت حرم میں لاکھوں لوگ بیٹھے تھے۔ نئے داخل ہونے والے زائرین کا تانتا لگا ہوا تھا۔ جب زائرین نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو صفیں مکمل کرنے کے لیے لوگوں نے آگے کی طرف یورش کی۔ میرے قریب کھڑے بڑے میاں کو دھکا لگا۔ "ارے میاں"۔ وہ چلائے۔ "دِکھتا نہیں تمہیں کہ آگے لوگ کھڑے ہیں۔ اللہ نے دیکھنے کو آنکھیں دی ہیں میاں ان سے کام لو۔"

ابھی وہ بُڑ بُڑ کر ہی رہے تھے کہ بھیڑ کا ایک اور ریلا آیا۔ بڑے میاں پھر لڑھک کر ادھر جا پڑے۔ "واہ صاحب واہ، عجیب تماشہ ہے! حرم کو اکھاڑہ بنا دیا ان لوگوں نے۔"

بڑے میاں پھر بڑبڑانے لگے۔ میں بڑے انہماک سے بڑے میاں کی باتیں سن رہا تھا۔

قدرت نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ بولے "اونہوں شیطان کے جال میں نہ پھنسو۔"

"میں تو بڑے میاں کی باتیں سن رہا تھا۔"

"بڑے میاں بھی تو اسی جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔"

"اسی جال میں پھنسے ہیں؟"

"ہاں یہی شیطان کا جال ہے"۔

"میں نہیں سمجھا"۔

"لوگ اتنے شوق سے یہاں آتے ہیں۔ اور پھر معمولی تفصیلات میں الجھ کر اپنی منزل کھوٹی کر لیتے ہیں۔ سارا کھیل توجہ کا ہے۔ توجہ بھٹکنے نہ دو ورنہ یہ لمحات ضائع ہو جائیں گے۔" قدرت کے چہرے پر ایک عجیب سی سنجیدگی طاری تھی۔ بولے "یہاں کوئی تفصیل اہم نہیں۔ کچھ بھی اہم نہیں۔ صرف ایک حاضری، حضوری کا احساس۔ لیکن ہم حاضر ہو کر بھی غیر حاضر رہے ہیں۔"

"حاضر ہو کر بھی غیر حاضر رہتے ہیں! حاضر ہو کر بھی غیر حاضر رہتے ہیں"! لاؤڈ سپیکروں نے تکبیر کے بہانے شور مچا نے دیا۔

"اللہ اکبر"۔ نماز شروع ہو گئی۔

حرم شریف اتنا کشادہ ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ لیکن نماز کے وقت وہ اتنا تنگ ہو جاتا ہے کہ جی گھبرانے لگتا ہے۔ صفوں کے درمیان کچھ فاصلہ نہیں رہتا۔

سجدہ:

جب سجدے کا وقت آیا تو میں گھبرا گیا۔ پچھلی صفوں کا نمازی تہ شدہ ٹانگوں کے اندر زبردستی اپنا سر گھسیڑ رہا تھا۔ اگلی صف اس قدر قریب تھی کہ سر زمین پر ٹیکنے کی

گنجائش نہ تھی۔ سجدہ ادا کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

"یہ کیا مصیبت ہے"۔ میرے ذہن سے آزردگی کی ایک لہر ابھری اور میری روح پر مسلط و محیط ہوگئی۔ "یہاں تو نماز پڑھنا ہی ممکن نہیں"۔

پھر پتہ نہیں کیسے پرلی طرف سے ایک دھکا لگا۔ ساری صف لڑکھڑا گئی۔ پچھلی صف کے نمازی نے اپنا سر میری ٹانگوں میں ٹھونک دیا۔ مجھے گدگدی ہونے لگی۔

"لاحول ولاقوۃ"۔ آزردگی نے خفگی کی شکل اختیار کر لی، حتیٰ کہ مجھے احساس ہی نہ رہا کہ میں کہاں کھڑا ہوں، کیا کر رہا ہوں۔"

"حاضر ہو کر بھی غیر حاضر رہتے ہیں، حاضر ہو کر بھی غیر حاضر رہتے ہیں"۔

لاؤڈ سپیکر نے نہ جانے کس بہانے شور مچا دیا۔

حاضر ہو کر بھی غیر حاضر ہوں۔ میں چونکا۔

"یہاں کوئی تفصیل اہم نہیں۔ صرف حاضری، مسلسل احساس حضوری"۔

سجدہ نہیں ہوتا تو پھر کیا ہوا۔ احساسِ حضوری تو خود ایک سجدہ ہے۔

میں نے نماز پڑھتے ہوئے کانی آنکھ سے کوٹھے کی طرف دیکھا۔

منڈیر سے کسی نے مجھے آنکھ ماری اور سر اثبات میں ہلا دیا۔

"حضوری، حضوری!" لاؤڈ سپیکر نے شور مچا دیا۔ میں نے محسوس کیا جیسے ہم تینوں خفیہ سازش میں حصے دار تھے۔ کوٹھے کا والی، لاؤڈ سپیکر اور میں۔

صرف حضوری:

اگلے روز حرم میں بیٹھے ہوئے میں نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ کئی زائر تسبیح کے منکوں کے ساتھ مصروف تھے۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ محبوب کی موجودگی میں بیٹھ کر اسے پیار بھرے خط لکھ رہے ہوں۔

ایک طرف ایک شخص دوسرے کو اپنے سفر کا حال سنا رہا تھا۔ دوسری طرف اُظم

وضبط کا ایک شیدائی طواف کی بدنظمی پر لکچر پلا رہا تھا اور زبردستی اردگرد کے لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کر رہا تھا۔ "کوئی بات ہے یہ کہ عورتیں اور مرد مل کر طواف کریں۔ ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ ایک دوسرے سے بغل گیر ہوں۔ جناب طواف گاہ کے درمیان ایک چھوٹی سی دیوار کھڑی کی جا سکتی تھی تا کہ اس کے دو حصے ہو جائیں۔ ایک عورتوں کے لیے، ایک مردوں کے لیے۔ کیوں صاحب میں کیا غلط کہتا ہوں؟"

"یہ دھکم پیل دیکھ رہے ہیں آپ؟ لاحول ولاقوۃ......وہ دیکھو......وہ دیکھو وہ ......وہ عورتوں کا گروہ......ارے ارے ارے۔ دیکھو تو مرد زائرین نے ان پر یورش کر دی ہے۔ نہ صاحب! یہ منظر غیر اسلامی ہے۔ کیوں صاحب میں کیا غلط کہتا ہوں۔" اس نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ چلا کر کہا۔

میرا جی چاہا کہ اٹھ کر کھڑا ہو جاؤں اور گلا پھاڑ کر چلاؤں: "یہاں سب تفصیلات غیر اہم ہیں۔ صرف حضوری صرف حضوری"۔

دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ میں خود بھی غیر حاضر تھا۔ حاضر ہو کر بھی غیر حاضر تھا۔ تسبیح کے شیدائی نے منکوں کا پردہ قائم کر رکھا تھا۔ نظم ونسق کے دیوانے نے پردے کی اوٹ کھڑی کر رکھی تھی۔ اور میں نے حاضری کی تلقین غیر حاضری کا بہانہ بنا رکھا تھا۔

پھر میری نگاہ قدرت پر جا پڑی۔ وہ میری طرف دیکھ کر یوں مسکرائے جیسے میری کیفیت کو جانتے ہوں، جیسے مجھ سے ہمدردی کر رہے ہوں۔

پتہ نہیں وہ کون تپسوی تھے جو سالہا سال سے دھیان لگائے بیٹھے تھے۔ ان کا دھیان توڑنے کے لیے دشمنوں نے نرتکی بھیجی۔ نرتکی نے تپسوی کے گرد ناچنا شروع کر دیا۔ ناچتی رہی ناچتی رہی حتیٰ کہ تپسوی نے آنکھیں کھول دیں اور ان کا دھیان

ٹوٹ گیا۔

انوکھا تپسوی:

قدرت اللہ ایسے تپسوی ہیں جو کھلی آنکھوں سے دھیان لگاتا ہے اور ساتھ ہی نرتکی کو کافی آنکھ سے دیکھتا بھی جاتا ہے، مگر اس کا دھیان نہیں ٹوٹتا۔

پتہ نہیں انہوں نے یہ گر کہاں سے سیکھا ہے۔

حرم میں قدرت مجھ سے بات بھی کر لیتے تھے، نظم ونسق کے دیوانے کا لکچر بھی سن لیتے تھے لیکن ایسے کہ حضوری میں فرق نہ آئے۔

قدرت کو کسی سے لاگ نہیں، کسی سے لگاؤ نہیں۔ صرف حرم کی بات نہیں، عام زندگی میں اچھا دوست ہونے کے باوجود وہ کسی کے دوست نہیں۔ ان کے رویئے میں ایک بنیادی بے تعلقی ہے۔ وہ کسی تعلق کو اپنے دھیان کے دائرے کے مرکز میں آنے نہیں دیتے۔ ان کے دوست، عزیز بیوی ان کی توجہ کے CIRCUM FRENCE تک پہنچتے ہیں اس سے زیادہ نہیں۔ پتہ نہیں اللہ کے بندے دو ملاؤں میں مرغی حلال کیسے کر لیتے ہیں۔ پتہ نہیں وہ توجہ کو دو طرف منعطف کیسے کرتے ہیں۔ لیکن وہ ایسا کرتے ہیں۔ وہ DIVINE UNCONCERN کو اپنا لیتے ہیں۔

جیمز نے اپنی کتاب کے ابتدائی صفحات میں لکھا ہے: ''سمندر کے کنارے بیٹھ کر یا تو آپ لہریں گن سکتے ہیں یا اپنی ذہنی کیفیت پر غور کر سکتے ہیں۔ دونوں کام بیک وقت نہیں کر سکتے۔''

میرے اللہ! تو جو خود اصول اور نظم وضبط کا علمبردار ہے، تیرے بندے اس اصول سے مستثنیٰ کیوں ہیں کیوں۔ تیرے بندے دونوں کام بیک وقت کرتے ہیں، کیوں؟

میں نے قدرت کی طرف غور سے دیکھا۔وہ عجیب انداز میں بیٹھے تھے۔میں نے کئی بار کوشش کی تھی کہ اس انداز کو اپنالوں لیکن بے سود۔

وہ یوں بیٹھے تھے جیسے عجز، احساسِ گناہ، تأسف، ندامت سے ان کا بند بند سرشار ہو۔

مجھے ان کی طرف دیکھ کر غصہ آنے لگا۔ یہ کیا ڈھونگ رچایا ہوا ہے انہوں نے۔عجز بے شک ان میں ہے، لیکن احساس گناہ کس بات پر۔وہاں نیک بن کر عزت کراتے رہے، یہاں گنہگار بن کر امتیاز حاصل کر رہے ہیں۔

میں نے کوٹھے کی طرف دیکھ کر کہا: "یہ شخص جو میرے دائیں ہاتھ بیٹھا ہے پاکھنڈی ہے۔ یہ گنہگار نہیں، گنہگار میں ہوں میں"۔اس نے گنہگاری کا ڈھونگ صرف اس لیے رچا رکھا ہے کہ خود کو تیری خصوصی توجہ کا مستحق ظاہر کرے۔"

کوٹھے کی چھت پر کوئی مسکرا رہا تھا، اشارے کر رہا تھا۔

پہلے تو میں سمجھتا رہا کہ وہ مجھ سے مخاطب ہے، پھر دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ وہ مسکان کسی اور کے لیے تھی۔کسی اور کو اشارے کیے جا رہے تھے۔ یہ کیا تماشہ ہے۔میرے ہوتے ہوئے کسی اور کو اشارے کرنے کا مطلب؟ غصے سے میرا خون کھولنے لگا۔

اس روز مجھ پر انکشاف ہوا کہ صرف مجھ سے ہی نہیں، اوروں سے بھی روز و نیاز چل رہے ہیں۔

شاید حرم میں بیٹھے ہوئے ہر زائر سے آنکھ مٹکا چل رہا ہو۔ان سے بھی جو دھیان لگائے بیٹھے ہیں اور ان سے بھی جن کا دھیان کسی نرتکی نے توڑ دیا ہے، اور شاید اس نرتکی سے بھی جو دھیان توڑنے کی دھن میں لگی ہے۔

ابلیس کے دانت:

اسی روز حرم سے باہر نکل کر میں نے قدرت سے پوچھا: "یہ گنگا جمنی توجہ کیا چیز ہے"۔

"گنگا جمنی؟" انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"یہ بیک وقت دو اطراف توجہ بانٹنے کا مسئلہ کیا ہے؟"

بولے "کون بانٹتا ہے توجہ؟"

میں نے کہا "اللہ کے بندے"۔

"اللہ کے بندوں کا بھید کسی نے نہیں جانا۔" قدرت نے جواب دیا "کہتے ہیں حضرت علیؓ گھوڑے پر چڑھتے چڑھتے ایک لاکھ مرتبہ درود شریف کا ورد کر لیا کرتے تھے۔ ان پراسرار بندوں کا بھید کوئی نہیں جان سکا"۔

"حرم شریف میں بیٹھے ہوئے زائرین کی توجہ کیوں بھٹکتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"صرف ان کی توجہ بھٹکتی ہے جن کے بارے میں اندیشہ ہوتا ہے، جن کے دھیان میں اثر ہوتا ہے۔"

"اندیشہ کسے ہوتا ہے؟"

"اسے جس کا یہ فرض ہے کہ جہاں پہنچنے کا خطرہ ہو وہاں راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دی جائیں۔"

"وہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ابلیس"۔

"ابلیس؟" میں نے دہرایا۔

"وہ بڑا مستعد کارکن ہے۔ اللہ کا حکم بجا لانے کے لیے بڑی جان مارتا ہے۔"

"تو شیطان یہاں بھی موجود ہے کیا؟"

"یہاں تو خود ابلیس موجود ہوتا ہے"۔

"وہ کیوں"

"یہ مقام بڑے خطرے کا مقام ہے۔ یہاں ایجاب و قبول کے در وا ہیں۔ یہاں گذشتہ گناہ شمار میں نہیں آتے۔ یہ گنہگاروں کی جنت ہے۔ یہاں قدم اٹھانے اور پہنچنے کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں، لہذا زائرین کو ورغلانا بے حد ضروری ہے"۔

اس وقت ہم دونوں واپس ہوٹل کی طرف جا رہے تھے۔

"آیئے آپ کو دوسرے راستے سے ہوٹل لے جاؤں کہ آپ خود دیکھ لیں"۔

یہ کہہ کر قدرت مڑ گئے اور میں ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

چند قدموں کے بعد ہم ایک بازار میں جا پہنچے۔ بازار کو دیکھ کر میری آنکھیں چندھیا گئیں۔

دوکانیں رنگ رنگ کی خوبصورت اشیاء سے لدی ہوئی تھیں۔ کپڑا، زیور، سنگار کا سامان، کھلونے، تیار ملبوسات، گھڑیاں، گیجٹ۔ وہاں ہر وہ امپورٹڈ چیز موجود تھی جسے خریدنے کی میری ہمیشہ سے خواہش رہی تھی۔

وہ تنگ بازار کھچا کھچ زائرین سے بھرا ہوا تھا۔ لوگ دھڑا دھڑ چیزیں خریدنے میں مصروف تھے۔ اس گہما گہمی اور افراط کو دیکھ کر میری آنکھیں پھٹ گئیں۔ میں بھول گیا کہ میں زائر ہوں۔ میں بھول گیا کہ میں مکہ معظمہ ہوں۔ میں یہ بھول گیا کہ کوٹھے سے جھانکنے والے مجھے ہمراز بنا رکھا ہے۔ میں بھول گیا کہ حرم شریف میں میں لوگوں پر ہنستا تھا کہ حاضر ہو کر بھی غیر حاضر ہیں۔ بازار کے اوپر ابلیس بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دانت نکلے ہوئے تھے۔

تین دن ہم نے مکہ میں گزارے۔

گنگا جمنی:

وہ دن بھی عجیب دن تھے۔ زندگی گنگا جمنی تھی، جیسے میں نے بیک وقت دو محبوباؤں سے یارانہ لگا رکھا ہو۔ ایک تو وہ پردہ نشیں تھا جو کوٹھے سے جھانک جھانک کر میری طرف مسکراہٹیں پھینکا کرتا تھا، اور دوسرے وہ انگریزی ہوٹل تھا جو بوڑھی میم کی طرح میرا انتظار کیا کرتا تھا اور جب میں اپنے کمرے میں پہنچتا تو وہ بوڑھی میم میری گود میں آ بیٹھتی تھی۔

ہوٹل میں داخل ہوتے ہی میری دنیا بدل جاتی۔ بیرے "یس سر، یس سر" کہہ کر مجھے کمپنی بہادر بنانے پر مصر ہو جاتے۔ میز پر پڑی پلیٹیں "میڈ بائی جانسن" میڈ بائی جانسن" کی سرگوشیاں کرتیں۔ چمچے کانٹے چھریاں "ہیلو سر، ہیلو سر" گنگناتے۔ پڈنگ پوچھتا رایٹ سر "ورمے سیلیز" میرے ذہن کے ارد گرد جالے تنتیں۔ باہر برآمدے میں بوڑھی میمیں بڑے رکھ رکھاؤ سے میری طرف دیکھتیں۔ پھر لفٹ پر کھڑا وردی میں ملبوس سٹوورڈ ٹوپی اتار کر مجھے سلام کرتا، حتیٰ کہ مجھے محسوس ہوتا کہ میں لندن میں کسی جگہ پک نک کرنے آیا ہوں۔ کمرے میں پہنچتا تو بڑے بڑے بیڈ، موٹے موٹے پائیدار صوفے، شاہی وضع کی کرسیاں سب مجھے "ویلکم" کرتے۔ اور پھر وہ ہوٹل کی روح شوخ لیکن وضعدار میم آ کر بے تکلفانہ میری گود میں بیٹھ جاتی اور کہتی DARLING DON'T BE SO SUPERSTITIOUS پھر مجھے یاد آتا کہ قدرت کہا کرتے ہیں "کیا فرق پڑتا ہے"۔ قدرت کس قدر بے خبر ہیں۔

صبح جب قدرت مجھے جگاتے کہ چلو فجر کی نماز کا وقت ہو گیا تو مجھے بڑا غصہ آتا۔ بلکہ ایسے ہی جیسے سکہ بند انگریز کو غصہ آیا کرتا تھا جب اردلی اسے نامناسب وقت پر جگا دیتا تھا۔ آج کا انگریز نہیں بلکہ اس زمانے کا انگریز جب ایمپائر پر سورج

کبھی غروب نہیں ہوتا تھا۔

ہم تینوں صبح سویرے چار بجے حرم شریف پہنچ جاتے۔ نماز کے بعد ہوٹل میں بریک فاسٹ کرتے۔ پھر ظہر کی نماز کے لیے حرم پہنچتے۔ پھر دوپہر کو ہوٹل میں آ کر لنچ کرتے۔ شام کو عصر کے لیے پھر حرم جاتے اور عشاء کے بعد واپس آتے۔

ہوٹل سے نکل کر حرم کو جاتے تو ایسے لگتا جیسے فقیر بھیک مانگنے نکلے ہوں۔ حرم سے واپس آ کر ہوٹل میں داخل ہوتے تو ایسے لگتا جیسے لارڈ کا یو پک نک کر کے آئے ہوں۔

ہاں وہ زندگی عجیب زندگی تھی۔ گویا ہماری میز پر شربت صندل اور کافی کے پیالے پڑے ہوئے تھے اور باری باری ایک گھونٹ شربت پیتے اور ایک گھونٹ کافی۔ اس پر بھی قدرت کہتے تھے کیا فرق پڑتا ہے۔

انجائینا:

ان تین دنوں میں قدرت کو انجائینا کے چار دورے پڑ چکے تھے۔ ان دوروں کی نوعیت عجیب تھی۔

اسلام آباد میں ایک روز رمضان کی ستائیسویں کی شب میں نے قدرت سے کہا "آج کی رات میں آپ کے ساتھ گزاروں گا۔" قدرت پر گھبراہٹ سی طاری ہو گئی۔ بولے "آپ کیا کریں گے؟" میں نے جواب دیا "جو آپ کریں گے"۔ بولے "میں تو شاید نفل پڑھوں"۔ میں نے کہا "میں دیکھوں گا کہ نفل کس طرح پڑھے جاتے ہیں"۔ قدرت زچ ہو گئے۔ انہیں میری بات ماننی پڑی۔

رات کے دس بجے کے قریب انہوں نے نفل پڑھنے شروع کئے۔ ساری رات وہ نفل پڑھتے رہے اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھتا رہا۔

میرا خیال تھا کہ پتہ نہیں کیا ہو گا۔ کمرا فری مینز ہال بن جائے گا اور اس میں

عجیب وغریب RITUAL ہوں گے یا کمرے میں آسمان سے روشنی کی ایک کرن گھس آئے گی۔قدرت کے سر پر ایک ہالہ بن جائے گا۔پھر فرشتے اتریں گے اور پھر اللہ کی آواز آئے گی۔"مانگ کیا مانگتا ہے؟" لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔

ساری رات گزر گئی، قدرت نفل پڑھتے رہے اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔

ہاں صرف ایک بات تھی۔

نفل پڑھتے ہوئے قدرت کے قیام اتنے لمبے تھے کہ مجھے سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کھڑے ہو کر کیا کیا کچھ پڑھتے ہیں۔اس کے علاوہ حیران کن بات یہ تھی کہ قدرت کا کھڑے ہونے انداز عجیب تھا۔اس میں عجز، ندامت، گنہگاری اور توبہ کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔قدرت کو کھڑے دیکھ کر بار بار مجھے وہ پینٹنگ یاد آتی تھی جس میں عالمِ دعا میں "جاب" کے عجز، ندامت اور توبہ بھرے ہاتھ دکھائے گئے ہیں۔ اس وقت قدرت بنفسِ نفیس گویا جاب کے دعائیہ ہاتھ بنے ہوئے تھے۔

ساری رات نفل پڑھنے کے بعد جب پو پھٹی تو قدرت کو انجائینا کا دورہ پڑ گیا اور دو ماہ کے لیے وہ صاحب فراش رہے۔

میں نے کہا "یہ اچھی عبادت ہے جس کے صلے میں دل کا دورہ پڑ جاتا ہے!"

"نہیں نہیں" وہ بولے "قصور میرا اپنا تھا۔شیشے کے برتن پر اگر اتنا ہی دباؤ ڈالو کہ سہار نہ سکے تو وہ تڑخ جاتا ہے"۔

مکہ معظمہ میں قیام کے دوران قدرت چار مرتبہ تڑخے۔

میں نے ڈاکٹر عفت سے پوچھا: "میں نے کہا ڈاکٹر یہ بتاؤ کہ شیشے کا برتن کمزور ہے یا دباؤ زیادہ۔"

ڈاکٹر نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا ''تین دنوں میں چار مرتبہ انجائینا کا دورہ پڑا ہے۔''

وہ ہنسی اور بولیں ''انجائینا بے چارے کا تو مفت میں نام بدنام ہے''۔

''تو پھر یہ کیا ہے؟''

''مجھے کیا پتہ کوئی بیماری ہو تو مجھے پتہ چلے۔''

''تو یہ بیماری نہیں کیا''۔

''بیماری اتنی سوجھ بوجھ کی مالک نہیں ہوتی۔''

''سوجھ بوجھ کی؟''

''ہاں پہلی مرتبہ انہیں اس وقت دورہ پڑا جب انہوں نے حاضری دینے کا ارادہ کیا۔ دوسرا اس وقت پڑا جب یہ پہلا طواف کرنے لگے تھے۔ تیسرا اس وقت پڑا جب انہوں نے سعی شروع کی اور چوتھا اس وقت پڑا جب حج پر روانہ ہوئے۔ ابھی پتہ نہیں کتنے دورے اور پڑیں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان کے انجائینا میں کمپیوٹر لگا ہوا ہے۔''

میری ہنسی نکل گئی۔

''ویسے بھی'' وہ بولیں ''جب بھی ہم حرم شریف جانے کا ارادہ کرتے ہیں تو ان کا جسم اکڑ جاتا ہے۔ پھر میں زبردستی سونٹا مار کر اٹھاتی ہوں۔''

''اچھا تو پھر یہ ہے کیا؟'' میں نے پوچھا۔

RESISTANCE_ RESISTANCE

''ارے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اندر سے کوئی کہے چل اٹھ اور پھر اسی اندر سے کوئی کہے رک جا۔'' معاف کرنا ڈاکٹر میں نہیں سمجھا۔

ڈاکٹر غصے میں بولیں۔ ''میں نے کب دعویٰ کیا ہے کہ میں سمجھتی ہوں''۔

ڈاکٹر عفت:

ڈاکٹر عفت کی مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی۔

پہلی مرتبہ جب میں نے ڈاکٹر عفت سے طبی مشورہ پوچھا۔ میں نے کہا۔

"ڈاکٹر ہائی بلڈ پریشر کے لیے کوئی دوا بتائیے"۔

بولیں "تارامیرا کے بیج تلی بھر نہار منہ کھاؤ، صرف تین دن"۔

میں نے حیرت سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ پھر میری ہنسی نکل گئی "عفت! آپ ڈاکٹر ہیں کہ پنساری"۔ میں نے کہا۔

ڈاکٹر عفت جب ہیگ میں تھیں تو پاکستان سے ترپھلا منگوایا کرتی تھیں۔ پانچ روپے کے ترپھلے پر ۳۵ روپے کرایہ لگتا تھا۔

مکہ وہ مجھے ساتھ لے کر اسپغول تلاش کرتی پھریں کیوں کہ قدرت کے پیٹ میں خرابی تھی۔ میں نے کہا۔ "ڈاکٹر اسپغول تو پنساری کی دوکان سے ملے گا۔ آپ کیمسٹوں کی دوکانوں پر ڈھونڈ رہی ہیں۔"

عفت بولیں: "اب انہوں نے اسپغول کو باٹل کر لیا ہے۔ نام ہے اسپ گال۔"

حج پر آنے سے پہلے میں نے پوچھا "ڈاکٹر! الرجی کے لیے کوئی دوا ہے کیا؟"

بولیں "ایلوپیتھی میں کوئی حتمی دوا نہیں۔ عارضی آرام کی دوائیں ہیں۔ ان سے بیماری نہیں جاتی۔ آپ فلاں آیت کا ورد کیا کریں۔ انشاءاللہ شفا ہو گی۔ میری آزمودہ ہے۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر آہستہ بولیے، اگر میڈیکل کونسل کے کسی رکن نے سن لیا تو وہ آپ کا لائسنس ضبط کر لیں گے"۔ یہ کہہ کر میں قہقہہ مار کر ہنسا۔

ڈاکٹر عفت دوسروں کے قہقہوں سے نہیں گھبراتیں۔ وہ اپنے خیالات اور

BELIEFS پر شرمسار نہیں ہوتیں۔

ایک بار لندن میں کسی انگریز نے ڈاکٹر عفت سے پوچھا ''آپ مسلمان لوگ سؤر کیوں نہیں کھاتے''۔ ڈاکٹر عفت بولیں: ''بتائیے کہ آپ کتا کیوں نہیں کھاتے''۔

انگریز بوکھلا گیا۔ بولا ''میں نے اس کے بارے میں کبھی نہیں سوچا''۔

عفت نے کہا: ''میں نے بھی سؤر کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ میں سؤر اس لیے نہیں کھاتی کہ میرے اللہ کا حکم ہے کہ سؤر مت کھاؤ''۔

دو سال پہلے ڈاکٹر عفت ہومیوپیتھی کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ پھر لاہور کے نور بابا کے طریق علاج سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ نور بابا کے طریق علاج کو اپنا لیں گے۔ کیونکہ نور بابا کے پاس پرانی، پراسرار بیماریوں کے ایسے مریض آتے ہیں جنھیں ڈاکٹر INCURABLE قرار دے چکے ہوتے ہیں اور حیرت کی بات ہے کہ ان میں سے چالیس فی صد صحت مند ہو جاتے ہیں حالانکہ نور بابا صرف خوراک کے ذریعے علاج کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ خوراک میں جو دوا کا عنصر ہوتا ہے، وہ خالص دوا کی نسبت زیادہ پر اثر ہوتا ہے۔ نور بابا کے نظریئے نے ڈاکٹر عفت کو بہت متاثر کیا کیسے آپ کی سمجھ میں بات آئی؟ میری سمجھ میں تو نہیں آئی۔

موٹی بات یہ ہے کہ دونوں میاں بیوی ہی بعید از فہم ہیں۔

مثلاً شادی کے بعد آج تک دونوں میں ایک بات پر جھگڑا ہے جو شاید کبھی طے نہ ہو پائے۔

قدرت کہتے ہیں ''جب میں نے پہلی مرتبہ ڈاکٹر عفت کو دیکھا تو وہ ملیشے کا سوٹ پہنے سلائی کی مشین چلا رہی تھیں''۔

ڈاکٹر کہتی ہیں "ملیشے کا سوٹ میں نے زندگی بھر نہیں پہنا"۔

قدرت کہتے ہیں "اگر تم نے ملیشے کا سوٹ نہ پہنا ہوتا تو میں کبھی شادی کے لیے تمہارا چناؤ نہ کرتا۔"

ڈاکٹر کہتی ہیں "کاش کہ میں ملیشے کا سوٹ نہ پہنتی"۔

قدرت کہتے ہیں "نہ پہنتی تو اتنا بڑا اعزار کیسے حاصل ہوتا"۔

ڈاکٹر کہتی ہیں "سی۔ایس۔پی کی بیوی ہونے کے عذاب سے بچ جاتی"۔

بہر حال ڈاکٹر کی بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ اور میں سوچتا رہا، سوچتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی اہم مقام آتا ہے، قدرت کو دورہ پڑ جاتا ہے۔ جب بھی حرم جانے کا وقت آتا ہے، ان کے اعضا اکڑ جاتے ہیں۔ سوچتا سوچتا میں ہوٹل سے باہر نکل گیا۔

چور اور گٹھڑی:

"السلام علیکم"۔ ایک ہندوستانی وضع کے بڑے میاں نے مجھے چونکا دیا۔ وہ بڑے مزے میں تھے۔ ہاتھ میں تسبیح چل رہی تھی۔ منہ میں پان چل رہا تھا۔

"آپ پان ساتھ ہیں؟" میں نے پوچھا

"نہیں تو" وہ بولے "میاں یہاں کیا نہیں ملتا"۔ وہاں نکڑ پر پاک ہوٹل ہے، وہاں سے جا کر پان کھاؤ"۔

پاک ہوٹل میں داخل ہوا تو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ ہوٹل میں آیا ہوں۔ میز لگے ہوئے تھے، کرسیاں کھڑی تھیں، چلنے کا راستہ بند تھا "لڑکا چلا رہا تھا۔ آلو گوش۔ کدو گوش۔ دال قیمہ" بات ہوئی نا۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے مرغابی جھیل میں آ گئی ہو۔

جس میز پر مجھے جگہ ملی وہاں ایک افریقی بیٹھا تھا۔ اس نے خوش آمدید کے

لیے دانت نکال دیئے۔

چائے کا پیالہ پیتے ہوئے مجھے پھر سے قدرت کے دورے کی بات یاد آ گئی۔

"وریڈ (WORRIED)" افریقی نے پوچھا۔

"نو۔۔لیس لیس وریڈ"۔

"سم تھنگ رونگ یو؟ آئی مین ودیو"۔

"نو" میں نے کہا "ENGINA_ COMPANION" ہارٹ۔ دورہ۔آئی مین فٹ طواف۔فٹ طواف۔فٹ۔طواف فٹ"۔

افریقی ہنسنے لگا۔پھر سر نفی میں ہلاتے ہوئے بولا "اونووری (WORRY) نووری"۔

"وائی ناٹ" میں نے کہا۔

"WHERE THERE IS GOLD THERE IS THIEF HE MUST BE GOLD."

افریقی نے دانت نکال کر میری طرف دیکھا۔

"گٹھڑی میں لاگو چور مسافر جاگ ذرا۔گٹھڑی میں لاگا چور"۔ہوٹل کے ریڈیو سے کے سی ڈے کی آواز گونجی۔

میں چونکا۔ہوں! گٹھڑی اور چور کی بات ہے۔میں نے سوچا لیکن گٹھڑی اور چور کا بھید کیا ہے۔گٹھڑی کون ہے، چور کون ہے؟

"اللہ اکبر اللہ اکبر" موذن نے حرم کے مینار سے جواب دیا۔

دفعتاً مجھے خیال آیا کہ عفت اور قدرت دونوں مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے چوں کہ نماز کے وقت ہم اکٹھے ہوٹل سے مسجد جایا کرتے تھے۔وہ دونوں فکر مند ہوں گے۔یقیناً وہ مسجد میں پہنچ چکے ہوں گے۔میں دیوانہ وار اٹھا اور مسجد کی طرف بھاگا۔

حرم شریف میں پہنچ کر میں انہیں ڈھونڈنے لگا۔ حرم شریف میں کسی کو ڈھونڈنا آسان کام نہیں ہوتا۔

عورت:

دفعتاً کسی نے میرا بازو پکڑ لیا۔ "وہ دیکھو وہ" وہ چلایا۔ "طواف میں عورتیں اور مرد گڈمڈ ہو رہے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ اگر یہ لوگ درمیان میں ایک چھوٹی سی دیوار بنا دیتے تو ایک طرف عورتیں طواف کرتیں اور دوسری طرف مرد۔ کیوں صاحب! میں غلط کہہ رہا ہوں کیا؟"

"عورت؟ عورتیں؟" میں نے ناظم ونسق صاحب کو پہچان کر کہا۔ یہ کس عورت کی بات کر رہا ہے؟ کون سی عورتیں؟ میں نے حیرانی سے چاروں طرف دیکھا۔ ان پانچ لاکھ زائرین میں، جو اس وقت حرم میں موجود تھے، ایک بھی عورت نہ تھی۔

ہمیں مکہ شریف میں آئے تین روز ہو چکے تھے، لیکن میں نے وہاں کوئی عورت نہ دیکھی تھی۔

سعودی عرب کے چھپے ہوئے اعداد و شمار کے مطابق زائرین کی کل تعداد پانچ لاکھ تھی جن میں سوا لاکھ عورتیں تھیں۔ وہ سوا لاکھ عورتیں کہاں چھپی بیٹھی تھیں۔

عورت کے متعلق میں بہت زود حس ہوں۔ جس طرح مینڈک کو آنے والی بارش کی بو آ جاتی ہے اسی طرح مجھے عورت کی بو آ جاتی ہے۔ لیکن جب سے میں نے مکہ معظمہ میں قدم رکھا تھا مجھے وہاں کوئی عورت دکھائی نہیں دی تھی۔

سوال یہ ہے کہ عورت کیا ہے......؟

عورت نہ حسن ہے نہ جنس ہے نہ جسم ہے۔ کئی عورتیں آپ کے پاس سے گزر جائیں گی، لیکن آپ کو خبر بھی نہ ہو گی۔ کوئی عورت آپ سے بہت دور کھڑی ہو گی اور آپ محسوس کریں کہ وہ عورت کھڑی ہے۔ جیسے وہ چلا چلا کر کہہ رہی ہو: "میں عورت

ہوں ۔لوگو میری طرف دیکھو میں عورت ہوں"۔

تو عورت کیا ہے؟ ایک نشر گاہ، ایک جسم ۔جس میں ایک ٹرانسمیٹر لگا ہو، جو یہ نشر کرتا رہے "میری طرف دیکھو، میں عورت ہوں"۔ٹرانسمیٹر کے علاوہ عورت میں ایک کمپیوٹر لگا ہوتا ہے جو مناسب موقع پر از خود ٹرانسمیٹر کو چلا دیتا ہے۔

سوا لاکھ عورتیں جو حرم میں بیٹھی تھیں ان سب کے ٹرانسمیٹر خراب ہو چکے تھے۔ان میں سے کسی ایک کو احساس نہ تھا کہ وہ عورت ہے۔کوئی پیغام یہ نشر نہیں کر رہی تھی "میری طرف دیکھو میں عورت ہوں"۔کسی مرد کا ریسیور کام نہیں کر رہا تھا۔ پھر پتہ نہیں اظم ونسق صاحب کیوں بار بار چلا رہے تھے: "وہ دیکھو عورتیں اور مرد اکٹھے طواف کر رہے ہیں"۔

ایٹم بم:

اس وقت حرم میں صرف ایک محبوب تھا۔صرف ایک کشش، صرف ایک جادو جو سروں پر چڑھ کر بول رہا تھا۔پانچ لاکھ زائرین ایک خیال، ایک آرزو لیے بیٹھے تھے۔خیال اور آرزو بذات خود ایک طاقت ہے۔یہ طاقت بجلی پیدا کرتی ہے۔

پانچ لکھ جنریٹر خیال کی طاقت سے چل رہے تھے۔

پانچ لاکھ دل ایک جذبے سے دھڑک رہے تھے۔

حرم میں اتنی بجلی پیدا ہو رہی تھی کہ زائرین کو دھکے لگ رہے تھے۔

پانچ لاکھ نیگیٹو پوائنٹس (NEGATIVE POINT) ایک (POSITIVE POINT) کی یورش کر رہے تھے۔

حرم میں اس وقت ایک ایٹم تھا جس میں لاکھوں ذرات نیوکلس کے گرد گھوم رہے تھے۔میری نگاہ کوٹھے کی طرف منعطف ہو گئی۔

نیوکلس سے وہی سر بھرا۔وہی مسکراہٹ، وہی بلاوا۔ میں بھاگا اور کوٹھے کے

گردیوں پھیرے لینے لگا جیسے وہ میری سہاگ رات ہو۔

مطاف:

''وہ دیکھو وہ دیکھو''۔ اظم وضبط کا متوالا چلایا۔ اس نے خانہ کعبہ کی طرف اشارہ کیا ''طواف میں ہڑبونگ مچا رکھا ہے۔ لاحول ولاقوۃ''۔

سنگِ اسود:

سنگ اسود کے قریب زائرین دھکم پیل کر رہے تھے۔ سنگ اسود کو بوسہ دینے کی خواہش ان پر بھوت بن کر سوار تھی۔ ہر کوئی دوسرے کو پیچھے کی طرف دھکیل رہا تھا۔ اپنا راستہ بنانے کے لیے یوں کندھے مار رہا تھا جیسے مطاف فٹ بال گراؤنڈ ہو۔

''ارے صاحب!'' میر صاحب نے آہ بھری ''دیکھ لو دو دن میں بیسیوں بار طواف کر چکے ہیں لیکن سنگ اسود کو بوسہ دینے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی''۔

''وہاں تو فٹ بالر ہی پہنچ سکتا ہے میر صاحب'' صاحب اظم ونسق ہنسے۔

''اپنے میں تو اتنی جان نہیں''۔ میر صاحب نے آہ بھری۔

''کوئی اظم وضبط ہو، کیو لگا ہو، باری باری زائرین آگے بڑھیں تو بات بنے۔ کیوں جناب؟ اظم وضبط کے دیوانے نے میرا شانہ جھنجھوڑا۔''

''جی'' میں نے جان چھڑانے کے لیے دانت نکال دیئے۔

''دراصل دقت یہ ہے کہ سنگ اسود قدم آدم جتنا اونچا نہیں ہے۔ بوسہ دینے کے لیے جھکنا پڑتا ہے۔'' میر صاحب بولے۔

''صرف یہی نہیں صدیوں کی بوسہ بازی سے سنگ اسود اب گھس گھس کر پیالہ بن گیا ہے۔ پہلے سر جھکاؤ پھر اس پیالے میں ہونٹ ڈالو''۔

''جب تک پیچھے سے بھیڑ کا ریلا آجاتا ہے۔'' میر صاحب بولے۔

"ہاں اور سر وہیں چپکا رہتا ہے اور دھڑ آگے چل پڑتا ہے۔" جناب اظم ونسق صاحب نے قہقہہ لگایا۔ "میر صاحب سنگ اسود کو بوسہ دینے کا خیال چھوڑ دیئے۔ بس اشارے پر ہی گزارا کیجئے"۔

"ارے نہیں صاحب" میر صاحب بولے "اتنی دور سے آئے ہیں تو کیا یہ سعادت حاصل کیے بغیر ہی لوٹ جائیں گے؟ نہ صاحب"۔

"بنیادی غلطی پلاننگ کی ہے۔ سنگ اسود کو قد آدم جتنا اونچا لگانا چاہیئے تھا، اور وہ اتنا ابھرا ہوتا کہ صدیوں کی بوسہ بازی کے بعد زیادہ سے زیادہ ہموار ہو جاتا۔" اظم ونسق صاحب نے کہا۔

ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے عابد نے کپکپی لی اور اظم ونسق کے دیوانے پر ایک خون آلود نگاہ ڈالی ان کی نگاہ دیکھ کر میں کانپ گیا۔

اس وقت ہم حرم شریف میں برصغیر کے زائرین کے ایک گروہ کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔

"یہ ہم کہاں آ بیٹھے ہیں آج؟" میں نے قدرت سے کہا۔

قدرت نے توجہ کیے بغیر کان میری طرف موڑ دیا۔

"یہ لوگ تو جزو و کُل پر مسلط کیے بیٹھے ہیں، چلئے کہیں اور چل کر بیٹھیں" میں نے قدرت سے کہا۔

قدرت نے ذرا ٹھہرو کا اشارہ کیا اور اپنی پر اسرار مصروفیت جاری رکھی۔ کچھ دیر کے لیے ہم خاموش بیٹھے رہے۔

"پتہ نہیں اظم وضبط کا دیوانہ کون ہے؟" میں نے اپنے آپ سے کہا۔

دل چھوٹا:

"ان کا نام سرفراز ہے۔ یہ پاکستان کے اعلیٰ افسر ہیں۔" قدرت نے کہا۔

"ہوں! پلاننگ میں۔ سقم کی تحقیق کرنے آیا ہے یہ یہاں" میں نے طنزاً کہا۔ قدرت نے میری طنز کو نظر انداز کردیا۔

"سرفراز پلاننگ کے ماہر ہیں"۔ وہ بولے "بڑے اچھے آدمی ہے"۔

"بڑا اچھا آدمی ہے، بڑا اچھا آدمی ہے، بڑا اچھا آدمی ہے"۔ قدرت کی زیر لبی حرم میں چاروں طرف گونجی۔ کوئی تمسخر اڑا رہا تھا، مذاق کر رہا تھا۔

قدرت اللہ شہاب کا مردم شناسی کا معیار میرے لیے نا قابل فہم ہے۔

فلاں شخص بڑا منہ پھٹ ہے۔ گالی دینے سے گریز نہیں کرتا۔ لیکن بڑا اچھا آدمی ہے۔

فلاں شخص بڑا منہ بند ہے، نک چڑھا ہے، خود پسند ہے۔ مگر بڑا اچھا آدمی ہے۔

فلاں شخص بڑا نکتہ چیں ہے، عیب گنوانے میں مزہ لیتے ہیں۔ پر ہے بہت اچھا آدمی ہے۔

"خاک اچھا آدمی ہے۔" میں نے کہا "یہ تو عقل و خرد کی تلوار چلائے جا رہا ہے اور پھر یہاں حرم شریف میں"۔

"اونہوں دل چھوٹا نہ کیجئے۔" قدرزیر لب بولے۔

دفعتاً بات جگنو بن کر میرے ذہن میں چمکی۔ "ہوں! تو قدرت مردم شناسی سے پہلو تہی اس لیے کر رہے ہیں کہ دل چھوٹا نہ ہو۔ کتنا خود غرض ہے یہ شخص جو علم، ادراک، جذبہ، راستی سب کچھ اپنے قلب کی صفائی کے تحفظ کے لیے قربان کرنے سے گریز نہیں کرتا۔"

"یہاں جو چاہو کرو"۔ قدرت نے کہا "صرف دل چھوٹا نہ کرو۔ کیا پتہ یہ شخص جو آپ کے دائیں ہاتھ بیٹھا ظم و نسق اور پلاننگ کی طرف ہماری توجہ مبذول

کرا رہا ہے سی آئی ڈی کا آدمی ہو"۔

"سی آئی ڈی کا آدمی یہاں حرم میں؟"

رکاوٹیں:

"شاید یہ اس بات پر مامور ہو کہ جانچے، کون دل چھوٹا کرتا ہے"۔

"یہاں بھی سی آئی ڈی ہوتی ہے کیا لیکن کس کے لیے؟"

"رکاوٹیں سی آئی ڈی ہی ہوتی ہیں۔ یہاں کئی صورتوں میں رکاوٹیں سامنے آتی ہیں۔"

"کیوں آتی ہیں سامنے؟ یہ کیا مداری پن ہے۔ خود ہی جذبہ پیدا کرتا ہے، خود ہی بلاتا ہے، خود ہی رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے۔"

"ہاں" قدرت مسکرائے۔ وہ مسکراہٹ اس قدر رندانہ تھی جیسے کوئی شرابی لڑکھڑا کر بات کر رہا ہو "رکاوٹیں بڑی ضرور ہوتی ہیں"۔

"ضروری؟"

"رکاوٹ نہ ہو تو حرکت ممکن نہ ہو۔ کشش ثقل نہ ہو تو پودے نہ اگ سکیں۔ رکاوٹ اس بات کی دلیل ہے کہ ہماری حرکت مثبت ہے۔ رکاوٹ یہ ثابت کرتی ہے کہ ہمیں اہمیت دی جا رہی ہے۔ وہ دیکھو وہ"۔ قدرت نے ایک اونگھتے ہوئے زائر کی طرف اشارہ کیا "وہ زائر عبادت کرتے کرتے سو گیا ہے۔ تخریبی طاقت مخل ہو تو......"

"بات ٹوٹ جاتی ہے"۔ میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

"اونہوں، ٹوٹتی نہیں، بلکہ بات چل نکلنے کی خبر لاتی ہے۔ عبادت میں نیند آ جائے تو سمجھو عبادت کاٹ رہی ہے"......

"علی حیدر!" ایک پہلوان نما پنجابی نے ہمارے قریب آ کر دونوں بازو اٹھا

کر نعرہ لگایا۔ ''بھاجی! سنگ اسود کو چوم کر آئے ہیں'' وہ بولا۔ ''سنگ اسود کو چومے بغیر بھلا آ سکتے تھے ہم۔''

''لیکن وہاں تو بڑی بھیڑ ہے''۔ میر صاحب بولے۔

''ہم کیا پروا کرتے ہیں بھیڑ کی''۔ پنجابی نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''پر وہ تو رستہ روکے بیٹھے ہیں''۔ سرفراز نے کہا۔

''رستہ روکنے والے کی ایسی کی تیسی۔ اس کے فلاں کے فلاں کا فلاں''۔ پہلوان نے بڑے خضوع اور خشوع سے منہ پھاڑ کر صلوات سنائی۔ پھر بولا۔ ''ساری عمر کسرت کی ہے بھاجی، کو مخول ہے۔ ایک کو اٹھا کر ادھر پھینکا، ایک کو موہڈا مار کر ادھر کیا۔ پانچ دس کو پیچھے گھسیٹا۔ ایک کر گردن دبائی۔ ایک کو ایڑی ماری۔ بس راستہ صاف ہو گیا۔ پھر جی بھر کر سنگ اسود کو چوما۔ کسی کی مجال نہیں ہوئی کہ ہم کو ادھر سے ہٹائے۔ علی حیدر!'' اس نے پھر نعرہ لگایا۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا جیسے سنگ اسود کو بوسہ دے کر نہیں، اللہ میاں کی گود میں بیٹھ کر آیا ہو۔

پراسرار بندے:

قدرت اللہ اٹھ بیٹھے۔ ''چلئے''۔ انہوں نے کہا ''حطیم میں دو نفل ادا کریں۔ آیئے''۔

''ہاں ہاں ہو آیئے ہو آیئے''۔ میر صاحب بولے۔ ''اپنی جاء نماز یہیں رہنے دیجئے ہم حفاظت کریں گے''۔

میری صاحب نے اتنی محبت اور خلوص سے بات کی کہ ہم میں جاء نماز اٹھانے کی ہمت نہ پڑی۔ اور ہمارا جگہ بدلنے کا منصوبہ ناکام ہو کر رہ گیا۔

''حطیم کون سی جگہ ہے؟'' میں نے قدرت سے پوچھا۔

''مطاف میں میزان رحمت کے نیچے حطیم ایک ENCLOUSER ہے،

ایک چار دیواری۔"

"اس چار دیواری میں کیا خصوصیت ہے؟"

"حطیم اولیائے کرام کی جائے عبادت ہے۔ کہتے ہیں وہاں ہر وقت ایک نہ ایک ولی اللہ مصروف عبادت رہتا ہے۔ اگر اکیلا شخص ہو جان لو کہ وہ بزرگ ہے، ولی اللہ ہے کم از کم"۔

"اور اگر ایک سے زیادہ ہوں تو؟"

"تو پتہ نہیں ان میں کتنے ولی اللہ ہوں۔ اولیائے کرام حطیم میں عبادت کرنا بڑا اعزاز سمجھتے ہیں۔ وہ ایک پاکیزہ مقام ہے۔ عبادت کے لیے ارفع و اعلیٰ جگہ ہے"۔

"اچھا...... یہ ولی لوگ کون ہوتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ولایت ایک مرتبہ ہے، جس طرح فوج میں کپتان ہوتا ہے"۔

"اللہ کی فوج میں خالی کپتان ہی ہوتے ہیں کیا؟"

"کیوں؟"

"میں نے جب بھی سنا ولی کا نام ہی سنا ہے"۔

"نہیں۔ کئی ایک مراتب ہوتے ہیں: ولی، ابدال، اوتاد، اخیار، غوث، قطب۔ پتہ نہیں اور کتنے مراتب ہوں گے۔" قدرت نے جواب دیا۔

"ان کا آپ کو کیسے پتہ لگا بھلا؟"

"داتا صاحب نے جو بات کھول دی"۔ قدرت بولے "آپ نے کشف المحجوب نہیں پڑھی کیا؟"۔

"پڑھی ہے"۔

"پھر؟"

"ایک بار نہیں، چھ بار پڑھی ہے"۔

"پھر؟"

"کچھ پلے نہیں پڑا"۔

قدرت اللہ ہنس پڑے۔

"جو جانتے ہیں، وہ بتاتے نہیں۔ جو لکھتے ہیں وہ بیان نہیں کرتے۔ پہیلیاں بجھواتے ہیں۔ جو بیان کرتے ہیں وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ کہیں بات مجھ ایسے بے سمجھ کے پلے نہ پڑ جائے۔ بڑا NEPOTISM چلتا ہے وہاں۔ MONIPOLY بنا رکھی ہے اللہ کے بندوں نے"۔

"یہ تیرے پراسرار بندے"۔ قدرت نے ہنس کر کہا۔ "ان کا بھید کسی نے نہیں پایا"۔

"یہ اخیار، اوتاد کیا چیز ہیں؟ پہلی بار سنا ہے آج؟"

"معلوم ہوتا ہے یہ سیکرٹریٹ سے متعلق ہیں فیلڈ سے نہیں"۔

"تو کیا ان کا سیکرٹریٹ بھی ہے؟"

"ہوں! ہے"۔

"کیا وہ پاکستانی سیکرٹریٹ کی طرح چلتا ہے؟"

قدرت نے ہنس کر میری طرف دیکھا۔

"قرائن سے تو ایسا ہی لگتا ہے"۔ میں نے کہا "میری حج کی فائل چھ سال پڑی رہی۔ کسی نے دستخط نہ کیے۔ پہلے اس بات پر حیرت تھی کہ کوئی دستخط نہیں کرتا، اب اس بات پر حیرت ہے کہ دستخط ہو گئے"۔

"وہ کیوں؟"

سراسر FAVOURITISM ہوا ہے"۔

''کیا مطلب؟''

''میری طرف دیکھئے۔ کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ''!

حطیم:

''لیجئے'' قدرت نے کہا ''حطیم آ گیا۔'' انہوں نے ایک چار دیواری کی طرف اشارہ کیا۔

مطاف میں گویا وہ ایک ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تھی۔ چھوٹی سی چار دیواری جس کے اوپر کوئی چھت نہ تھی۔ اندر پچاس ساٹھ آدمیوں کے لیے نماز پڑھنے کے لیے جگہ بنی ہوئی تھی۔ دو تین صفیں بچھی ہوئی تھیں جن پر چار ایک آدمی کھڑے نفل پڑھ رہے تھے۔

قدرت اندر داخل ہو گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ قدرت پچھلی صف پر کھڑے ہو گئے اور نفل پڑھنے لگے۔ میں قدرت کے پیچھے دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے دو نفلوں کی نیت باندھی۔

ابھی میں نے سورۂ فاتحہ شروع ہی کی تھی کہ چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ اک شور سا بلند ہو گیا۔ اک عجیب سی بھنبھناہٹ جیسے بکرے بکرے جتنی بڑی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ پھر اس بھنبھناہٹ کے پس منظر میں آوازیں سنائی دیں۔ کوئی چیخ رہا تھا، کوئی چلا رہا تھا۔ کوئی گھور رہا تھا، کوئی ڈانٹ رہا تھا......

پہلے وہ آپس میں چہ میگوئیاں کرتے رہے۔ ارے یہ شخص۔ یہ یہاں! اتنی جسارت! باہر نکالو اسے، اٹھا کر پھینک دو، لاحول ولا قوۃ،...... پھر وہ سب گویا براہ راست مجھ سے مخاطب تھے: ''چل دوڑ یہاں سے، چل نکل، یہ تو کہاں آ گھسا ہے، شرم نہیں آتی تجھے، ذلیل، پلید کیڑا، تعفن سے بھرپور......تو ساری فضا کو متعفن کر رہا ہے''۔

بدبو:

دفعتاً مجھ سے گندگی کے بھبھاکے اٹھنے لگے۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ بھبھاکے میرے جسم کے بند بند سے اٹھ رہے تھے، جیسے میں بہ نفسِ نفیس گندگی کا ایک تودا تھا۔

"چل اٹھ، نکل یہاں سے دور ہو جا" ۔وہ سب چلانے لگے

ان آوازوں سے بچنے کے لیے میں سجدے میں گر پڑا۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ کسی نے دونوں طرف سے میرے شانے پکڑ لیے۔ میرا سر ہوا میں لٹکنے لگا۔ میں نے ہزار کوشش کی کہ سر زمین پر لگ جائے اور سجدے میں گر کر میں اللہ کے حضور دعا کروں، منت کروں، آہ و زاری کروں کہ یا اللہ میری غلاظت دور کر دے، مجھے اس قابل بنا دے کہ میں حطیم میں سجدہ کر سکوں۔

میں نے لاکھ کوشش کی لیکن میرا سر زمین تک نہ پہنچ سکا۔ پھر وہ سب قہقہہ مار کر ہنس رہے تھے، تمسخر بھری ہنسی۔

"جاؤ۔ جاؤ چلے جاؤ"۔

میں نے محسوس کیا جیسے میں پھانسی لگا ہوا ہوں۔ پھر مجھ پر ایک انجان خوف طاری ہو گیا اور میں اٹھ کر بھاگا۔

حطیم سے باہر نکلا تو حرم شریف دھندلایا ہوا تھا۔ چاروں طرف دھند پھیلی ہوئی تھی۔ بدبو کے بھبھاکے جو مجھ سے اٹھ رہے تھے دھند میں تبدیل ہوئے جا رہے تھے۔

میں سہم کر ایک کونے میں کھڑا ہو گیا اور پتہ نہیں وہاں کب تک کھڑا رہا۔

اپنا اپنا مقام:

آہستہ آہستہ وہ احساس تذلیل چھٹتا گیا۔ پھر غصے نے بڑھ کر مجھے بے بسی اور کسمپرسی کی کیفیت سے گھسیٹ کر باہر نکال لیا۔ میں کونے سے باہر نکل آیا۔ غصے سے میرے کانوں کی لویں سرخ ہو رہی تھیں۔

یہ کیا مذاق ہے۔ گھر بلا کر بے عزتی کرتے ہو۔ پہلے خواب دکھا کر میرے دل میں آرزو کا دیا جلایا، پھر مستوں کی زبان سے مجھے مژدہ سنایا۔ پھر اسباب پیدا کئے اور اب میں جب حاضر ہو گیا ہوں تو احساس گندگی دلا کر میری تذلیل کی جا رہی ہے۔ میں نے کب دعویٰ کیا تھا کہ میں پاک ہوں۔ میں نے کب دعویٰ کیا تھا کہ میں تیرے گھر میں قدم رکھنے کے لائق ہوں۔ پھر بھی میں تیرا بندہ ہوں، تیری تخلیق ہوں۔ غصے میں میں نے نگاہ اٹھا کر کوٹھے کی طرف دیکھا۔

منڈیر پر کوئی قہقہہ مار کر ہنسا۔ تجھے کس نے کہا تھا کہ خواص کی مسجد میں جا۔ تجھے کس نے کہا تھا کہ وہاں نفل پڑھ۔ تجھے کس نے کہا تھا کہ ان میں جا کھڑا ہو جن میں سے تو نہیں۔

منڈیر پر کوئی تالی بجا بجا کر ہنسے جا رہا تھا۔ "بیوقوف بیوقوف، اپنا مقام کا بھی پتہ نہیں"۔

ہر کسی کا اپنا اپنا مقام ہوتا ہے۔ ادھر آ، ادھر۔ میرے کوٹھے کے اردگرد پھیرے لے۔ یہی تیرا مقام، یہی تیری غایت ہے، یہی تیرا منتہا ہے۔

میں دیوانہ وار کوٹھے کی طرف بھاگا۔

انوکھی کرم نوازی:

جب میں طواف کر کے واپس آیا تو قدرت میرا انتظار کر رہے تھے۔

"کیا سنگ اسود کو بوسہ دینے کے لیے گئے تھے؟"

"نہیں تو"۔ میں نے جواب دیا۔ "میں نے کبھی سنگ اسود کو بوسہ دینے کی

کوشش نہیں کی۔"

"کوشش بھی نہیں کی؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں"۔

"کیوں؟"

"مجھے کبھی اس کا خیال ہی نہیں آیا۔ طواف کرتے ہوئے مجھے سب کچھ بھول جاتا ہے۔ سب کچھ، سنگ اسود، رمل، شوط، استلام، ملتزم، مقام محمود سب کچھ"۔

قدرت خاموش ہو گئے۔

سرفراز اپنی عقل و خرد کی تلوار چلا رہا تھا۔ وہ حرم شریف کے کبوتروں کی بات کر رہا تھا۔ اردگرد کے زائرین اس کی باتوں سے ان جانے میں اپنی سمت کھوئی کر رہے تھے۔

"آپ حطیم سے کیوں چلے آئے تھے؟" قدرت نے پوچھا۔

"میں تو نہیں آیا۔ انہوں نے مجھے اٹھا کر باہر پھینک دیا۔"

"کس نے پھینک دیا؟"

"انہوں نے جن کی وہ جائے عبادت ہے"۔

"لیکن کیوں؟"

انہوں نے کہا "تو نجس ہے" اور مجھے اپنے آپ سے گندگی کی بو آنے لگی۔ اب بھی آرہی ہے۔ سونگھ لو چاہے تم۔

"مجھے تو نہیں آتی"۔ قدرت نے کہا

"مجھے تو آرہی ہے"۔

"اچھا یہ تو بہت بڑا کرم ہو گیا آپ پر"۔ قدرت نے کہا

"کیا کہا مجھے ازسر نو غصہ آگیا"، "کرم یا ظلم"۔

''اونہوں، بہت بڑا کرم۔ ظلم نہیں''۔ قدرت بولے ''اپنے آپ سے بدبو آنا۔ اپنی گندگی کا احساس ہونا بہت بڑا کرم ہے۔ ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہمیں اپنے سے بو نہیں آتی۔ دوسروں سے آتی ہے۔ اگر آپ کو اپنے آپ سے بو آنے لگی ہے تو یہ حطیم کا کرم ہے''۔

قدرت کی بات سن کر غصے سے میرا منہ لال ہوگیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے قدرت حطیم والوں کے ایجنٹ ہوں۔

میں نے غصے سے منہ موڑلیا۔ ''میں یہاں ایجنٹوں کی باتیں سننے نہیں آیا''۔ دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ کوٹھے کی منڈیر سے کوئی میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''سن رہے ہو اپنے ایجنٹ کی باتیں''۔ میں نے دہائی دی۔

''اونہوں، ہمارا نہیں۔ ان کا ہوگا جنہیں تم سے بو آتی ہے۔'' منڈیر سے آواز آئی۔ ''تمہیں خود اپنے سے بو آتی ہوگی۔ ہمیں تم سے بو نہیں آتی''۔

اللہ اکبر، میرے دل میں نعرہ گونجا ''اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر'' سارا حرم اذان کی آوازوں سے گونجنے لگا۔

حرم:

حرم شریف اللہ کا گھر ہے۔ جس طرح اللہ بے نیاز ہے اسی طرح حرم شریف کی فضا بھی بے نیاز ہے۔ وہاں کوئی پابندی نہیں، کوئی پوچھنے والا نہیں کہ میاں کیا کر رہے ہو۔ چاہے آپ کالے ہیں، گندمی ہیں، سانولے ہیں یا گورے، کوئی آپ کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ چاہے آپ یورپی ہیں، چینی ہیں یا امریکی، کوئی تجسس محسوس نہیں کرے گا، چاہے آپ شیعہ ہیں سنی ہیں یا وہابی، کچھ فرق نہیں پڑتا۔ جس طرح جی چاہے نماز پڑھیے۔ دونوں ہاتھ باندھ کر یا ایک ہاتھ باندھ کر یا دونوں ہاتھ کھلے چھوٹ کر۔ چاہے نماز کے وقت آپ الگ ہو کر بیٹھ جائیے، کوئی نہیں کہے گا

کہ آپ نماز میں شامل کیوں نہیں ہوئے۔

بے نیاز فقیر:

حرم شریف کا وہ فقیر مجھے آج تک نہیں بھولا جو سارا دن اور ساری رات حرم کے عین درمیان میں پاؤں پسار کر چادر میں لپٹا ہوا سویا رہتا تھا۔ نماز کا وقت ہوتا تو وہ آپ ہی آپ اٹھ کر بیٹھ جاتا لیکن نماز ادا کرنے کے بعد وہ پھر سے چادر تان کر پڑ جاتا...... اس کے پاس صرف چادر تھی۔ وہ چادر اس کا واحد ساز و سامان تھی۔ نماز پڑھنے سے پہلے اس نے کبھی وضو نہیں کیا تھا اور نماز پڑھنے کے بعد وہ اتنی بے نیازی سے پاؤں پھیلا کر لیٹ جاتا کہ بسا اوقات اس کے پاؤں خانہ خدا کی طرف ہو جاتے۔ لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھتے لیکن جلد ہی ان کی توجہ دوسری باتوں کی طرف منعطف ہو جاتی اور انہیں وہ فقیر بھول جاتا۔ کچھ لوگ تجسس کے مارے اس فقیر کے پاس بیٹھ جاتے تاکہ اس پر نظر رکھیں۔ لیکن کسی زائر میں اتنی جرأت نہ ہوتی تھی کہ اسے جگاتا۔ اس سے پوچھتا کہ میاں تم یہاں سونے کے لیے آئے ہو کیا۔ یا کم از کم اسے اتنا کہتا کہ تم نے اتنی جگہ کیوں گھیر رکھی ہے۔ اٹھ کے بیٹھو میاں۔

محافظین حرم نے کبھی اسے یہ نہیں کہا تھا کہ بابا! جا اپنے ڈیرے پر جا کر سو۔ کسی مولوی میں اتنی جرأت نہ ہوئی تھی کہ اسے سرزنش کرتا اور کہتا اپنی ٹانگیں خانہ خدا کی طرف مت کر۔

حرم شریف میں کسی مولانا میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ عورتوں کو منع کرتا کہ بیبیو! مردوں کے ساتھ طواف نہ کرو۔ مردوں کی بھیڑ میں داخل ہونے سے احتراز کرو۔ نامحرموں کے قریب مت بیٹھو۔

اسلام کو خطرہ:

حرم شریف میں اسلام خطرے میں نہ تھا۔ اسلام کے مخالفین یہ بھولے بیٹھے تھے کہ وہ اسلام کی حفاظت کے لیے دنیا پر اتارے گئے ہیں۔

حرم شریف میں مذہب کی قید نہ تھی، رسم کی قید نہ تھی، رواج کی قید نہ تھی گناہ اور ثواب کی قید نہ تھی۔

حرم شریف میں کوئی ناصح نہ تھا۔ کوئی مسلکوں کا اجارہ دار نہ تھا۔ کوئی ہمہ دان نہ تھا وہاں۔ کوئی منع کرنے والا نہ تھا۔ چاہے ناچ ناچ کر طواف کرو۔ چاہے سجدہ کرنے والے کے سامنے سے گزر جاؤ۔ چاہے نماز پڑھنے والے کے سامنے بت بن کر بیٹھ جاؤ۔

کسی عالم میں اتنی جرأت نہ تھی کہ ٹوکے، مین میخ نکالے۔ کسی مفتی میں ہمت نہ تھی کہ فتویٰ جاری کرے۔

حرم شریف میں کوئی بندش نہ تھی، کوئی تکلف نہ تھا، کوئی قاعدہ نہ تھا، کوئی گرائمر قاعدہ، نہ گناہ، نہ ثواب۔

زائرین میں کوئی آقا نہ تھا، کوئی غلام نہ تھا، کوئی بزرگ نہ تھا۔ کوئی عالم نہ تھا۔ امیر میں امارت کی بو نہ تھی۔ وہ بھول چکا تھا کہ اس کے پاس لاکھوں کا بنک بیلنس ہے نواب اپنی جاگیر کو بھولے بیٹھا تھا۔ افسر کو یاد نہ رہا تھا کہ وہ اپنے چپڑاسی کے پاس بیٹھا ہے۔ عورت کو یاد نہ تھا کہ وہ عورت ہے اور اس کے پاس بیٹھا ہوا مرد نامحرم ہے۔ ملا کو یہ یاد نہ تھ کہ وہ اسلام کا اجارہ دار ہے۔

یہ سب حرم شریف کا اعجاز تھا۔ نہیں حرم کا نہیں، اس کا اعجاز تھا جو اپنے بھدے بے ڈھنگے کوٹھے کی منڈیر سے اپنے بندوں کو جھانک رہا تھا۔ ان پر مسکراہٹیں پھینک رہا تھا۔ انہیں آنکھیں مار رہا تھا۔

اللہ اور بندے:

حرم شریف اس وقت صرف اللہ کا گھر نہیں تھا، وہ بندوں کا گھر بھی تھا۔ اللہ اور بندہ دونوں اکٹھے اس گھر میں مقیم تھے۔ خانہ خدا میں اللہ اور بندہ شانے سے شانے جوٹ کر بیٹھے ہوئے تھے۔

وہاں ایسے زائر بھی جو حرم شریف میں مقیم تھے۔ وہیں دن رات عبادت کرتے تھے اور جب نیند آتی تو وہیں سو جاتے تھے۔ ایسے زائرین بھی تھے جو دوپہر اور رات کا کھانا وہیں کھاتے تھے۔ کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں تھا کہ بندۂ خدا یہ کیا ڈائیننگ ہال ہے۔

مطاف میں خانۂ خدا کے عین زیر سایہ عربی معلم زائرین کو دھڑا دھڑ لوٹ رہے تھے۔ وہ زائرین کو طواف کرانے کا بھاؤ کر رہے تھے۔ اوراد کو مہنگے داموں فروخت کر رہے تھے۔ نیچے وہ اللہ کا نام بیچ رہے تھے۔ اوپر اللہ مسکرائے جا رہا تھا۔ میں حیرت سے بت بنا کھڑا تھا۔

میری دانست میں سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ کوئی اللہ کا نام بیچے۔ دین کی تجارت کرے۔ قرآن کریم کو اپنے ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرے۔ اسلام کو ذاتی وقار کے حصول کا ذریعہ بنائے۔ میری دانست میں کوئی بڑے سے بڑا گناہ اس قدر مذموم نہیں ہو سکتا۔ مگر وہ مسکرائے جا رہا تھا، میں حیرت سے بت بنا کھڑا تھا۔

میزاب رحمت:

اسی مطاف کے ایک کونے میں وہ بڈھا کھڑا تھا۔ وہ بڈھا صبح و شام وہیں میزاب رحمت کے سامنے کھڑا رہتا تھا۔

میزاب رحمت خانہ خدا کی چھت سے نکلا ہوا ایک پرنالہ ہے۔ جب بارش ہو

رہی ہو اور رحمت کا یہ پرنالہ چل رہا ہو تو جو شخص میزاب رحمت سے گرتے ہوئے دھارے تلے کھڑا ہو گا وہ رحمت خداوندی میں شرابور ہو جائے گا۔ لیکن عام طور سے یہ مشہور ہے کہ جو میزاب سے گرتے ہوئے دھارے تلے کھڑا ہو گا اس پر بہشت کے دروازے کھل جائیں گے۔

وہ بوڑھا ایک نظر میزاب رحمت پر ڈالتا اور دوسری نظر آسمان پر۔ اس کی نگاہیں پرنالے اور آسمان کا یوں طواف کرتی رہتیں جیسے گھڑی کا پنڈولم ہوں۔ اسے نہ طواف کی پروا نہ تھی نہ نماز کی۔ صرف ایک لگن تھی کہ آسمان سے پانی برسے، پرنالے سے دھارا گرے اور وہ اس کے نیچے کھڑا ہو کر بھیگے اور یوں اس پر جنت کے دروازے کھل جائیں۔ وہ بڈھا جنت کا طلبگار تھا۔ دودھ کی نہروں، حوروں اور غلمان کا طالب تھا۔

اس بوڑھے کو دیکھ کر میری ہنسی نکل جاتی تھی۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا جیسے کوئی دودھ کے مٹکے پر بیٹھا چھاچھ کے خواب دیکھنے میں مصروف ہو۔

حرم شریف میں نہ جانے کتنے افراد ایسے تھے جو دودھ کے مٹکے پر بیٹھے چھاچھ کی آرزو کی دیوانے ہو رہے تھے۔ کوئی وہاں پچھلے گناہ دھلوانے آیا تھا جیسے خانہ خدا ڈرائی کلیننگ کی فیکٹری ہو۔ کوئی ثواب کمانے آیا تھا جیسے خانہ خدا سٹہ بازی کا مرکز ہو۔ کوئی حور و غلمان کا بھوکا بہشت کا ٹکٹ کٹوانے آیا تھا جیسے خانہ خدا بکنگ آفس ہو۔

کیا یہاں بیٹھے ہوئے لوگ زائر ہیں سوداگر؟

میرا قہقہہ چاروں طرف گونجا۔

کوٹھے سے کسی نے میری طرف نیچے جھانکا۔

"پانی کیوں نہیں برساتے"۔ میں نے چلا کر کہا۔ "دیکھتے نہیں یہ بڈھا کب

سے تیرے پرنالے کے نیچے کھڑا ہے۔اس کی نگاہیں پنڈولم کی طرح چل چل کر دھندلا گئی ہیں۔اس کی گردن متورم ہوگئی ہے۔اس طالب کی آرزو پوری کیوں نہیں کرتے"۔

زائر۔سوداگر:

"یہ اتنے سارے سوداگر جو زائر کا بھیس بدلے تیرے کوٹھے کے اردگرد بیٹھے ہیں،ان کے مطالبات پورے کیوں نہیں کرتے"۔

میرا قہقہہ حرم میں گونجا۔

"بتا ان میں کتنے لوگ ہیں جو تیری ذات کی خاطر یہاں آئے ہیں؟"

"کیا اتنی بھیڑ میں تو اکیلا ہے؟"

"کیا کسی کا دھیان تیری طرف بھی ہے؟ مانا کہ سب تیرے نام کی مالا جپ رہے ہیں۔نام...... تیری نہیں"۔

"تیری نہیں۔تیری کتاب کی پوجا کر رہے ہیں"۔

اس نے اپنی ٹھوڑی منڈیر پر رکھی ہوئی تھی اور وہ ٹکر ٹکر میری طرف دیکھ رہا تھا۔میں نے محسوس کیا جیسے اس کی آنکھیں پرنم ہوں۔

عین اس وقت کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔میں نے مڑ کر دیکھا، میرے پیچھے نظم ونسق کا متوالا سرفراز کھڑا تھا۔

"آپ تو پڑھے لکھے آدمی نظر آتے ہیں" وہ بولا۔"آپ تو توہم پرست نہیں۔پھر آپ اس بوڑھے کے پاس کھڑے کیا کر رہے ہیں۔یہ بوڑھا تو توہم پرسی کی وجہ سے دیوانہ ہوگیا ہے۔اس سے کوئی پوچھے بڑے میاں کیا اس پرنالے کے پانی میں بہشت بہہ کر چلا آئے گا۔کہاں خلد بریں کہاں اس پرنالے کا پانی۔ بہشت حاصل کرنا ہے تو اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔اپنے اعمال کو منظم کرو،

اپنے کردار کو سنوارو۔ حد ہو گئی توہم پرستی کی"۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔

سرفراز مجھے وہاں سے گھسیٹ کر دور برآمدے میں لے گیا تھا۔ وہاں دیر تک وہ مجھے مسلمانوں کی توہم پرستی پر لیکچر پلاتا رہا۔

میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ اللہ کے کوٹھے سے دور جا کر بیٹھ جاؤں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کوٹھے کے والی سے باتیں کروں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس کی آنکھ سے گرتے ہوئے آنسو اٹھا کر اپنے جسم پر مل لوں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں سرفراز کو بتاؤں کہ وہ خود کوٹھے کی منڈیر سے جھانک رہا ہے۔ لیکن یہ سب باتیں میں اسے کیسے بتاتا۔

توہم پرستی:

سرفراز تو مجھے پڑھا لکھا آدمی سمجھ رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا، میں عقل و ادراک کا مالک ہوں توہم پرست نہیں۔ پھر اسے کیسے بتاتا اسی لیے میں چپ چاپ بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔

دفعتاً وہ جلال میں آ گیا۔

یہ توہم پرستی اسلام کے منافی ہے۔ یہ توہم پرستی اسلام کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا ہے۔ یہ توہم پرستی ہمارے لیے باعث ننگ ہے۔"

عین اس وقت ایک شور اٹھا۔ ایک گرج حرم شریف کی مرمریں دیواروں سے آ کر ٹکرائی اور پھر چاروں طرف گونجی۔

ہم دونوں نے ڈر کر خانہ خدا کی طرف دیکھا۔ حرم پر ایک بدلی چھا چکی تھی۔ خانہ خدا پر بڑی بڑی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ میزاب رحمت سے پانی کی ایک چھوٹی سی دھار گر رہی تھی۔ اور وہ بوڑھا اس دھار کے نیچے کھڑا اللہ اکبر اللہ اکبر کے نعرے لگا رہا تھا۔

یہ دیکھ کر سرفراز کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس کی پتلیاں پھیل گئیں، مٹھیاں بھینچ گئیں جیسے اس پر ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا ہو۔

وہ دیوانہ وار اٹھا اور پھر غصے میں بھرا ہوا خانہ خدا کی طرف یوں بھاگا جیسے وہ اس بڈھے کی ہڈیاں توڑ دے گا۔

میں ڈر گیا "رک جاؤ، ٹھہرو ٹھہرو سرفراز"۔ میں اس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔

میزاب رحمت کے قریب پہنچ کر سرفراز نے بڈھے کو زور سے دھکا دیا اور پھر ......اس دھار کے نیچے کھڑا ہو گیا۔

خوشی سے وہ دیوانہ وار نعرے لگانے لگا، آیتیں پڑھنے لگا، چھینٹے اڑانے لگا۔

تاجر ہی تاجر:

اس کے قریب پہنچ کر میں رک گیا اور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوا اور جوش میں چلانے لگا: "آجاؤ آجاؤ۔ یہ لمحہ پھر نصیب نہیں ہوگا۔......آجاؤ۔"

پھر چاروں طرف سے لوگوں نے میزاب رحمت پر یورش کر دی۔ وہ سب چیخ رہے تھے چلا رہے تھے۔ آیات کے نعرے لگا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو یوں دھکے دے رہے تھے جیسے ہولی کھیل رہے ہوں۔

کوٹھے کی چھت پر کوٹھے کا والی مسکرا رہا تھا۔ میزاب رحمت کی رنگ پچکاری سے بہشت کے گاہکوں کو بھگو رہا تھا۔ ان کی دھکم پیل کو دیکھ کر تالیاں بجا رہا تھا، قہقہے لگا رہا تھا......لیکن

کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔

کوئی اس کا طالب نہ تھا۔

کسی کو اس کی موجودگی کا احساس نہ تھا۔

وہ سب بہشت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے۔

ان کی نگاہوں تلے حوریں تھیں، دودھ کی نہریں تھیں، بغیچے تھے۔ پھلوں سے بھری ہوئی طشتریاں تھیں۔

بے شک ان کے ہونٹوں پر اللہ کا نام تھا، لیکن وہ سب اس نام کو استعمال کر رہے تھے..... اپنے آرام و آسائش کے حصول کے لیے استعمال کر رہے تھے۔

اس وقت ان میں کوئی زائر نہیں تھا۔ تاجر ہی تاجر، تاجر ہی تاجر۔

زائرین اور حج

توحید پرست اور بت پرست:

قدرت نے کہا "کل حج کے لیے روانگی ہوگی ہمیں قبل از ظہر مکہ سے نکل جانا چاہیے۔"

یہ سن کر میرا دل بیٹھ گیا۔

میں نے کوٹھے کی طرف دیکھا۔ کوٹھا ویران دکھائی دے رہا تھا۔ دیواریں ننگی تھیں۔ غلاف کے کونوں میں رسیاں باندھ کر اوپر اٹھا دیا گیا تھا۔ دیواروں پر لگے ہوئے بڑے بڑے نیم کندہ سلیٹی پتھر دور سے نظر آرہے تھے۔

کہتے تھے غلاف کے پلو اس لیے اٹھا دیئے گئے ہیں کہ خانہ کعبہ کو غسل دیا جائے گا۔ شاہ سعود خود اپنے ہاتھ سے غسل دیں گے اور پھر نیا غلاف لگایا جائے گا۔

کوٹھے کی منڈیریں خالی تھیں۔ ان سے کوئی جھانک نہیں رہا تھا۔ کوئی ان کی اوٹ میں چھپا ہوا نہ تھا۔ اک بے نام افسردگی اور ویرانی طاری تھی۔ پھر بھی میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ کوٹھے کو چھوڑ کر حج کے لیے جاؤں۔

"آپ معلم سے آج ہی مل لیں" قدرت نے کہا۔

میں قدرت کی طرف دیکھا۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ معمول سے زیادہ خوش ہوں۔

قدرت اس لیے خوش تھے کہ وہ اللہ کا حکم بجالانے کے لیے حج پر جا رہے تھے۔ میں بے حد ناخوش تھا، اس لیے کہ میں خانۂ خدا سے دور جا رہا تھا۔ میرے نزدیک خانہ خدا کے قرب سے بڑھ کر کوئی عشرت نہ تھی۔

قدرت توحید پرست تھے۔

میں بت پرست تھا۔

اس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ اس توحید پرست کو اٹھا کر حرم سے باہر پھینک دوں۔ ''آپ ابھی اپنے معلم سے جا کر ملیے''۔ قدرت بولے ''ان کاغذات پر مہریں لگوا لیجیے ورنہ ہمیں راستے میں دقت پیش آئے گی''۔

اس وقت تک معلم میرے لیے صرف ایک نام تھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ وہ کون ہے اس کا ڈیرا کہاں ہے۔

''معلم کہاں ملے گا'' میں نے پوچھا۔

''کیا پتہ؟ تلاش کیجیے''۔

''لیکن کہاں؟''

''یہیں مکے میں۔ وہ پاکستانی زائرین کے معلم ہیں۔ کسی سے ان کا ڈیرا پوچھ لیجیے، پتہ چل جائے گا۔

میں سیدھا پاکستانی ہوٹل میں چلا گیا۔ ہوٹل کے لڑکے نے کہا: ''بالکل آسان راستہ ہے۔ بائیں ہاتھ کی گلی میں جاؤ۔ پھر دائیں ہاتھ مڑ جاؤ، پھر دو گلیاں چھوڑو، پھر دائیں ہاتھ گھومو پھر دس قدم چلو اور بائیں ہاتھ گھومو، پھر تین گلیاں چھوڑو اور بائیں ہاتھ گھومو۔ بس سامنے ان کا ڈیرہ ہے سمجھے؟''

کوئی مجھے پتہ سمجھائے اور اتنی محنت اور محبت سے سمجھائے جیسے ہوٹل کے اس لڑکے نے سمجھایا تھا، تو مجھ میں اتنی جرأت نہیں پڑتی کہ اسے کہوں میں نہیں سمجھا۔ لہذا میں نے بڑی شکرگزاری سے سر ہلا دیا جیسے بالکل سمجھ گیا تھا۔

اس روز میں مکے کی تنگ اور پیچدار گلیوں میں گھنٹوں آوارہ گھومتا رہا۔ دو ایک راہگیروں سے راستہ پوچھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے جواب میں قرآن کریم کی آیت پڑھ دی۔ کوئی قرآن کریم کی آیت پڑھ دے تو میں لاجواب ہو جاتا کرتا

اہوں۔ یہ میری پرانی کمزوری ہے۔

گلیوں کے مکانات میں جگہ جگہ دہلیزوں پر، ڈیوڑھیوں میں، زینے کی سیڑھیوں پر، صحنوں میں، برآمدوں میں، ہر جگہ لوگ یوں پڑے تھے جس طرح کسی پرانے کارخانے کے عقبی صحن میں کاٹھ کباڑ بکھرا ہوتا ہے۔

کچھ لوگ مست کیفیت میں پڑے تھے۔ ذہن کے پٹ بند کیئے۔ سپردگی اور احوالگی کے جذبے سے سرشار۔

زیادہ تر لوگوں کی آنکھوں میں چمک تھی۔ ذہن کے دیئے جل رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ سوچوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کھڑکیاں کھول رکھی ہیں۔

کھڑکیاں اور دریچے :

سوچیں کھڑکیاں ہوتی ہیں۔ یہ کھڑکیاں حال سے باہر کھلتی ہیں۔ وہ لوگ جو حال سے مطمئن نہیں ہوتے وہ حال کی تلخیوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے ماضی کی کھڑکیاں یا مستقبل کے دریچے کھول لیتے ہیں۔

کھڑکیاں بھی رنگ رنگ کی ہوتی ہیں۔

کھڑکی کھولنے کے انداز بھی رنگ رنگ کے ہوتے ہیں۔ پوری نظم تو مجھے یاد نہیں۔ نہ جانے کس شاعر نے یہ کیفیت یوں بیان کی ہے کہ برسات کا موسم ہے، بادل چھائے ہوئے ہیں بوندیں پڑ رہی ہیں، کتنا دل فریب موسم ہے لیکن......

میں وہ ماضی پرست ہوں کہ مجھے
یاد آتی ہیں پچھلی برساتیں

جب میں معلم کے ڈیرے پر پہنچا تو یہ کھڑکیاں اور دریچے واضح طور پر میرے سامنے آ گئے۔ حسرتوں کی کھڑکیاں شکایات کی کھڑکیاں، دکھ سکھ کی کھڑکیاں، یادوں کے طاقچے، خوف و خدشات کی کھڑکیاں، وہم و گمان کی

کھڑکیاں، طمع کی کھڑکیاں، حرص کی کھڑکیاں، جانے کیسی کیسی کھڑکیاں۔

یہ کھڑکیاں مکے سے باہر کھلتی تھی۔ سرزمین اعجاز سے باہر کھلتی تھیں۔ زائرین ان کھڑکیوں سے باہر دیکھنے میں شدت سے مصروف تھے۔

ایسے زائر بھی تھے جو مکہ میں قیام کا حظ اٹھانے کی بجائے اس فکر میں گھلے جا رہے تھے کہ مکہ سے وداع ہونے کا دن آ پہنچا تھا۔ ایسے زائر بھی تھے جو مکہ میں جینے کی لذت کو بھول کر یہ دعائیں مانگ رہے تھے کہ یا اللہ ہماری موت اسی پاک سر زمین پر واقع ہو۔ یا اللہ اسی مٹی میں دفن ہونے کی سعادت نصیب کر۔

پالتو شکایات:

شکایات کی کھڑکیوں کا کوئی شمار نہ تھا۔

کئی لوگوں کو مہنگائی کی شکایت تھی۔ انہیں یہ فکر دامن گیر تھی کہ اگر سارے پیسے ختم ہو گئے تو واپسی پر عزیز و اقرباء کے لیے تسبیحیں اور آب زم زم کی کپیاں کیسے لے جا سکیں گے۔

کئی لوگوں نے یہ فکر پال رکھا تھا کہ کھانا اچھا نہیں ملتا۔ اور چونکہ کھانا اچھا نہیں مل رہا لہذا صحت خراب ہوئی جا رہی ہے۔ وہ خرابی صحت کے انڈے کو سینچ رہے تھے۔ اچھی صحت کا دارومدار اس بات پر نہیں ہوتا کہ صحت اچھی ہو بلکہ اس بات پر کہ اچھی صحت ہونے کی فکر دامن گیر نہ ہو۔ وہاں میں نے تندرست پہلوان دیکھے جنھیں خرابی صحت کی فکر کا گھن لگا ہوا تھا۔

پتہ نہیں زائرین نے شکایات کی کھڑکیاں کیوں کھول رکھی تھیں۔ پتہ نہیں انہیں اس بات کا شعور تھا یا نہیں کہ شکایتیں پالنا کھڑکیاں کھولنے کے مترادف ہے اور ہر کھڑکی حال سے غیر حاضری کا پتہ دیتی ہے۔ وہ زائر جو دعائیں مانگ مانگ کر سر زمین حجاز میں پہنچے تھے، اب انجانے میں کھڑکیاں کھول کر باہر...... دور، نہ جانے

کدھر دیکھ رہے تھے۔

معلم کے ڈیرے پر مجھے وقار صاحب مل گئے۔وقار صاحب میرے پرانے جاننے والے ہیں۔وہ ایک معزز باوقار آدمی ہیں۔پہلے تو انہوں نے مکہ میری موجودگی پر حیرت کا اظہار کیا جیسے میرا وہاں ہونا نا قابل قبول بات ہو۔میں نے سرسری طور پر پوچھا کیسے گزر رہی ہے؟اس پر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک طرف لے گئے۔پھر وہ گویا پھوٹ بہے۔

بند کمرا:

کہنے لگے مفتی صاحب کیا بتائیں۔ان کم بختوں نے تو مہاراج ہی فسخ کر دیا ہے۔ہمیں کیا پتہ تھا کہ ہمارے پہلو میں غلاظت کا انبار لگا دیا جائے گا۔اور ہمارے لیے اس پاکیزہ فضا کو متعفن کر دیا جائے گا۔کسی سے کیا گلہ مفتی صاحب اپنے اپنے نصیب ہیں۔

وقار صاحب نے جو کھڑکی کھولی رکھی تھی اس کی نوعیت انوکھی تھی۔پتہ نہیں انہیں مکہ معظمہ میں ایسی پر لذت اور پر اسرار کھڑکی کھولنے کا خیال کیسے آیا تھا۔

جس جگہ وقار اور ان کی بیگم مقیم تھے،اس سے ملحقہ ایک کوٹھڑی تھی۔یہ کوٹھڑی ان کے معلم کے عمل دخل سے باہر تھی۔اس کوٹھڑی میں ادھیڑ عمر کی ایک پاکستانی زائرہ مقیم تھیں،جس سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔یہاں تک تو بات ٹھیک تھی۔پھر ایک روز ایک اجنبی اس زائرہ سے ملنے کے لیے آیا۔یہ تفصیل میاں بیوی دونوں کے لیے نا قابل قبول تھی ایک نامحرم کریوں کمرے میں ملا جائے اور پھر کمرے کا دروازہ اتنی دیر تک بند رہے! بیگم وقار اس روز سارا دن ”ہئے یہ کیا ہوگا“ کا ورد کرتی رہیں۔”میں پوچھتی ہوں یہ کمرہ اتنی دیر سے کیوں بند ہے،آخر کیوں؟“

اس کے بعد میاں بیوی دونوں کے احساس شرافت پر ایک اور ظلم ڈھایا گیا۔

وہ نامحرم مرد اپنا سامان لے کر آ گیا اور باقاعدہ طور پر اس کوٹھڑی میں خاتون کے ساتھ مقیم ہو گیا۔

یہ انتہا تھی۔ میاں بیوی دونوں کو سخت صدمہ ہوا۔ بیگم میں شوق تجسس جاگا اور اس شدت سے جاگا کہ وہ نیم پاگل ہو کر رہ گئیں۔

دن کے وقت وہ دونوں کوٹھڑی پر نگاہ رکھتے۔ بیگم کے کان کھڑے رہتے، دروازہ کھلنے اور بند ہونے کا حساب رکھتیں۔

پھر جب رات پڑتی تو بیگم دروازہ کی درزوں سے کوٹھڑی میں جھانکتیں اور میاں کے لیے رنگ کمنٹری نشر کرتی رہتیں۔ یوں ان کے دن رات اس کوٹھڑی سے اس قدر بھر گئے کہ کسی اور چیز کی گنجائش نہ رہی۔

وقار صاحب دیر تک اپنی بدقسمتی کی داستان مجھے سناتے رہے اور چھوٹی چھوٹی تفصیلات کی جگالی کرتے رہے تاکہ اس المیے کی اہمیت مجھ پر واضح ہو۔

ان کے جوش و خروش اور شدت جذبات کو دیکھ کر مجھ میں جرأت نہ ہوئی کہ کھل کر کہوں ''وقار صاحب آپ اس کھڑکی کو بند کیوں نہیں کر دیتے''۔

صرف ایک بار میں نے سرسری کوشش کی۔ صرف ایک بار میں نے کہا: ''وقار صاحب! انہیں بند کوٹھڑی میں جینے دیجئے۔ آپ حرم کے کوٹھے کی موج لیجئے۔ اس کوٹھڑی پر خانہ کعبہ کو کیوں قربان کر رہے ہیں آپ؟''

کردہ اور نا کردہ گناہ:

میری بات سن کر وقار صاحب یوں چور چور ہو گئے جیسے کانچ کے گلاس پر ضرب پڑی ہو۔ ان کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ ''آپ سمجھتے کیوں نہیں مفتی صاحب'' وہ بولے ''ہم اتنے بڑے المیے سے گزر رہے ہیں۔ مکہ شریف میں آ کر ہم پر اتنا بڑا حادثہ گزر گیا ہے جس کی وجہ سے ہمارا یہ سفر پاک داغ دار ہو گیا ہے اور آپ کہتے

ہیں کہ اس المناک واقعے سے بے نیاز ہو جائیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

میرا جی چاہا کہ دوڑ کر حرم شریف پہنچوں اور کوٹھے کے والی سے پوچھوں ''بتا یہ کیا بھید ہے۔ غلاظت اور گناہ تو رکاوٹیں ہوئیں لیکن یہ کیا اندھیر ہے کہ طبعی شرافت، نیکی اور صفائی عظیم تر رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ گناہ کی نسبت احساس گناہ عظیم تر دیوار بن جاتی ہے۔ کردہ گناہ کی نسبت نا کردہ گناہ راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔'' کوٹھڑی کے مکینوں کی غلاظت شیادان کی اپنی راہ کی ٹھوکر نہیں بنتی بلکہ معصوم پڑوسیوں کی منزل کھوٹی کر دیتی ہے۔ بتا یہ کیا بھید ہے۔ بتا یہ کیا بھید ہے۔ یہ بھید کیوں ہے۔ کیوں تیرے نیک اور معصوم بندوں کو حالات نے الجھاؤ میں ڈال رکھا ہے؟''

شک وشبہات:

پھر کسی نے میرا بازو تھام لیا۔ وہ ایک عمر رسیدہ باتونی آدمی تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی پراسرار چمک تھی۔ آواز میں دبدبہ تھا، انداز خبردار قسم کا تھا۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور انگلی ہلا ہلا کر مجھے سرزنش کرنے لگا۔ ''میاں'' وہ بولا ''خبردار رہنا۔ یہاں کے لوگوں سے خبردار رہنا۔ ان کی باتوں میں نہ آنا ورنہ پچھتاؤ گے جس طرح میں پچھتا رہا ہوں۔ یہ لوگ دکاندار ہیں حج ان کے لیے مقدس فریضہ نہیں بلکہ کاروبار ہے کاروبار''۔

''ان کے نزدیک قول کی کوئی اہمیت نہیں۔ جب وقت آتا ہے تو بدل جاتے ہیں۔ ہمارے ساتھ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ ایک بار نہیں بار بار۔ جدہ سے یہاں آنے کے لیے انہوں نے ہم سے ۴۰ ریال طے کئے تھے۔ پھر جب ہم نے اپنا سارا سامان موٹر پر رکھ دیا تو ڈرائیور بولا ''۶۰ ریال لوں گا۔ منظور ہے تو چلو، نہیں تو اپنا سامان اتار لو۔'' اس پر ہم ہکا بکا رہ گئے۔ ہم نے کہا ''میاں تو اپنی زبان سے پھر رہا

ہے۔ تو نے ہم سے سودا کیا تھا، بات پکی تھی''...... وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ بولا ''ساٹھ ریال ہوں گے، نہیں تو سامان اتار لو''۔

''اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ہم سڑک کے کنارے سامان اتار کر اسے رکھیں گے کہاں۔ کون اس کی رکھوالی کرے گا۔ کون دوسری موٹر تلاش کرے گا۔ وہ ہماری بے بسی کا فائدہ اٹھا رہا تھا میاں''۔

''یہاں کے لوگوں کا اعتبار نہ کرنا میاں ورنہ تمہارا بھی یہی حشر ہوگا۔'' بڑے میاں پھر انگلی ہلا ہلا کر مجھے خبردار کرنے لگے۔

''پھر طواف کرنے کے لیے اس نے ہم سے دو ریال فی کس طے کئے تھے لیکن طواف کے بعد دگنا کر کے تین ریال فی کس وصول کئے۔ زبردستی۔''

''کیا کیا بتاؤں میاں! قدم قدم پر ہم سے یہی ہوا، قدم قدم پر۔ اور اب ہمارا یہ فرض ہے کہ ہر شخص کو خبردار کریں کہ ان لوگوں پر اعتماد نہ کریں۔''

بڑے میاں ہر آتے جاتے کو خبردار کرتے تھے۔ انہوں نے شک وشبہات اور اپنی مظلومیت کی کھڑکیاں کھول رکھی تھیں۔

نمناک حیرت:

میں خود دریچے کھولنے کے فن میں بڑا ماہر ہوں۔ میری ساری زندگی دریچے کھولنے میں گزری ہے۔ دریچے کھولنے کی صلاحیت ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جو حفظ ماتقدم کی ضمانت دیتی ہے۔

مجھے اس بات پر حیرت نہیں ہو رہی تھی کہ لوگ کیوں دریچے کھولے بیٹھے ہیں۔ کیوں باہر جھانکنے کے جواز پیدا کر رہے ہیں۔ مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ خانہ خدا میں بیٹھ کر باہر جھانکنے کے بہانے کس ضرورت کے تحت بنائے جا رہے تھے۔ یہ فرار کس تلخی، کس ناخوشگواری سے بچنے کے لیے ہے؟ کیوں؟ خانہ خدا

سے فرار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

زائرین کا جذبہ عظیم تھا۔ ان کی محبت، ان کا احترام، ان کی عبادت تقدیس سے بھرے ہوئے تھے۔ خانہ خدا میں حاضری دینے پر ان کے دل مسرت اور تشکر کے جذبات سے لبریز تھے۔ انہیں اپنی خوش قسمتی پر ناز تھا کہ حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس میں کوئی دھاوا نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ بڑے اہتمام سے دریچے کھولنے میں مصروف تھے۔ بڑے شوق سے ان دریچوں سے باہر دیکھ رہے تھے۔ بڑے انہماک سے حضوری کی نفی کرنے میں کوشاں تھے کیوں؟

میری حیرت نمناک تھی۔

باتھ اور سلیم کی ماں:

ایک صاحب کہہ رہے تھے۔ "میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں۔ یہ تنگ جگہ، یہ خستہ حال کمرہ، یہ غلیظ ماحول، یہ بدمزہ کھانا، مجھے یہ سب گوارا ہے، خوشی سے گوارا ہے۔ خدا شاہد ہے میں شاکی نہیں۔ لیکن مجھے صرف ایک نیٹ اینڈ کلین باتھ روم چاہیے۔ عالی شان نہیں صرف صاف ستھرا اور میں نے اس کے لیے دگنا کرایہ ادا کیا تھا۔ مجھ سے وعدہ کیا گیا تھا۔ مجھے یقین دلایا گیا تھا کہ ایک الگ صاف ستھرا باتھ روم مہیا کیا جائے گا۔ لیکن ابھی تک وعدہ ایفا نہیں کیا گیا۔ بس یہی ایک خلش دل میں کانٹے کی طرح لگی رہتی ہے۔"

ایک صاحب کیفیت سے سرشار تھے۔ "سبحان اللہ سبحان اللہ! کیا مقام ہے، کیا عظمت ہے۔ بس ایک ہی افسوس لگا ہے کہ سلیم کی ماں اس سعادت سے محروم رہ گئیں۔"

"جب حرم میں حاضری دیتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ اگر سلیم کی ماں بھی موجود ہوتی تو......

جب زیارتوں پر جاتا ہوں تو دل میں کسک اٹھتی ہے اگر سلیم کی ماں بھی......

جب طواف کرتا ہوں یہ دکھ ہوتا ہے کہ اگر سلیم کی ماں بھی......"

سلیم کی ماں کی غیر حاضری کے دریچے نے ان کی اپنی حاضری کو جاں گسل بنا رکھا تھا۔

بیشتر زائر ایسے ہیں جو یہاں سے روانہ ہوتے وقت کھڑکیاں اور دریچے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔شاید اس ڈر کے مارے کہ یہاں پہنچ کر وہ انہیں مہیا نہ کر سکیں۔روانگی کے وقت ان دریچوں کی چوکھٹیں وہ اپنے سامان کے ساتھ لدواتے ہیں۔انہیں جگہ جگہ ساتھ لیے پھرتے ہیں اور ہر مقام پر پہنچنے کے بعد ان کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ انہیں فٹ کر لیں اور جب وہ جٹ ہو جاتے ہیں تو وہ مسلسل باہر دیکھنے میں محو ہو جاتے ہیں۔

صرف عام لوگوں کی بات نہیں، بڑے بڑے دانش ور بھی اپنے اپنے دریچے ساتھ لے جاتے ہیں حالانکہ دانش ور کو نئے اور تازہ دریچے ایجاد کرنے میں دیر نہیں لگتی۔

ابوالاثر اور بت:

حج سے واپسی پر از راہ اتفاق جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری سے ملاقات ہو گئی۔میں نے بڑے فخر سے کہا:"آپ کو پتہ نہیں میں حج کرنے گیا تھا۔"

ابوالاثر سرسری انداز میں بولے "ہاں اکثر لوگ جاتے ہیں"۔

میں نے کہا "جانا بڑی بات ہے"۔

ہنس کر جواب دیا۔"اہم بات یہ ہے کہ بخیر و عافیت لوٹ آؤ"۔

میں نے کہا "آپ بھی تو گئے تھے حج پر"۔

بولے "ہاں گیا تھا حج پر"۔

"پھر؟" میں نے بات بڑھائی۔

ہنس کر پنجابی میں کہنے لگے۔"وہاں کوئی حج نہیں مفتی جی"۔

حفیظ کی اس بات پر میں بہت حیران ہوا۔حفیظ میرے دیرینہ کرم فرما ہیں۔ وہ عظیم شاعر ہیں، مستند دانش ور ہیں۔ان کی شخصیت میں انفرادیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔میں نے انہیں کئی ایک حیثیتوں سے دیکھا ہے۔مداح کی حیثیت سے، ماتحت کی حیثیت سے، دوست کی حیثیت سے، ساتھی کی حیثیت سے۔اس لیے میں ان کے رائے کا احترام کرتا ہوں۔ان کے منہ سے"کوئی حج نہیں" سن کر میں بہت حیران ہوا۔

پھر بات کھل گئی۔حفیظ صاحب کی غیر مطبوعہ حج بیتی ہاتھ لگ گئی جس سے انکشاف ہوا کہ حفیظ صاحب جاتے ہوئے ایک بت ساتھ لے گئے تھے۔

اپنی ڈائری کے پہلے دو صفحات پر ابوالاثر لکھتے ہیں:

"مورخہ ۲۱ جنوری ۱۹۳۵ء

صبح پانچ بجے جاگا۔رات بھر سو نہ سکا تھا۔خیالات سے دماغ بھرا ہوا تھا۔ بستر بندھا رکھا تھا۔سامان تیار تھا۔بارہ بجے رات تک والد صاحب، بیوی بچیاں میرے پاس بیٹھی ہوئی تھیں، اس کے بعد میں نے ان سے کہا۔"جاؤ سو جاؤ کیوں کہ صبح تڑکے (حج پر روانہ ہونے کے لیے) اٹھنا پڑے گا"۔

وہ چلے گئے تو میں بھی لیٹ گیا۔نیند نہ آئی۔دل کی طرف خیال کیا تو ایک ذرہ برابر بھی تشویش نہیں تھی۔میں نے دل سے پوچھا:

"اے دل کیا تو اس مقدس سفر سے گھبراتا ہے؟"

دل نے کہا۔"نہیں"

میں نے سوال کیا "کیا تجھے اس بات کا خیال ہے کہ چونکہ میں نواب

صاحب بہادر پور کی معیت میں جا رہا ہوں اس لیے شاید خداوند تعالیٰ کی عبودیت کے اظہار کا حق کما حقہ ادا نہ ہو سکے گا۔"

دل نے جواب دیا: "تمہیں ساتھ لے چلنے کا جو احسان کیا ہے اس کی شکر گزاری کے سوا اور کسی قسم کی تعظیم نہ کی جائے گی جس سے روح کو کسی انسان کے سامنے جھکنے کی شرمساری ہو......"

ظاہر ہے کہ حفیظ نے یہ خود محسوس کر لیا تھا کہ وہ ایک بت کی معیت میں جا رہے ہیں۔ اگر چہ حفظ ماتقدم کے خیال سے انہوں نے شعوری طور پر اس کا اعتراف نہ کیا۔

ڈائری کے دوسرے صفحے پر بات کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ ملاحظہ ہو:

مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۳۵ء

......نواب صاحب کے پبلسٹی افسر نے مجھ سے کہا: کیا آپ رخصتی کے وقت کچھ پڑھیں گے؟ میں نے جواب دیا "مجھ کو اس کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی کہ ایسا ہو گا"۔

پھر مجھے خیال آیا کہ شاید وقت پر کوئی (نواب) مجھ سے کہہ بیٹھے اس لیے میں نے اسی وقت چند شعر جوڑے:

مدینے کو چلا ہے قافلہ ایمان والوں کا
رہِ حق میں سر تسلیم خم ہے شان والوں کا
ہوا ثابت کہ دونوں جہاں میں بیڑا پار ہے اس کا
کہ سر صادق محمد کارواں سالار ہے جس کا

مجھ میں اور حفیظ صاحب میں چنداں فرق نہ تھا۔

ہم دونوں ہی بت پرست تھے۔

میں نے خانہ خدا کو بت بنا کر اللہ کو اس کی اوٹ میں مقید کر رکھا تھا۔ حفیظ صاحب نواب صاحب کو بت بنا کر ساتھ لے گئے تھے۔ وہ جہاں بھی پہنچتے اپنے بت کو ایسی جگہ نصب کر دیتے کہ سب کچھ اس کی اوٹ میں آ جاتا۔

خارجی اور داخلی:

خارجی نگاہ سے دیکھا جائے تو حج ایک RITUAL ہے۔ ایک رسم ہے، ایک جمناسٹک، ایک قواعد

کعبہ کے گرد پھیرے لو، دو پہاڑیوں کے درمیان دوڑو۔ ظہر سے پہلے مکہ سے منیٰ پہنچو، وہاں ظہر اور مغرب کی نماز اکٹھی پڑھو، رات کا قیام کرو، اگلے دن غروب آفتاب سے پہلے عرفات پہنچو، وقوف کرو، غروب آفتاب کے بعد مغرب کی نماز پڑھے بغیر مزدلفہ جاؤ۔ وہاں مغرب اور عشاء اکٹھی پڑھو اور کنکر چنو، سورج چڑھنے سے پہلے منیٰ روانہ ہو جاؤ۔ وہاں تین دن شیطانوں کو کنکر مارو، پھر مکہ پہنچو، بال کٹواؤ، خانہ کعبہ کے پھیرے لو اور بس اللہ اللہ خیر صلا۔

حاجیوں کے حج قبول۔

تاریخ مکہ میں لکھا ہے رسول اللہؐ کے زمانے سے پہلے دور جہالت میں جو حج کا RITUAL ہوتا تھا اس کی تفصیلات تقریباً ایسی ہی ہوتی تھیں۔

مطلب یہ ہوا کہ حج کی خارجی شکل میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ داخلی پہلو کے لحاظ سے عظیم تبدیلی عمل میں آئی ہے۔ خارجی شکل پہلے بھی ایک جمناسٹک کی تھی، اب بھی ہے۔ اگر آپ ارکان حج کو پورا کریں اور باقی وقت مسلسل تاش یا شطرنج کھیلنے میں بسر کر دیں تو بھی آپ کا حج فسخ نہیں ہوگا۔

اگر آپ خارجی طور پر ارکان حج ادا کرتے رہیں اور ذہنی طور پر کارہائے دیگر کے خیالوں میں مصروف رہیں تو بھی آپ کا حج فسخ نہیں ہوگا۔

لیکن آپ داخلی پہلو کو اہمیت دیتے ہیں تو حج ایک کیفیت ہے، ایک جذبہ ہے، ایک سرشاری ہے اور ہر وہ چیز یا خیال یا احساس جو اس کیفیت میں مخل ہو، دریچہ ہے کھڑکی ہے، بت ہے۔

ممکن ہے ہم التزاماً دریچے اور کھڑکیاں کھولتے ہیں تاکہ کیفیت کی شدت دیوانگی کی شکل اختیار نہ کرلے۔ دریچے سے باہر اس لیے جھانکتے ہیں کہ دم لے کر آگے بڑھیں تاکہ سانس پھول نہ جائے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ان بتوں، کھڑکیوں اور دریچوں کی مدد سے شیطان ہمارا رستہ کاٹتا ہو جب کیفیت کی تپش اس حد تک بڑھ جائے کہ کندن بن جانے کا خطرہ لاحق ہو جائے تو وہ کٹھالی میں سوراخ پیدا کر دیتا ہو۔

ایک بر سبیل تذکرہ میں نے قدرت سے پوچھا "میں نے کہا حج کیا ہے؟ کیا وہ داخلی کیفیت ہے یا خارجی رسم"۔

"حج اللہ کا حکم ہے" وہ بولے۔

"وہ تو ہے۔ لیکن......"

"حکم میں لیکن نہیں ہوتے" قدرت نے کہا "ہر کلب کے اصول اور قانون ہوتے ہیں۔ اگر آپ کلب کے ممبر ہیں تو یہ قانون آپ پر عائد ہو جاتا ہے۔ کیوں اور کس لیے کی گنجائش نہیں رہتی۔"

قدرت کا بھی جواب نہیں۔ جب چاہیں دانشور بن کر کیوں اور کس لیے کی بات چھیڑ دیتے ہیں اور جب چاہیں مومن بن کر اللہ ہو اللہ ہو کرنے لگتے ہیں۔

میں نے کوٹھے کی طرف دیکھا۔ یا اللہ کیا یہ ابن الوقتی نہیں کہ جب شکوک سے کام چلتا ہے تو یہ ذہن کی جیپ پر سوار ہو جاتے ہیں، جب ایمان سے کام نکلتا ہے تو پیدل چلنے لگتے ہیں۔

کوٹھے پر میرے سوال کا جواب دینے کے لیے کوئی نہ تھا۔ خانۂ خدا ویران تھا۔

نورانی بڈھا:

پھر مجھے اس نورانی بڈھے کی آہ و بکا یاد آ گئی۔

یہ ۱۹۵۹ء کا ذکر ہے جب حکومت پاکستان نے حج پر کڑی پابندیاں لگا دی تھیں۔

ایک شام ایک سفید ریش بڈھا کراچی کے پریذیڈنٹ ہاؤس کے دروازے پر کھڑا دھاڑ دھاڑ کر رونے لگا۔ سیکورٹی پولیس کے سب لوگ دروازے پر اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے بڈھے کو ڈانٹا، اسے سمجھایا، اس کی منتیں کیں کہ وہ پریذیڈنٹ ہاؤس کے دروازے پر شوروغوغا برپا نہ کرے۔ جوں جوں پولیس والے اسے سمجھاتے توں توں اس کی چیخوں میں شدت بڑھتی جاتی۔ پھر پتہ نہیں کس طرح وہ سفید ریش نورانی بڈھا پولیس کے ہاتھوں سے نکل کر، دوڑ کر پریذیڈنٹ ہاؤس میں داخل ہو گیا اور بیرونی صحن میں جا پہنچا۔ پولیس والوں نے اسے پکڑ لیا۔ لیکن اس شکل و صورت میں اتنا تقدس تھا کہ پولیس کو ہمت نہ پڑی کہ گھسیٹ کر اسے باہر نکال دیں۔ سفید ریش نے پریذیڈنٹ ہاؤس کے صحن میں چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا۔

شوروغل سن کر صدر ایوب باہر نکل آئے۔

انہوں نے پوچھا "بڑے میاں آپ کیوں چیخ چلا رہے ہیں؟"

بڈھا ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا: "اللہ کے واسطے مجھے حج پر بھجوا دیجئے۔ اللہ کے واسطے"۔ بڈھے کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

صدر ایوب کے لیے اسلامی جذبہ دھیمی آنچ پر عقل اور دانش کے مرکب سے کشید کیا ہوا معطر اور شفاف عرق تھا۔

اس معزز اور نورانی سفید ریش کے رات جیسے کثیف جذبۂ حج کو دیکھ کر صدر ایوب حیران رہ گئے۔ انہیں بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

ایک رسم RITUAL کے لیے یہ معزز محترم بوڑھا حواس باختہ کیوں ہو رہا ہے۔ ان پر حیرت اس قدر غالب آ گئی کہ انہوں نے بوڑھے کو حج پر بھجوانے کے لیے خاص انتظامات کر دیئے۔

میں نے قدرت سے پوچھا: "آپ کو وہ نورانی سفید ریش بڈھا یاد ہے؟ کیا وہ اس لیے چیخیں مار مار کر حج کے لیے رو رہا تھا کہ اللہ کا حکم پورا کرے"۔

"ہاں یاد ہے"۔ قدرت نے جواب دیا۔

"کیا آپ کو ایڈووکیٹ صاحب کا حج یاد ہے؟" میں نے پوچھا۔

صدر ایوب:

ایڈووکیٹ صاحب کے حج کی تفصیلات انوکھی تھیں۔ ہوا یوں کہ ایڈووکیٹ کی ڈیوٹی لگ گئی کہ صدر ایوب کو خط لکھتے رہیں۔ کس نے ڈیوٹی لگائی؟ کیوں لگائی؟ اس کے متعلق مجھے علم نہیں۔

ایڈووکیٹ صاحب نے اپنے پہلے خط میں اپنی پوزیشن کی وضاحت کر دی۔

"میں آپ کو خط لکھنے پر مجبور ہوں۔ چونکہ آپ کو خط لکھنے کی ڈیوٹی مجھ پر عائد کر دی گئی ہے۔ یقین جانئے جس قدر میرے خط موصول کرنا آپ کو ناگوار گزرے گا، اسی قدر یہ امر میرے لیے ناگوار ہے کہ آپ کو خط لکھوں"۔

ایڈووکیٹ صاحب نے صدر ایوب کو سو سے کچھ زیادہ خطوط لکھے ہوں گے۔

الیکشن سے پہلے انہوں نے لکھا "یہ طرز عمل اختیار نہ کیجئے۔ کامیاب ہو جاؤ گے۔ لیکن بے عزتی ہو گی"۔

۱۹۶۵ء کے سیز فائر سے بہت پہلے انہیں خبردار کیا کہ سیز فائر نہ کیا جائے اور

اگر امر مجبوری ہو تو صرف چند گھنٹوں کے لیے۔

پھر تاشقند سے پہلے انہیں لکھا گیا کہ وہاں نہ جائیں امر مجبوری ہو تو نمائندہ بھیج دیں۔نہیں تو باعث تذلیل ہوگا۔لیکن صدر ایوب نے اس کے برعکس کیا۔

ہائی لیول کانفرنس:

پتہ نہیں کیوں ۱۹۶۶ء میں ایڈووکیٹ صاحب اسی ڈیوٹی کے سلسلے میں حج پر تشریف لے گئے۔وہاں سے انہوں نے صدر ایوب کو خط لکھا کہ یہاں مکہ معظمہ میں اللہ کے خاص بندوں کی ایک ہائی لیول کانفرنس ہوئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کی صدارت عام صدارت نہیں بلکہ عظیم ہے۔صدر ایوب کو صلاحیتیں دی گئی تھیں۔انہیں بہت سے موقعے دیئے گئے لیکن وہ ذات سے ابھر کر جہاد کرنے کی اہلیت پیدا نہ کر سکے،لہذا انہیں الگ کر دیا جائے۔

جب ایڈووکیٹ صاحب اس کانفرنس سے باہر نکلے تو کسی نے پکارا:"ایوب خان"۔انہوں نے مڑ کر دیکھا۔وہ ایک لحیم شحیم مجذوب تھا۔اس کے گلے میں سینکڑوں تعویز لٹک رہے تھے۔

ایڈووکیٹ صاحب نے کہا:"جناب میرا نام ایوب نہیں ہے"۔

وہ بولا"اسے کہہ دے بزدل نہ بنے جہاد کرے۔اور یہ لے،یہ اسے دے دینا کہنا یہ پہن لے۔"مست نے گلے سے ایک تعویز توڑ کر ایڈووکیٹ صاحب کو تھما دیا اور بولا۔"بزدلی چھوڑ کر جہاد کرے گا تو ایک موقع اور ملے گا۔اگر یہ آخر موقع بھی کھو دیا تو بڑی دھول اڑے گی۔بڑی تذلیل ہوگی۔بڑی جگ ہنسائی ہوگی۔جا اسے کہہ دے"۔

ایڈووکیٹ صاحب نے یہ سب تفصیلات صدر ایوب کو لکھ دیں۔صدر ایوب نے ناراض ہو کر ایڈووکیٹ صاحب کے پیچھے پولیس لگا دی۔ایڈووکیٹ صاحب کا

تو کچھ نہ بگڑا لیکن ایوب خاں کی صدارت کا تیر ضرور کمان سے نکل گیا۔

میں نے قدرت سے کہا ''آپ کو ایڈووکیٹ صاحب کے حج کی تفصیلات یاد ہیں۔''

''ہاں یاد ہیں'' وہ بولے۔

''کیا وہ حج کے لیے گئے تھے؟ کیا حج میں ہائی لیول کانفرنسیں ہوتی ہیں؟ بتائیے حج کیا ہے؟'' میں نے چلا کر قدرت سے پوچھا۔

اتفاق سے میر صاحب ادھر آ پہنچے اور انہوں نے میرا یہ جملہ سن لیا۔

''لو اور سنو، یہ چلاتے ہوئے پوچھ رہے ہیں حج کیا ہے۔ کس وقت پوچھ رہے ہیں! کس مقام پر پوچھ رہے ہیں! جب ڈرائیور سر پر کھڑا ہے''۔

میں نے مڑ کر دیکھا، ہمارا ڈرائیور پیچھے کھڑا کہہ رہا تھا۔ ''روانگی کا وقت ہو گیا ہے گاڑی لے آیا ہوں''۔

اور ہم حج کے لیے روانہ ہو گئے۔

منیٰ

ہزاروں بسیں اور موٹریں گھاؤں گھاؤں کر رہی تھیں۔ پہیے ساکت تھے، انجن غرا رہے تھے، چیخ رہے تھے، چلا رہے تھے۔ فضا پٹرول کی بو سے بوجھل ہو رہی تھی۔

زائرین کے دل دھڑک رہے تھے۔

جسم اور روح میں دھنکی بج رہی تھی۔ ہونٹوں پر لبیک لبیک کے نعرے تھے۔ سینوں میں جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا۔ دلوں پر ایک بے نام احساس چھایا ہوا تھا کہ ابھی ابھی یہاں کچھ ہونے والا ہے۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ کوئی عظیم واقعہ، پراسرار واقعہ جس کی تمنا میں انہوں نے سالہا سال بسر کیے تھے، جس کے لیے وہ سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے آئے تھے۔

اس وقت ہم آٹھ لاکھ زائرین حج کے لیے منیٰ جا رہے تھے۔

منیٰ مکہ معظمہ کا ایک مضاف ہے جو مکہ معظمہ سے صرف تین میل دور ہے۔ حج میں منیٰ کی اہمیت کی وجہ سے سعودی حکومت نے مکہ معظمہ سے منیٰ تک چار ایک ہفتہ اور فراخ سڑکیں بنا دی ہیں تاکہ حج کے دوران زائرین کی ٹریفک میں سہولت ہو جائے۔ یہ جدید سڑکیں گھوم پھر کر منی پہنچتی ہیں اور ایک دوسرے کے متوازی چلتی ہیں۔ ان کے ذریعے منیٰ پہنچنے کے لیے چھ میل کی مسافت طے کرنی پڑتی ہے۔

انوکھا سفر:

منیٰ کا سفر میرے لیے ایک انوکھا سفر تھا۔ چھ آٹھ لاکھ آدمی بیس پچیس ہزار بسوں میں سوار تھے۔ پچیس ہزار موٹر انجن غصے میں منہ سے جھاگ نکال رہے تھے، احتجاج کر رہے تھے، شور مچا رہے تھے۔ چلو چلو آگے بڑھو۔ لیکن پچیس ہزار بسیں

رکیں کھڑی تھیں۔ چلتی بھی تو چند ایک قدم چیونٹی کی رفتار سے آگے رینگتیں اور پھر رک جاتیں۔

کتنی عجیب، کتنی مضحکہ خیز بات تھی کہ تین میل کا سفر طے کرنے کے لیے زائرین موٹروں پر سوار تھے اور یہ موٹریں چیونٹی کی چال چل رہی تھیں۔ تین میل کی مسافت چار چھ گھنٹوں میں طے ہو رہی تھی۔ پھر رکے رہنے کی پریشانی الگ، انجنوں کا شوروغوغا الگ اور پٹرول کے بھبھاکے الگ۔

کتنی مضحکہ خیز بات تھی۔

بسوں میں بیٹھے ہوئے زائرین کا جذبہ شوق بڑھتا جا رہا تھا کہ جلد منزل کو جالیں۔ راستے کی رکاوٹیں انہیں مضمحل کر رہی تھیں۔ موٹروں کی رینگتی ہوئی رفتار ایک عجیب سی بے اطمینانی، تذبذب اور چڑ پیدا کر رہی تھی۔ اس ذہنی کتر پھتر کو جھٹلانے کے لیے وہ لبیک لبیک کے نعرے لگا رہے تھے۔ لیکن کوئی بھی حاضر نہ تھا۔ ان کے ذہن پہلے گیئر میں پھنسی ہوئی موٹروں کی طرح گھاؤں گھاؤں کر رہے تھے۔

صدیاں بیت گئیں لیکن منیٰ کی وہ سڑک ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

انجن چلا رہے تھے، زائرین چیخ رہے تھے۔ موٹروں سے پٹرول کی بو کے بھبھاکے اٹھ رہے تھے۔ زائرین سے ناآسودگی کی بھڑاس خارج ہو رہی تھی۔

الف لیلوی شہر:

الف لیلہ میں کئی ایک شہروں کا تذکرہ ملتا ہے جہاں صاف ستھری سڑکیں ہوتی ہیں۔ جن سے ادھر اُدھر کو گلیاں نکلتی ہیں، پختہ مکانات ہوتے ہیں۔ جو رہائش کے جملہ سازوسامان سے آراستہ ہوتے ہیں۔ لیکن سارے شہر میں کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔

منیٰ بھی ایک ایسا ہی الف لیلائی شہر ہے۔ وہاں سڑکیں ہیں، گلیاں ہیں، پختہ

مکانات ہیں، جہاں رہائشی سامان لگا ہے لیکن وہاں کوئی رہتا نہیں۔ سارا سال مکانات ویران پڑے رہتے ہیں۔ پھر آٹھ نو ذوالحجہ کو مقامی لوگ اور زائرین یورش کرتے ہیں۔…… چند گھنٹوں میں مکانات مکینوں سے بھر جاتے ہیں۔ کمرے جھاڑ پونچھ کر صاف کیے جاتے ہیں۔ گاؤ تکیے لگ جاتے ہیں، مطبخوں میں دیگیں چڑھا دی جاتی ہیں، لنگر چلتے ہیں، خالی دکانیں سامان سے لد جاتی ہیں اور بازار میں کھوے سے کھوا چھلنے لگتا ہے۔ یہ تو شہر کے اس حصے کا ذکر ہے جہاں پختہ مکانات بنے ہوئے ہیں۔

شہر سے باہر لق و دق میدان میں پختہ سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے جن پر نمبروں کی تختیاں لگی ہوئی ہیں۔ درمیان میں خیموں کے لیے پلاٹ بنے ہوئے ہیں۔ جگہ جگہ نل لگے ہوئے ہیں۔ بیت الخلاء کے لیے گڑھے کھدے ہوئے ہیں۔ ۸ یا ۹ ذی الحج کو زائرین کے پہنچنے سے پہلے ہزاروں ٹرک خیمے اور دیگر سامان اٹھائے منیٰ میں پہنچ جاتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس لق و دق ویرانے میں ہزارہا خیمے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کھانے پکتے ہیں اور سڑکوں پر قسم قسم کے سٹال لگ جاتے ہیں۔ چوکوں میں احرام میں ملبوس سپاہی کھڑے ہو جاتے ہیں اور زائرین کے آرام و آسائش کے لیے جگہ جگہ سعودی حکومت کے مختلف وزارتوں کے دفتر قائم ہو جاتے ہیں۔

منیٰ ایک جادو نگری ہے جو سارا سال ویرانیوں میں دم توڑتی رہتی ہے اور پھر دفعتاً چند ایک روز کے لیے یوں آباد ہو جاتی ہے جیسے کبھی غیر آباد نہ تھی اور چار ایک دنوں کے بعد پھر وہی لق و دق ویرانی جیسے کبھی آباد نہ ہو سکتی ہو۔

خیمہ ہوٹل:

منیٰ میں ہماری موٹر ایک صاف ستھرے خوبصورت خیمے کے سامنے رک گئی جس پر جلی حروف میں لکھی ہوئی تختی لگی ہوئی تھی "خندق الملکی"۔

اندر ایک فراخ صحن تھا جس کے اردگرد رہائشی خیمے لگے ہوئے تھے۔ وسط میں ایک وسیع شامیانے میں کھانے کے میز لگے ہوئے تھے۔ ملحقہ وسیع و عریض خیمے میں قالین بچھے ہوئے تھے جن پر کرسیاں اور صوفے لگے ہوئے تھے۔ لمبے چغوں میں ملبوس چند موٹی موٹی میمیں ان صوفوں پر بیٹھیں کوک پی رہی تھیں۔ چار ایک احرام پوش سکہ بند صاحب کافی کے پیالے سامنے رکھے ہوئے بیٹھے تھے۔ ان کے اردگرد وردیوں میں ملبوس بیرے کھڑے تھے۔

ہوٹل میں داخل ہو کر قدرت نے کہا اب تھوڑا سا آرام کر لیں، اور وہ اپنے خیمہ میں داخل ہو گئے۔ ساتھ والا خیمہ میرا تھا۔ خیمے میں بیڈ لگا تھا، غالیچہ بچھا تھا۔ چند ایک کرسیاں اور میزیں رکھی ہوئی تھیں۔

بے نام آزردگی:

پتہ نہیں اس روز میں اس قدر مضطرب کیوں تھا۔ پتہ نہیں کیوں ایک بے نام سی آزردگی چھائی ہوئی تھی۔ دل میں ایک خلش سی لگی تھی۔ اندر اک آگ سلگ رہی تھی۔ ایک دھنکی چل رہی تھی۔ میں اس قدر پریشان تھا جیسے کوئی بچہ میلے میں اپنے ماں باپ سے بچھڑ گیا ہو۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ کالا کوٹھا جو میرا مرکز بن چکا تھا، میری نگاہ سے اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ کھونٹی نہ رہی تھی جس پر میں نے اپنے آپ کو ٹانگ رکھا تھا۔ اس لیے منیٰ میں میں یوں بے جان پڑا تھا جیسے کھونٹی سے گرا ہوا کپڑا زمین پر ڈھیر ہو جاتا ہے۔

دو گھنٹے میں اسی طرح ڈھیر پڑا رہا۔ پھر سہارے کی تلاش میں میں قدرت کے خیمے میں جا داخل ہوا۔ اس وقت قدرت ڈاکٹر عفت سے باتیں کر رہے تھے۔ میں رک گیا۔

قدرت نے اپنی بات جاری رکھی۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر بھی نہ دیکھا اور یوں باتیں کرنے میں محسوس رہے جیسے کمرے میں کوئی داخل نہ ہوا ہو، جیسے وہ اکیلے تھے۔ ان کی نگاہ میں ایک عجیب بے تعلقی سی تھی جسے محسوس کر کے مجھے ایک دھچکا سا لگا۔

عظیم بے گانگی:

اگر آپ کو کسی بزرگ کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہے تو شاید آپ THE DIVINE UNCONCERN سے واقف ہوں۔

آپ کسی بزرگ سے ملیں، وہ آپ کو دیکھ کر اٹھ بیٹھیں گے۔ محبت سے مصافحہ کریں گے بڑی ہمدردی اور شفقت سے حال احوال پوچھیں گے۔ پوری توجہ سے آپ کی بات سنیں گے اور پھر پورے خلوص سے آپ کو مشورہ دیں گے...... ٹھہریئے۔ میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اسی وقت اس بزرگ کو فرشی سلام کیجئے اور وہاں سے چلے آیئے۔ اگر وہاں سے چلے آنے میں آپ نے توقف کیا تو آپ کو DIVINE UNCONCERN سے دوچار ہونا پڑے گا، اور وہ عظیم بے نیازی، عظیم بے گانگی، عظیم بے تعلقی بنگی ہو کر آپ کے سامنے آجائے گی۔

اگر آپ نے توقف کیا تو آپ دیکھیں گے کہ اس بزرگ کی توجہ آپ کی طرف سے یوں SWITCH OFF ہو جائے گی کہ انہیں آپ کے وجود کا احساس نہیں رہے گا۔ وہ آپ کی طرف یوں دیکھیں گے کہ ان کی نگاہیں رکیں گی نہیں بلکہ آپ کے پار ہو جائیں گی۔ آپ حرفِ غلط کی طرح مٹ کر رہ جائیں گے، نقش بر آب کی طرح ناپید ہو جائیں گے۔ DIVINE UNCONCERN بزرگوں کا ایک وصف ہے۔ ایک ہتھیار ٹھنڈی، اور کند چھری۔

پتھر اور چُور چُور:

قدرت کے خیمے میں میں دیر تک کھڑا رہا۔انہوں نے دو ایک مرتبہ میری طرف دیکھا بھی، لیکن ان کی نگاہیں میرے پار ہو گئیں۔

پھر ڈاکٹر عفت بولیں ''مفتی صاحب آئے ہیں''۔قدرت نے یوں ''اچھا؟'' کہا جیسے ''اچھا'' ایک منتر ہو جسے پھونک کر دوسرے کے وجود کو رد کر دیا جاتا ہے۔

وہ ''اچھا'' مجھے یوں لگا جیسے کسی نے کچے شیشے پر پتھر دے مارا ہو۔میرا وجود چور چور ہو گیا۔میرے ریزے ہوا میں یوں اڑے جیسے دھنکئے کے ارد گرد روئی کے ذرات کی بارش ہوتی ہے۔وہ ریزے میری روح میں کانٹوں کی طرح پیوست ہو گئے۔غصے سے میرا خون کھولنے لگا۔میری آنکھوں میں قدرت کا خیمہ سرخ ہو گیا اور میں بھاگا۔

دور بہت دور ڈاکٹر عفت کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں: ''مفتی صاحب، مفتی صاحب''۔

لیکن ٹھہریئے۔اس پتھر اور چور چور کی اہمیت آپ پر واضح نہیں ہو سکتی جب تک اس کا پس منظر بیان نہ کیا جائے اور جب تک آپ پر اس تفصیل کی اہمیت واضح نہ ہو، آپ مفتی کو نہیں سمجھ سکتے۔

پراسرار شخصیت:

قدرت اللہ شہاب بزرگ ہیں یا نہیں، اس کا مجھے علم نہیں، لیکن ایک بات یقینی ہے کہ وہ ایک پراسرار شخصیت ہیں۔صرف نفسیت کے لحاظ سے نہیں۔انفرادی نفسیت کی گھسن گھریاں تو تقریباً ہر شخصیت میں موجود ہوتی ہیں جو اسے اسرار کی جھال دے دیتی ہیں۔قدرت کی پراسراریت کسی اور قسم کی ہے۔داخلی تاثرات کی

بات نہیں۔ اس پراسراریت کے مجھے کئی ایک خارجی ثبوت بھی ملتے رہے تھے۔

مثلاً اشفاق احمد نے ۱۹۵۸ء میں مجھے قدرت سے متعارف کیا۔ پھر ان ابتدائی دنوں میں جب قدرت اور میں ملنے لگے تھے تو ایک پائے کے بزرگ نے جھنگ سے خط لکھا جس میں تحریر تھا کہ "ان دنوں جن صاحب سے آپ ملنے لگے ہیں انہیں ہمارا سلام کہیے"۔ حالانکہ قدرت اور میری ملاقاتوں کی بات ابھی نکلی نہ تھی۔

کراچی کی ایک نہایت پاکیزہ اور عابدہ خاتون جو اعتکاف کرنا چاہتی تھی، انہیں خواب میں قدرت کا مکان دکھایا گیا اور اشارہ ہوا کہ فلاں مکان میں اعتکاف کیا جائے۔ اس نے عرض کی کہ مجھے اس مکان کا اتا پتا بتایا جائے۔ پھر حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ اس خاتون کو قدرت کے گھر جانا پڑا۔ وہاں جاتے ہی وہ گھر کو پہچان گئیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے مجھ سے بات کی۔ کہنے لگیں: "بھائی یہ کس کا گھر ہے۔ مجھے یہاں اعتکاف کرنے کا حکم ہوا ہے"۔

ایسے بیسیوں خارجی واقعات ہیں جو قدرت کی پراسراریت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ لیکن قدرت سے میرے تعلقات اس پراسراریت کی وجہ سے استوار نہیں ہوئے۔ الٹا ان کی یہ خصوصیت تو ہمارے درمیان ایک رکاوٹ ہے۔ اس تعلق کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ قدرت کے کردار میں عظیم عجز تھا۔ عجز انسان کا منفرد اور مخصوص وصف ہے جو مجھ پر شدت سے اثر انداز ہوتا ہے۔ قدرت کے اسلام میں بے پناہ وسعت تھی۔ وہ اپنی نیکی کو بانس پر نہیں چڑھاتے تھے بلکہ یوں جیسے معذرت خواہ ہوں۔ وہ چھپ چھپ کر باتھ روم میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ قدرت سے ملنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ اسلام کیا چیز ہے۔ اللہ کا کیا مفہوم ہے اور محمدؐ کس قدر عظیم انسان تھے۔

ان خارجی تعلقات کی وجہ سے مجھے شک پڑنے لگا تھا کہ قدرت کو اللہ اور اسلام سے ایک پراسرار تعلق ہے اور اسی بنا پر میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میں حج پر اکیلا نہیں جاؤں گا۔ میں سوچتا تھا مجھے وہاں کون جانتا ہے۔ میں وہاں کیا منہ لے کر جاؤں گا۔ جبھی تو میں نے اتنی دیر انتظار کیا تھا اور پھر قدرت کے ہمراہ حج پر گیا تھا۔ میرے لیے قدرت کی حیثیت ایک لاٹھی کی تھی اور میری اپنی حیثیت ایک اندھے اپاہج کی۔

لاٹھی اور اندھا:

اس روز منیٰ کے اس خیمے میں لاٹھی نے اندھے اپاہج کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ خود لاٹھی نے اندھے کو ٹھوکر لگائی تھی۔ پتھر مارا تھا۔

جب میں خیمے سے باہر نکلا تو فضا خون آلود تھی۔ ایک تند و تیز جھکڑ چل رہا تھا۔

میں ایک شدت پسند غصیل آدمی ہوں۔ غصے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے میں نے عجز پال رکھا ہے۔ یہ عجز جھوٹا ہے۔ اس روز منیٰ میں عجز اور احترام کی وہ ملمع اتر گئی اور نیچے سے میں نکل آیا۔ میں......!

اندھے اپاہج نے آنکھیں کھول دیں۔ میں اندھا نہیں ہوں۔ مجھے کسی لاٹھی کی ضرورت نہیں۔ میں کیا پرواہ کرتا ہوں کسی کی۔ قدرت رہبر ہے تو پڑا ہو۔ میں کسی رہبر کا محتاج نہیں ہوں۔ شاید اسے یہ زعم ہے کہ اس کی وجہ سے مجھے یہ سب سہولتیں میسر ہیں۔ یہ آرام یہ انگریزی ہوٹل، یہ غالیچے، یہ کرسیاں، یہ بیڈ۔ مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ یہ میری طبیعت کے منافی ہیں۔ I DO NOT BELONG TO THEM میں نالے کے کنارے دری بچھا پڑا رہوں گا۔ میں عرفات میں پیدل چل کر جاؤں گا۔ مجھے اس مرسڈیز کی ضرورت نہیں جسے

سعودی حکومت نے اپنے مہمان کے لیے وقف کر رکھا ہے۔

غصے میں میں ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ مجھے علم نہیں تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میری صرف ایک خواہش تھی کہ میں چلا جاؤں۔ دور اس ہوٹل سے دور، اس لاٹھی سے دور، اس اندھے پن سے دور جسے میں نے کئی ایک سالوں سے زبردستی اپنا رکھا تھا۔

اس وقت میرے ذہن میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

''میں میں'':

کتنا احمق ہوں میں کہ دانش ور ہوتے ہوئے میں نے ایمان کی تلاش میں اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ کتنا احمق ہوں میں کہ ان مافوق الفطرت واقعات کو اہمیت دیتا ہوں۔ دانش کا کام تو شک کرنا ہے، ایمان لانا نہیں۔ بال کی کھال اتارنا ہے، تسلیم و رضا کے جذبے سے اپنے کو فریب دے کر مطمئن کرنا نہیں۔

غصے کی وجہ سے میرا منہ لال ہو رہا تھا، دل کھول رہا تھا۔ چلتے ہوئے ٹھوکریں لگ رہی تھیں۔

مور کے وہ پر جو گذشتہ آٹھ سالوں میں قدرت سے مستعار لے کر میں نے بڑی محنت سے اپنی دم میں سجائے تھے، ایک ایک کر کے نوچ کر نکال پھینکے۔

کیا یہ ضروری ہے کہ میں حج ادا کر کے واپس لوٹوں۔ یہ RITUAL جسے حج کہا جاتا ہے، محض ایک پریڈ ہے، میں اس پریڈ کو فرض کے طور پر ادا نہیں کر رہا۔ میں نے کبھی کوئی فرض بھی تو پورا نہیں کیا۔ پھر حج کا فرض پورا کرنے کا مطلب؟ میں کیا مسلمان ہوں جو فرض پورے کروں۔ میں تو مردم شماری کا مسلمان ہوں اور……

اور مسلمان کون ہیں؟ کہاں ہیں؟ کچھ لوگوں نے اسلام کو بت بنا رکھا ہے۔ کچھ لوگوں نے اپنی اہمیت قائم کرنے کے لیے اسے اجارہ بنا رکھا ہے۔ کچھ لوگ اسے

کاروباری طور پر استعمال کر رہے ہیں لیکن میں ..... میرا تو اسلام پر ایک بہت بڑا احسان ہے کہ میں نے اسے گدلا نہیں کیا۔ میں نے اسے ذاتی اہمیت کے لیے استعمال نہیں کیا۔ میں نے اس کا اس قدر احترام کیا ہے کہ اس کے حدود میں کبھی پاؤں نہیں رکھا تا کہ وہ میلا نہ ہو جائے۔

خیمے:

مجھے ٹھوکر لگی۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اس وقت میں زائرین کے خیموں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ میرے سامنے خیمے ہی خیمے تھے، ہر خیمے کے دو حصے تھے۔ ایک وسیع و عریض حصہ جس میں زائرین نے زمین پر بستر بچھا رکھے تھے۔ اور وہ ان پر بیٹھے ہوئے آپ میں باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ شامیانے کا سامنے کا پردہ اٹھا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ باہر سڑک سے دکھائی دے رہے تھے۔ بڑے حصے سے ملحقہ ایک چھوٹا سا خیمہ تھا جس کے گرد قناتیں لگی ہوئی تھیں اور اندر چولہے بنے ہوئے تھے۔ چولہوں پر بڑے بڑے دیگچے رکھے ہوئے تھے۔ نیچے آگ جل رہی تھی۔

چولہوں کے پیچھے باورچی کھڑا کھانا پکانے یا بانٹنے میں مصروف تھا۔ تقریباً ہر خیمے کا ماحول ایک سا تھا۔ کہیں ہیں متمول زائرین کا خیمہ آ جاتا جہاں پلاسٹک کے برتنوں کا انبار لگا ہوتا۔ دیگچوں کی جگہ دیگیں پک رہی ہوتیں اور عام سالن کی جگہ مرغیوں سے رقابیں بھری ہوتیں۔

اس وقت میری نظر میں یہ تمام تفصیلات دھندلائی ہوئی تھیں۔ میرے سینے میں غصے کی دیگ چڑھی ہوئی تھی۔ اس سے نکلتی ہوئی بھاپ نے میری نگاہوں پر غلاف چڑھا رکھا تھا۔

ارے..... میں رک گیا.....

لڑائی جھگڑے:

ایک خیمے کے زائرین اپنے معلم سے جھگڑ رہے تھے۔ پتہ نہیں زیر بحث معاملہ کیا تھا۔ آیا کھانے پر جھگڑا تھا یا داموں پر۔ زائرین غصے میں بول رہے تھے۔ ان کے منہ سرخ تھے، آستینیں چڑھی ہوئی تھیں، ماتھوں پر تیوریاں، زبانیں چل رہی تھیں، منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ معلم یوں پتھر بنا کھڑا تھا جیسے بت ہو۔ اس کے چہرے پر خشونت تھی، بے حسی تھی۔ اس جھگڑے کو دیکھ کر میں رک گیا۔ سعودی عرب کی سرزمین پر قدم رکھے مجھے پانچ ایک دن ہو چکے تھے۔ جدہ یا مکہ معظمہ کہیں بھی میں نے لڑائی بھڑائی کا منظر نہیں دیکھا تھا۔

اس منظر کو دیکھ کر حیرت ضرور ہوئی لیکن اس میں خوشی کا عنصر بھی شامل تھا۔ غالباً اس لیے کہ میری داخلی کیفیت اس سے ہم آہنگ تھی۔ کافی دیر میں وہاں کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر آگے چل پڑا۔

چند ایک قدم کے بعد کچھ لوگ ایک خیمے کے سامنے "کنیو" میں کھڑے ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک زائر نے دوسرے کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ اس نے کھینچنے والے کو دھکا دیا اور وہ زمین پر گر گیا۔ اس پر چار ایک زائر دھکا دینے والے پر پل پڑے۔ کنیو کی ساری قطار گڈمڈ ہو گئی، جیسے سانپ نے کنڈلی مار لی ہو۔ وہ چیخ رہے تھے، چلا رہے تھے، ایک دوسرے کو مکے دکھا رہے تھے......

دفعتاً میری نگاہ اس خیمے پر جا پڑی جس کے سامنے ہنگامہ ہو رہا تھا۔

وہ ایک چھوٹا سا خیمہ تھا جس پر بیت الخلاء کی تختی لگی ہوئی تھی۔ ہوں! تو یہ سارا جھگڑا رفع حاجت کے بارے میں ہے۔

آگے بازار میں دکانوں پر لوگ بھیڑ لگائے کھڑے تھے۔ وہ مختلف قسم کی

چیزوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ دکاندار بڑے خشمگیں لہجے میں خریداروں کو ڈانٹ رہا تھا۔ غالباً وہ پسند نہیں کر رہا تھا کہ لوگ چیزوں کو اٹھا کر دیکھیں۔ زائرین دکاندار کو چڑانے کے لیے جان بوجھ کر چیزیں اٹھاتے اور ازراہ مذاق دکاندار کو دکھا کر اس کے دام پوچھتے۔ اس پر دکاندار چیختا چلاتا اور ان سے کہتا "جاؤ جاؤ اپنا راستہ لو۔ یہاں بھیڑ مت کرو......"

پھر کسی شخص نے دکان سے ایک چیز اٹھا کر دکاندار کے منہ دے ماری۔ اس نے چوک میں کھڑے سپاہی کو آواز دی اور ساتھ ہی چھلانگ مار کر اس شخص پر جھپٹ پڑا۔ گھبرا کر میں آگے چل دیا۔

مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ شہر منیٰ نہ ہو، جیسے ہم حج پر نہیں جا رہے تھے۔ بلکہ میں وہاں کسی بین الاقوامی میلے پر آیا ہوا تھا۔ جہاں پاکستانی میلوں کی جگہ جگہ لوگوں میں لڑائیاں جھگڑے اور فسادات ہو رہے تھے۔

ان جھگڑوں اور ہاتھا پائیوں کو دیکھ دیکھ کر میرے دل کا اضطراب اور بڑھ گیا۔ قریب ہی ایک چائے کا سٹال دیکھ کر میں وہاں رک گیا۔ ایک پیالہ چائے میں نے اشارے سے سٹال والے سے کہا اور پھر کسی اٹھا کر ایک کونے میں جا بیٹھا۔ وہاں پہلے سے ہی ایک بڑے میاں بیٹھے ہوئے تھے۔

بڑے میاں:

"السلام علیکم" انہوں نے مجھے دیکھ کر کہا۔ اور اس کے بعد ہم دونوں خاموشی سے چائے پینے لگے۔

ابھی میں نے چائے کے دو گھونٹ ہی پیے تھے کہ ایک حبشی بازار میں چیخنے چلانے لگا۔ شور سن کر لوگ ادھر بھاگے۔

میں حیرت سے بازار کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا ہوا؟'' بڑے میاں نے مجھ سے پوچھا۔

''پتہ نہیں''۔ میں نے جواب دیا ''غالباً جھگڑا ہو رہا ہے''۔

''اوہ!'' وہ اطمینان کا سانس لے کر بولے۔ ''میں سمجھا کوئی حادثہ ہوا ہے''۔

''جھگڑا بھی تو حادثہ ہی ہوتا ہے''۔ میں نے کہا

''اونہوں''۔ وہ بولے ''جھگڑے تو یہاں ہوں گے، ہوتے ہی رہتے ہیں، جگہ جگہ ہوتے ہیں، بات بات پر ہوتے ہیں۔ ہاتھا پائیاں ہوتی ہیں، لڑائیاں ہوتی ہیں۔ وہ تو یہاں کا معمول ہے''۔

''جی؟'' میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

''بھائی میرے'' وہ بولے ''یہ منیٰ ہے منیٰ''۔

''منیٰ؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''آپ منیٰ کو نہیں جانتے کیا؟''

''جی نہیں؟'' میں نے کہا۔ ''آپ پاکستان سے آئے ہیں کیا؟''

''ہاں''۔ وہ بولے ''کبھی آیا تھا، اب تو میں مکہ معظمہ میں رہتا ہوں۔ دس سال سے یہیں مقیم ہوں''۔

''آپ منیٰ کے متعلق کچھ فرما رہے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ منیٰ ہے میرے بھائی''۔ وہ بولے ''یہاں کوئی شخص قیام نہیں کر سکتا۔ یہاں بہت سے پختہ مکانات موجود ہیں جن میں آرام و آسائش کا سامان لگا ہے، لیکن کس میں اتنی ہمت ہے کہ یہاں قیام کر سکے''۔

میں نے حیرت سے بڑے میاں کی طرف دیکھا۔

''سارا سال یہ شہر خالی پڑا رہتا ہے'' وہ بولے۔ ''سال میں صرف چار چھ دن کے لیے آباد ہوتا ہے۔''

"لیکن کیوں؟" میں نے پوچھا

وسوسوں کا شہر:

اس لیے کہ یہ منیٰ ہے منیٰ وہ جگہ ہے جہاں ابلیس حضرت ابراہیم کو تین مرتبہ بہکانے کی کوشش کی تھی۔ جب وہ حضرت اسماعیل کی انگلی تھامے اس راستے پر جا رہے تھے تا کہ بیٹے کو اللہ کی رضا پر قربان کر دیں۔ اس وقت ابلیس نے ان کے دل میں وسوسے پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ کہنے لگا "چھوڑیئے صاحب! بیٹے کی قربانی دینا کہاں کی عقل مندی ہے۔ اللہ کو قربانی کی کیا ضرورت ہے بھلا"۔

"تین مقامات پر ابلیس نے حضرت ابراہیم کے یقین محکم کو توڑنے کی کوششیں کیں۔"

"جب ان کا ایمان متزلزل نہ ہوا تو ابلیس نے ان کے بیٹے حضرت اسماعیل کو ورغلایا۔ تمہارا باپ تو دیوانہ ہے جو اپنے لخت جگر کا گلا کاٹنے کے لیے قربان گاہ کو لیے جا رہا ہے۔ کوئی صاحب عقل و دانش ایسا کام کر سکتا ہے کیا؟ کیا تمہارے والد کا ذہنی توازن خراب ہو چکا ہے؟ بھاگ جاؤ۔ ہاتھ چھڑا کر اس دیوانے سے دور بھاگ جاؤ۔ بھاگ کر اپنی جان بچا لو ورنہ......"

"یہ جو تین جمرے منیٰ میں بنے ہوئے ہیں، جمرۃ العقبیٰ، جمرۃ الوسطیٰ اور جمرۃ الاولیٰ جہاں پتھر گڑے ہیں، یہ مقامات ہیں جہاں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کو ابلیس نے بہکانے کی کوشش کی تھی"۔

"لوگ کہتے ہیں کہ ان مقامات کی نشاندہی کے لیے یہ پتھر گاڑے گئے ہیں۔ اونہوں ...... یہ نشانات نہیں، یہ تو شیطان کو پتھر بنا دیا گیا اور پتھر بن کر بھی اس کے اثرات جوں کے توں قائم ہیں۔ انہوں نے اپنے اثرات سے اس شہر کو منیٰ بنا دیا ہے۔ وسوسوں کا شہر، شر کا شہر، الحاد کا شہر، تذبذب کا شہر، انتشار کا شہر، یہاں بڑے

بڑے ڈول جاتے ہیں، بڑوں بڑوں کی منزل کھوئی ہو جاتی ہے۔ اندھوں کے ہاتھوں سے لاٹھیاں چھوٹ جاتی ہیں"۔

میں نے چونک کر بڑے میاں کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ یوں مسکرا رہے تھے جیسے اندھے اور لاٹھی کے قصے سے مَاحقہ واقف ہوں۔

میرے ذہن میں ایک جھکڑ چلنے لگا۔

تو کیا! تو کیا وہ پتھر جس نے مجھے چور چور کر دیا تھا، پتھر نہیں تھا بلکہ خود جمرۃ الاولیٰ تھا؟ کیا اندھے سے لاٹھی کسی مقصد کے لیے چھین لی گئی تھی؟ کیا وہ منیٰ ہی تھا جس نے مجھ سے میرا اندھاپن چھن لیا تھا اور مجھے رہبر سے بے نیاز کر دیا تھا؟

میں نے حیرت سے بڑے میاں کی طرف دیکھا۔

وہ مسکرا دیئے۔ بولے "جاؤ میرے بھائی جاؤ، اپنے خیمے میں جاؤ۔ ورنہ اندھیرا ہو گیا تو پھر شاید راستہ نہ ملے۔ یہ منیٰ ہے۔ یہاں جو راستہ بھٹک جاتا ہے وہ پھر کبھی پہنچ نہیں پاتا۔"

میں نے غور سے بڑے میاں کی طرف دیکھا۔

ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی روشنی تھی۔ ان کے خدوخال میں محبت بھری سلوٹیں رینگ رہی تھیں۔ ان کے انداز میں محبت اور خدمت کا جذبہ کارفرما تھا۔

"اٹھو۔" اٹھو۔ میرے دل سے آواز گونجی "اٹھو اور بڑے میاں سے رخصت ہو جاؤ ورنہ اگر THE DIVINE UNCONCERN جاگ اٹھی تو ......؟"

میں نے اٹھ کر بڑے میاں کو مودبانہ سلام کیا اور وہاں سے چلا آیا۔

رستہ بھول:

جب میں اپنے ہوٹل کے قریب پہنچا تو دروازے پر قدرت اور ڈاکٹر عفت

کھڑے تھے۔ڈاکٹر نے مجھے دیکھ کر شور مچا دیا ''مفتی صاحب! ادھر اس طرف۔''

قدرت نے کہا ''ہم بڑے فکر مند تھے۔ ہمارا خیال تھا، آپ راستہ بھول گئے ہیں۔''

''ہاں میں راستہ بھول گیا تھا۔''میں نے جواب دیا

''چلو اچھا ہوا آپ لوٹ آئے''۔انہوں نے جواب دیا

''یہ منیٰ ہے''۔میں نے کہا

''کیا مطلب؟''قدرت نے پوچھا۔

''یہاں بہت سے لوگ راستہ بھول جاتے ہیں''۔

''بہت سے لوگوں کا راستہ کاٹا جاتا ہے۔''

''بہت سے لوگوں کے قیام کو متزلزل کر دیا جاتا ہے۔''

''ہوں''! قدرت بولے۔

''بہت سے اندھوں کے ہاتھوں سے لاٹھیاں چھین لی جاتی ہیں۔میں نے کہا متحمل مزاجوں کو منتشر کر دیا جاتا ہے۔''

''یہ شہر نہیں یہ ایک جائے امتحان ہے اور مجھ ایسے نحیف و ناتوانوں میں اتنی ہمت نہیں کہ امتحان میں پڑوں، میں یہاں رکنا نہیں چاہتا۔''

''نہیں نہیں ایسا نہ کہیے جن کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں، جن کی راہ کاٹی جاتی ہے، وہ بڑے خوش قسمت ہوگ ہیں''۔قدرت بولے۔

''خوش قسمتی؟''میں نے حیرانی سے دہرایا۔

''صرف ان کے راستے کاٹے جاتے ہیں جن کے پہنچنے کا خطرہ ہوتا ہے، کہ آپ کے چلنے میں پہنچنے کی صلاحیت ہے۔اس سے زیادہ خوشی کا احساس کیا ہو سکتا

ہے''۔قدرت مسکرا کر بولے''امتحان میں پاس یا فیل ہونا اہم نہیں۔اہم یہ ہے کہ کیا آپ کی حرکت میں وہ نیک نیتی،وہ خلوص وہ جذبہ ہے جو پہنچانے کا ضامن بن جاتا ہے''۔

''آپ کو علم ہے مفتی صاحب''۔قدرت نے کہا''کہ حضور اعلیٰ کو منیٰ کے راستے مکہ معظمہ میں داخل ہونا کتنا پسند تھا''۔

میدان عرفات

تذکرہ غوثیہ سے نقل ہے کہ:

ایک روز ارشاد ہوا کہ فرعون کی ایک چیز گم ہو گئی جو اسے پسند تھی۔ اس نے اپنے تمام غلاموں کو حکم دیا کہ "تم میں سے جو بھی ڈھونڈ لائے گا انعام و خلعت پائے گا"۔

طلب و یافت:

جس غلام نے وہ چیز پائی نہایت شاد و خنداں تھا۔ باقی مایوسی کے عالم میں سر جھکائے کھڑے تھے۔

فرعون نے ناکام غلاموں سے کہا "تم سب ملول کیوں ہو؟ "طلب اور تلاش میں تو تم سب برابر ہو۔ صرف یافت سے محروم ہو اور یافت ایک اتفاقیہ امر ہے۔ اس لیے کہ چیز صرف ایک تھی اور کسی ایک ہی کو ملنی تھی۔" اس پر وہ غلام جس نے وہ چیز پائی تھی بولا "حضور! اس لحاظ سے مجھ اور ان سب میں کیا فرق رہ گیا؟"

فرعون نے وہ چیز اٹھا کر یوں زمین پر دے ماری کہ وہ ریزہ ریزہ ہو گئی۔ پھر وہ بولا "تم میں اور ان سب میں صرف اس چیز کا فرق تھا سو مٹ گیا۔ اس چیز کے ہونے نہ ہونے سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم تو صرف تمہاری طلب کے قدر دان ہیں"۔

اس روز سات لاکھ غلام میدان عرفات میں طلب سے سرشار تھے۔ ان کے دلوں میں صرف ایک لگن تھی، ایک جذبہ تھا ایک ولولہ تھا...... تکمیل حج۔

انہیں صرف ایک فکر تھی...... قبولیت کی فکر۔

انہیں طلب کی عظمت کا احساس نہ تھا، حکم بجا لانے کے مقام کا شعور نہ تھا۔

فضا نعروں سے بھری ہوئی تھی۔اے اللہ میں حاضر ہوں۔سبھی حاضر تھے۔ سرتاپا حاضر تھے مگر کسی کو احساس نہ تھا کہ حاضری جبھی ممکن ہے جب حضوری حاصل ہو کہ حاضری اور حضوری دو مختلف چیزیں نہیں کہ طلب انتہا پر پہنچ کر بذات خود مطلوب بن جاتی ہیں۔۔

کسی کو شعور نہ تھا کہ جس کی خدمت میں وہ حاضر ہونے کے لیے جا رہے تھے وہ خود ان کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔کسی کو احساس نہ تھا کہ تلاش بے معنی فعل تھا اور فکر قبولیت فروعی چیز تھی۔

چاروں طرف نعرے گونج رہے تھے، دل دھڑک رہے تھے۔جذبات کا وفور آنسو بن کر آنکھوں سے چھلکنے کے لیے بے تاب تھا۔

جوار بھاٹا:

تیس ہزار موٹریں گھاؤں گھاؤں کر رہی تھیں۔منزل پر پہنچنے کے لیے بے تاب انجن اپنی بے تابی کی شدت کی وجہ سے پہلے گیئر میں پھنسے ہوئے تھے۔

اس وقت ہم سب منیٰ سے میدان عرفات کو جا رہے تھے۔چھ کشادہ متوازی سڑکیں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو عرفات کی طرف دوڑ رہی تھیں۔اس کے باوجود بسیں رک رک کر چل رہی تھیں۔انجنوں کے شور کی وجہ سے زائرین کے دلوں کی دھڑکنیں تیز تر تھیں۔جب آپ چاہتے ہوں کہ اڑ کر منزل کو جا لیں لیکن رینگنے پر مجبور ہوں تو دلوں میں ایک طوفان اٹھتا ہے۔طلب جوار بھاٹا بن جاتی ہے۔

یہ کیفیت کرائسس کی کیفیت تھی۔سست روی سسپنس پیدا کر رہی تھی۔ سسپنس دلوں کی دھڑکنوں کو اور تیز کر رہا تھا۔

پتہ نہیں کیوں جب جلد پہنچنے کا خبط سوار ہو تو وہ خود حرکت میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔پتہ نہیں کس اصول کے تحت اس روز عرفات کی چھ فراخ اور ہموار سڑکوں پر تیس

ہزار بسیں یوں رینگنے پر مجبور تھیں کہ چھ میل کا سفر دو سو میل کے سفر کے برابر ہو گیا تھا۔

لیکن اگر بسیں پہلے گیر میں رینگنے کی بجائے چوتھے گیر میں دوڑتیں تو عرفات کا میدان ایک معمولی سا رہگزار بن کر رہ جاتا۔ حج کا RITUAL ایک بے معنی سی دوڑ کی صورت اختیار کر لیتا۔

میدان عرفات خیموں، قناتوں اور شامیانوں کا ایک وسیع و عریض پھیلاؤ تھا۔ میدان تو کہیں نظر ہی نہیں آتا تھا۔ منیٰ میں تو پھر ایک حصہ ایسا تھا جسے شہر کہا جا سکتا تھا۔ لیکن میدان عرفات میں نہ میدان تھا نہ شہر۔ خیمے ہی خیمے، خیمے ہی خیمے۔

ہماری موٹر حسب دستور ایک وسیع شامیانے کے صدر دروازے پر ٹنگے ہوئے بورڈ کے نیچے جا کھڑی ہوئی جس پر جلی حروف میں فندق الکعکی لکھا ہوا تھا۔ اندر وہی منیٰ کے پڑاؤ کا سا منظر تھا۔ دونوں جانب رہائشی خیموں کی قطاریں اور درمیان میں ایک وسیع شامیانے کے نیچے سجی سجائی نشستیں اور اس کے ملحق خیمے میں کھانے کی میزیں۔

وہی میمیں، وہی صاحب، وہی ٹرے اٹھائے ہوئے منتظر بیرے۔ بالکل منیٰ کے پڑاؤ کی طرح۔

خالی قیام:

عرفات میں پہنچنے کے بعد ایک عجیب سا سکوت طاری ہو گیا جیسے پہاڑوں میں سے لاکھوں چشمے، ندیاں، نالے شور مچاتے ہوئے تیزی سے آئیں اور دامن کوہ پر ان کا پانی ایک وسیع میدان میں پھیل کر ساکن ہو جائے۔

اس سکوت کی وجہ یہ تھی کہ عرفات میں صرف قیام کرنا ضروری ہے، خالی قیام۔ اس قیام کے دوران چاہے آپ چائے پیتے رہیں، طعام کھاتے رہیں، تاش کھیلتے رہیں یا نوافل پڑھتے رہیں یہ آپ کی اپنی مرضی پر منحصر ہے یعنی عرفات کا قیام

بذاتِ خود ایک خلاء ہے۔

RITUAL درخت کی مصداق ہوتا ہے۔ اس کی خوبصورتی اس بات پر موقوف ہوتی ہے کہ وہ ٹہنیوں اور پتوں سے لدا ہوا ہو۔

بیاہ بنیادی طور پر ایک مذہبی اور قانونی معاہدہ ہے لیکن ہم نے اس میں رسم کی پھول پتیاں لگا کر ایک رنگین RITUAL بنا رکھا ہے۔ رسم کی پھول پتیاں جس قدر زیادہ ہوں گی، اسی قدر RITUAL میں رنگ پیدا ہوگا۔

اس لحاظ سے حج □ RITUAL نہیں۔ حج میں طواف، سعی اور جمرا صرف تین ارکان فعالی حیثیت رکھتے ہیں، باقی قیام قیام قیام۔ منیٰ کا قیام، عرفات کا قیام، مزدلفہ کا قیام۔

پھول پتیاں:

بچپن میں میں سنا کرتا تھا کہ حج کے دن میدان عرفات میں پہنچ کر زائرین کا عظیم انبوہ چٹیل میدان میں قطاریں بنا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ قطاریں ہی قطاریں، قطاریں ہی قطاریں، قطاریں ہی قطاریں۔ زائر ہی زائر، زائر ہی زائر۔ تا حدِ نظر۔

اور پھر بنے سجے اونٹوں کا ایک قافلہ جبل رحمت کی طرف بڑھتا ہے۔ گھنٹوں یہ قافلہ چلتا رہتا ہے۔ جبل رحمت کی چوٹی پر پہنچ کر ہر اونٹ اپنے مخصوص مقام پر استادہ ہو جاتا ہے۔ پھر جب کوئی صاحب خطبہ پڑھتے ہیں اور ہجوم احترام کے جذبے سے سرشار چپ چاپ کھڑا سنتا ہے۔

پھر غروبِ آفتاب کے قریب جبل الرحمت پر استادہ اونٹوں میں سے وہ اونٹنی جو سب سے زیادہ بنی سجی ہوتی ہے اور جو مرکزی مقام پر استادہ ہوتی ہے۔ اپنی اگلی ٹانگیں جھکا کر گھٹنوں کے بل کھڑی ہو جاتی ہے۔ پھر آواز آتی ہے ''حاجیوں کے حج قبول'' جسے سن کر کوئی سفید رومال لہراتا ہے۔ جو زائر اس اعلان کو سنتا ہے وہ با آواز

بلند اسے دہراتا ہے "حاجیوں کے حج قبول"۔ ساتھ ہی وہ اپنا سفید رومال لہراتا ہے۔

آن کی آن میں عرفات میں لاکھوں سفید رومال پھریروں کی طرح ہلتے ہیں اور لاکھوں زائرین خوشی اور انبساط سے نعرے لگاتے ہیں: "حاجیوں کے حج قبول"۔

پتہ نہیں یہ تفصیلات قیام کے اس خلاء کو پر کرنے کی خواہش کے زور پر اختراع کی گئی تھیں یا واقعی اس زمانے میں اربابِ نظم ونسق نے حج کی رسم کو پرشکوہ بنانے کے لیے ان جزویات کو رائج کر دیا تھا۔

جان کین:

۱۸۷۸ء میں ایک عیسائی جان ایف کین نے محمد امین کے نام سے حج میں شرکت کی تھی اور اپنے تاثرات قلمبند کئے تھے۔

اگرچہ کسی غیر مسلم کو حرمین کے حدود میں داخل ہونے کی اجازت نہیں اس کے باوجود چند ایک عیسائیوں نے تحقیق کی غرض سے زائر کا بھیس بدل کر حج میں شرکت کی۔ مثلاً جان لوڈوگ برک ہارٹ نے شیخ حاجی عبداللہ کے نام سے فریضۂ حج میں شرکت کی تھی۔ حاجی محمد امین بھی ان عیسائیوں میں سے ایک ہیں۔ میدان عرفات کے متعلق حاجی محمد امین کے تاثرات اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہوں:

عرفات ایک میدان ہے جو چار پانچ مربع میل رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ عرفات کے شمال مشرق میں دوسو گز اونچا پہاڑ ہے جسے جبل العرفات کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ملحقہ ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جو جبل الرحمت کے نام سے موسوم ہے۔

جبل العرفات کی طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہو جاؤ تو میدان عرفات یوں

دکھائی دیتا ہے جیسے ایک عظیم ایمفی تھیٹر ہو اور ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے لاکھوں آدمیوں کے ساتھ آپ ایک قدیم، عظیم اور عالی شان سٹیج پر کھڑے ہیں۔

پرہیبت انبوہ:

آپ کے سامنے ایک عظیم انبوہ ہے۔ ننگے کالے سروں اور سفید پیراہنوں کا انبوہ۔ قطار در قطار انبوہ۔ اس ویرانے میں اتنے عظیم انبوہ کو دیکھ آپ کے دل میں حیرت پیدا ہوتی ہے۔ پھر آپ سوچتے ہیں کہ ان میں سے ہر فرد ہزاروں میل کا سفر کر کے دنیا کے کونے کونے سے وہاں پہنچا ہے۔ اس خیال سے آپ کے دل پر ہیبت چھا جاتی ہے۔

جبل الرحمت پر لوگوں کی اتنی بھیڑ ہے کہ کسی کا حرکت کرنا یا راستہ بنانا ممکن نہیں۔

پھر غروب آفتاب کے قریب جبل العرفات سے ایک نعرہ بلند ہوتا ہے جس میں اللہ اور محمدؐ کے الفاظ واضح طور پر سنائی دے رہے ہیں۔

یہ نعرہ اس انبوہ میں یوں گونجتا چلا جا رہا ہے جیسے سمندر میں لہریں چل رہی ہوں۔ ساتھ ہی کسی نے پہاڑی سے سفید کپڑا لہرا کر اشارہ سا کیا۔ اس اشارے کے جواب میں لوگوں نے احرام کا اوپر کا حصہ اتارا اور اسے لہرانے لگے۔

ہر چند ساعت کے لیے ہی عظیم گنگناہٹ لہر کی طرح جبل العرفات سے اٹھتی ہے، پیراہن لہراتے ہیں اور پھر مکمل سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ ہر چند منٹوں کے بعد یہی عمل دہرایا جاتا ہے اور پھر سکوت طاری ہو جاتا ہے۔

یہ سلسلہ آدھ گھنٹہ جاری رہتا ہے۔

اس دوران میں ہجوم کا جذبہ طوفان بن گیا ہے۔ لوگ جذبے کی شدت کی وجہ سے آپے سے باہر نکلے جا رہے ہیں۔ کئی ایک پر دیوانگی طاری ہے۔ وہ چیخ رہے

ہیں، چلا رہے ہیں۔ ایک عظیم شور برپا ہو گیا ہے۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جسے دیکھ کر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبات آپ پر مسلط ہو جاتے ہیں۔

میں جو اس منظر کو حقیقت پسندانہ اور خارجی نگاہ سے دیکھ رہا ہوں، مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تین لاکھ دیوانوں میں صرف میں ایک فرزانہ ہوں۔

اس روز میدان عرفات میں نہ تو میدان نظر آتا تھا اور نہ زائرین کا انبوہ۔ صرف خیمے ہی خیمے تھے اور ان خیموں کا عظیم پھیلاؤ بھی تو پورے طور پر دکھائی نہ دیتا تھا۔

فندق الکعکی میں بھی زائرین اپنے اپنے خیمے میں بند تھے۔ چند زائرین بڑے شامیانے کے نیچے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ تسبیحیں چل رہی تھیں، ہونٹ ہل رہے تھے۔ چہروں پر اداسی بھرا سکون طاری تھا۔ کندھے یوں جھکے ہوئے تھے جیسے کوئی افتاد آ پڑی ہو جسے وہ صبر و تشکر سے جھیل رہے ہوں۔

رنگ رنگ:

دنیا میں رنگ رنگ کے لوگ ملتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو منزل پر پہنچ کر عجیب سا سکون محسوس کرتے ہیں۔ تشکر کے جذبات سے لبالب بھر جاتے ہیں۔ غالباً ایسے لوگ بہتر قسم کے لوگ ہیں۔ لیکن پتہ نہیں کیوں میں ان میں سے نہیں ہوں۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کے لیے خوشی، اطمینان اور سکون نہیں بلکہ ایک اضطرابی کیفیت ہے۔ منزل پر پہنچ کر میرا جی چاہتا ہے کہ خوشی سے ناچوں یا حال کھیلوں یا دھمال مچاؤں۔ خوشی کی شدت میرے لیے ایک فعال کیفیت ہے۔

فندق الکعکی کے مہذب و متمدن لوگ اور ان کا وہ سکون میرے لیے سخت پریشان کن تھا۔ یہ درست ہے کہ وہ سب ذکر الٰہی میں مصروف تھے لیکن ذکر الٰہی تو

گھر بیٹھ کر بھی ہو سکتا ہے۔ تسبیح چلانا مقصود ہو تو کیا اس کے لیے ہزاروں میلوں کا سفر کر کے میدان عرفات میں پہنچنا ضروری ہے؟ نہیں۔ نہیں۔ میں وہاں سے اٹھ بھاگا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میدان عرفات میں دوڑوں بھاگوں، ریت اڑاؤں جیسے قیس صحرا میں دھول اڑاتا پھرتا تھا۔

فندق اللعکی کے خیمے سے نکلنے سے پہلے میں نے سوچا کہ قدرت کو بتا دوں کہ میں جا رہا ہوں۔ نہ جانے کہا جا رہا ہوں، نہ جانے کیا کرنے جا رہا ہوں۔ لیکن جا رہاں ہوں تا کہ وہ میری تلاش میں سرگرداں نہ ہوں۔

روپ بہروپ:

میں نے خیمے میں جھانکا۔ اندر قدرت اور ڈاکٹر عفت دونوں نفل پڑھنے میں مصروف تھے۔

جب قدرت نفل پڑھ رہے ہوں تو انہیں دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ قدرت ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی اور آدمی بہروپ دھارے کھڑا ہو۔ لیکن نہیں ورپ دھارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا چونکہ اس وقت ان کا اپنا روپ تو ہوتا ہی نہیں۔ نفل یا نماز پڑھتے وقت ان کا چہرہ مسخ ہو جاتا ہے۔ یوں مسخ ہو جاتا ہے جیسے کانچ کا گلاس ضرب کھا کر ریزہ ریزہ ہو جائے۔ لیکن ریزے ایک دوسرے سے جڑے رہیں۔ الگ الگ نہ ہوں۔

ان کے چہرے سے ذہانت موقوف ہو جاتی ہے اور شخصیت کی وہ چمک جو عام زندگی میں ان کے چہرے پر آتی جاتی رہتی ہے، اس کی آمد کا امکان سرے سے ختم ہو جاتا ہے۔

اس وقت ایسا لگتا ہے جیسے اس شخص کو دانشوری سے دور کا واسطہ نہ ہو۔ اس وقت ان کے چہرے پر وہ نورانیت بھی تو نہیں ہوتی جو اللہ کے بندوں کے چہروں پر

صاف نظر آتی ہے جنہیں علم ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں اور وہ اس احساس پر اک ان جانی مسرت سے لبریز ہوتے ہیں۔

قدرت کا چہرہ ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ اس کے شانے یوں گرے گرے تھے جیسے ابھی ٹوٹ کر زمین پر ڈھیر ہو جائیں گے۔ ان کے جسم کا ذرہ ذرہ لجاجت، ملامت اور گڑگڑاہٹ سے بھرا ہوا تھا۔

"ہٹاؤ" میں نے سوچا "اس شخص تو اپنی ہی خبر نہیں۔ میں اسے اپنے بارے میں کیسے خبر دے سکتا ہوں"۔ میں فندق الکعکی سے باہر نکل گیا۔

زائر اور دوکاندار:

چند قدم گیا تھا کہ میں اپنے کو بازار میں پایا۔ یہ خیموں کا بازار تھا۔ وہاں ہر قسم کی خوردنی چیزوں کی دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ گوشت سبزی، آٹا، دال، کباب، تکے، نان، چائے۔

لوگ خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ یوں مصروف تھے جیسے زندگی محض خرید و فروخت ہو۔ کسی کو احساس نہ تھا کہ وہ میدان عرفات میں ہے کہ وہ حج کا دن ہے۔ وہ دن جس کی آرزو میں اس نے برسوں خواب دیکھے تھے۔ سوتے کے جاگتے کے خواب۔

بازار میں بیشتر دکان داروں نے احرام پہن رکھے تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ دکاندار ہونے کے علاوہ زائر بھی تھے۔ عرفات میں دنیاوی اور دینی دونوں کمائیاں کر رہے تھے۔

کیا واقعی طعام میں اتنی طاقت ہے کہ وہ گردوپیش کو بھلا دے؟ کیا طعام اتنی بڑی حقیقت ہے؟

کیا روپیہ کمانا اتنی عظیم خواہش ہے کہ زائر عرفات کے قیام کو بھی منافع کمانے

کے لیے وقف کر دیتا ہے؟ کیا منافع کمانے کی ہوس عرفات میں بھی ہمیں نہیں بخشتی؟ کیا روپے کی ہوس اتنی طاقت ور ہے کہ اس کے سامنے سب کچھ ماند پڑ جاتا ہے؟

میں نے محسوس کیا جیسے وہ بازار ابلیس نے لگا رکھا ہو کہ زائرین کو طعام اور منافع کے جال میں جکڑ لیا جائے۔

جبل الرحمت:

بازار سے باہر نکلا تو وہ گھٹن ختم ہو گئی۔

میرے سامنے ایک دو فرلانگ دور جبل الرحمت کی پہاڑی تھی۔

جبل الرحمت پر لوگ یوں چڑھے ہوئے تھے جیسے گڑ کی بھیلی پر چیونٹیاں چڑھی ہوتی ہیں۔ ابھی بہت سے لوگ جبل الرحمت کی طرف چلے جا رہے تھے۔

نہیں نہیں، میں اس بھیڑ میں نہیں جاؤں گا۔ بھیڑ میں میرا دم گھٹتا ہے۔ اس وقت مجھ پر ایک بے نام سی دیوانگی طاری تھی۔ میرے اندر خوشی کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس احساس پر خوشی کہ میں میدان عرفات میں تھا۔ اور وہ جس کی خدمت میں حاضری دینے کے لیے میں وہاں آیا تھا وہ خود ہمارے ساتھ ساتھ آیا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس خوشی پر اکیلے میں جا کر ناچوں، دھمال کھیلوں ..... کوئی ایسا ڈھول بجاؤں جس کی ضرب سات لاکھ زائرین کے قلب پر پڑے اور وہ سب دیوانہ وار خیموں سے باہر نکل آئیں۔ اپنی اپنی تسبیحیں پھینک دیں، نوافل پڑھنا بھول جائیں اور پھر ہم سب مل کر اس کو ڈھونڈ نکالیں جس کے حکم پر ہم سب وہاں حاضری دینے آئے تھے اور ہمیں حاضری کا حکم دینے کے وہ خود ہم میں شامل ہو گیا تھا اور ہمیں میں چھپا بیٹھا تھا۔

سفید پتھر:

میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ میدان عرفات تو نہ جانے کہاں کس اوٹ میں گم تھا۔ اس میں لگے ہوئے خیمے بھی پتہ نہیں کس نچان میں دبکے ہوئے تھے۔

"کدھر جاؤں" میں نے سوچا۔ کہیں جانے کی کوئی جگہ بھی تو نظر نہیں آتی تھی۔ رہ رہ کر میری نگاہ جبل الرحمت پر گڑے ہوئے سفید پتھر کی طرف اٹھ جاتی۔

یہ سفید پتھر دراصل پتھر کی تراشی ہوئی سل تھا جو قد آدم سے بھی اونچی تھی اور اس پر چونے کی دبیز تہہ چڑھی تھی۔

اس میلی میلی پہاڑی پر وہ سفید پتھر یوں چمک رہا تھا جیسے نیلے آسمان پر سورج چمک رہا ہو۔

رہ رہ کر میری نگاہ اس سفید پتھر پر مرکوز ہو جاتی۔ جی چاہتا کہ جا کر دیکھوں کہ سفید پتھر کیا چیز ہے۔ نہیں نہیں میں اپنے آپ کو سمجھاتا، میں تو میدان عرفات میں حاضری دینے آیا ہوں میں ادھر کیوں جاؤں۔ میں نے سفید پتھر کی طرف سے منہ موڑ لیا۔

پھر نہ جانے کیا، دفعتاً میرے سامنے میدان کی طرف وہی سفید پتھر ابھر آیا۔ میں نے اپنا منہ خیموں کی طرف موڑ لیا۔ ارے وہاں بھی وہی سفید پتھر موجود تھا۔ پھر تو وہ سفید پتھر سارے منظر پر چھا گیا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ جس کی حاضری دینے کے لیے میں میدان عرفات میں آیا تھا، وہ اس پتھر کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔

میں جبل الرحمت کی طرف بھاگا۔ دوڑتا پھلانگتا، بھیڑ کو کاٹتا ہوا، لوگوں کو دھکے دیتا ہوا میں سفید پتھر کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں بہت سے لوگ کھڑے تھے۔

میں نے ایک زائر سے پوچھا: "یہ سفید پتھر کیا ہے؟" اس نے حیرت سے

میری طرف دیکھا، میرے احرام کی طرف دیکھا۔

اس کی نگاہوں میں شکوک جھلک رہے تھے جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو کہ میں مسلمان ہوں۔ پھر نیم حیرت اور نیم غصے سے گویا ہوا "ارے"۔ وہ چلایا "آپ کو اتنا بھی نہیں پتہ کہ یہ سفید پتھر اس مقام کی نشاندہی کر رہا ہے جہاں سرورکائنات ﷺ نے کھڑے ہوکر آخری خطبہ پڑھا تھا"؟

پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ دفعتاً بھیڑ معدوم ہوگئی۔ پہاڑی پر کوئی متنفس نہ رہا۔ میں نے دیکھا خیموں کا شہر ہوا میں تحلیل ہوگیا۔ اس سفید پتھر کے پاس میں اکیلا کھڑا تھا۔ پھر اس سفید پتھر سے ایک کنکر اڑا اور نہ جانے میرے کہاں لگا۔ تڑاخ کی آواز آئی۔ میں ریزہ ریزہ ہوگیا۔ میرا چہرہ گویا مسخ ہوگیا اور میں دھائیں کرکے رونے لگا۔

نہ جانے کب تک میں وہاں روتا رہا۔ پھر دفعتاً میں نے دیکھا کہ میرے اردگرد بھیڑ لگ گئی ہے۔ لوگ میرے طرف دیکھ رہے ہیں، باتیں کر رہے ہیں، ٹھٹھا اڑا رہے ہیں۔ میں اٹھ بیٹھا۔ میں وہاں سے بھاگا اور سفید پتھر سے دور ایک غار نماد کھڈ میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہاں تنہائی تھی۔ شرمندگی، شرمساری محسوس کیئے بغیر میں رو سکتا تھا۔ پتہ نہیں وہاں بیٹھ کر میں کتنی دیر رک رک کر روتا رہا۔

دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ میرے سامنے کچھ دور لوگوں کا ایک جمگھٹا لگ گیا ہے۔ درمیان میں کوئی مولانا قسم کا آدمی وعظ فرما رہا تھا۔ لوگ اس کے اردگرد کھڑے تھے۔ لیکن ان سب کی نگاہیں سفید پتھر پر مرکوز تھیں۔ کوئی وعظ نہیں سن رہا تھا۔

پھر پہاڑی کے پچھواڑے سے ایک معزز آدمی نمودار ہوا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ انداز مین بڑا وقار تھا۔ موڑ مڑ کر دفعتاً اس کی نگاہ سفید پتھر پر پڑی۔ اس کا چہرہ

ریزہ ریزہ ہو گیا۔ وقار کی ملمع اتر گئی۔ سنجیدگی پاش پاش ہو گئی اور وہ ڈھائیں مار مار کر رونے لگا۔

پھر یک لخت اسے احساس ہوا کہ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ بڑی محنت سے پھر سے چہرے پر ضبط بھری سنجیدگی پیدا کی۔ بڑے وقار سے ادھر اُدھر دیکھا۔ لیکن نجانے کیا ہوا، پھر سے اس کا ضبط پارہ پارہ ہو گیا اور وہ ڈھائیں مار مار کر رونے لگا۔

باوقار زائر کے جانے کے بعد ایک اور شخص پہاڑی کے پچھواڑے سے لبیک کے نعرے لگاتا ہوا نمودار ہوا۔

سجدہ سہو:

سفید پتھر کر دیکھ کر وہ رک گیا۔ وہ لبیک پڑھنا یکسر بھول گیا جیسے سفید پتھر کو دیکھ کر اس کی سدھ بدھ ماری گئی ہو۔ پھر اس نے اپنی آستین کے گرد لپٹا ہوا سفید رومال کھولا۔ اسے زمین پر بچھایا، ادھر اُدھر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا اور پھر دھڑام سے سجدے میں گر گیا۔

بڑی دیر کے بعد وہ سجدے سے اٹھا۔ پھر وہ ادھر اُدھر دیکھتا رہا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ جیسے وہ اپنے اس فعل پر ندامت محسوس کر رہا ہو۔ اس کی نگاہ پھر سفید پتھر پر پڑی۔ اس پر پھر وہی کیفیت طاری ہو گئی اور اسی عالم دیوانگی میں اس نے پھر سے رومال بچھایا اور دھم سے سجدے میں گر گیا۔

اس شخص کو دیکھ کر میرے دل میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوئی۔ میں نے محسوس کیا، جیسے وہ کوئی غیر نہ تھا، جیسے وہ میں خود تھا، میں۔ جیسے وہ میرے اندر کا ممتاز تھا۔ بے شک اس میں بھی جھجک موجود تھی چونکہ سجدے سے اٹھ کر وہ چاروں طرف دیکھتا تھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ لیکن میں تو سرتاپا جھجک تھا۔ مجھ میں اتنی جرأت نہ تھی

کہ رومال بچھا کر سجدے میں گر پڑوں۔ حالانکہ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ سفید پتھر محض ایک اوٹ ہے جس کے پیچھے وہ خود چھپا بیٹھا ہے جس کے لیے ہمارے سجدے مخصوص ہیں۔

امریکی ٹریلر:

میری نگاہ سامنے کی طرف اٹھ گئی۔ پگڈنڈی سے پرے ایک ایسی ہی غار نما کھوہ تھی جس میں میں بیٹھا تھا۔ اس کھوہ میں امریکی طرز کا ایک باورچی خانہ لگا ہوا تھا۔ اوون، چولہے، سنک، سب کچھ کیل کانٹے سے لیس۔ کھوہ کے باہر ایک ٹریلر قسم کی کار کھڑی تھی۔

اندر باورچی خانے میں زمین پر ایک قالین بچھا ہوا تھا۔

اس قالین پر ایک صاحب نما آدمی احرام پہنے، زانوئے ادب تہ کیے، گھٹنوں پر ہاتھ رکھے بڑے احترام سے بیٹھا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ نماز ادا کرنے میں مصروف ہے پھر دفعتاً مجھے خیال آیا کہ وہ تو مشرق کی طرف منہ کیے بیٹھا ہے۔ پھر جو میں نے غور سے دیکھا تو اس کی نگاہیں پتھر کا طواف کر رہی تھیں۔

سفید پتھر۔ سفید پتھر۔ سفید پتھر۔

چاروں طرف سفید پتھر چھایا ہوا تھا۔ میدان عرفات پر، جبل العرفات پر، جبل الرحمت پر، زائرین کے دلوں پر، لوگوں کے ذہنوں پر، ان کے جذبات پر۔ بالکل اسی طرح جس طرح مکہ معظمہ پر خانہ خدا کا سیاہ پتھر چھایا ہوتا ہے۔

دفعتاً مکہ معظمہ کا کالا کوٹھا میری نگاہوں میں ابھرا۔ پھر وہ ہوا میں معلق ہو گیا اور سفید پتھر کی طرف بڑھنے لگا۔ سفید پتھر کے قریب پہنچ کر وہ اس کے پہلو میں استادہ ہو گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سیاہ اور سفید پتھر دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔

وقوف:

عین اس وقت زائرین کے انبوہ سے ایک شور اٹھا: "حاضر ہوں اے میرے اللہ میں تیرے حضور حاضر ہوں"۔ سارا میدان لبیک کے نعروں سے گونج اٹھا۔

وہ سب مغرب کی طرف رخ کئے کھڑے تھے اور سورج کی طرف دیکھ رہے تھے جو تیزی سے افق کی جانب گرتا جا رہا تھا۔

جوں جوں وہ سب لبیک پڑھتے ان کا جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا۔ جذبہ جوار بھاٹا بنتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی تسبیحیں بھول چکے تھے۔ تسبیحیں ان کے ہاتھوں میں یوں لٹک رہی تھیں۔ جیسے بے جان ہو چکی ہوں۔ وہ سفید پتھر کو بھول چکے تھے۔ وہ پتھر جو حج سے لے کر اب تک ان کی نگاہوں کا مرکز بنا رہا تھا۔ وہ پتھر جسے وہ عملی طور پر نہ سہی لیکن ذہنی طور پر سجدے کرتے رہے تھے۔ وہ پتھر اب اتنی بڑی بھیڑ میں اکیلا کھڑا تھا...... اکیلا تنہا......

جذبات کا تلاطم بڑھتا جا رہا تھا۔

چاروں طرف چھینٹے اڑ رہے تھے...... تقدیس بھرے چھینٹے۔ احترام کے فوارے اچھل رہے تھے۔ اس بڑھتے جوش و خروش کی وجہ سے زائرین پر دیوانگی کا عالم طاری ہوتا جا رہا تھا۔ ایسی دیوانگی جس پر لاکھوں فرزانگیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔

سیاہ و سفید:

یہ "سب کیا ہے؟" میں نے سوچا۔ اتنے بڑے ہجوم کی اتنی فوری کایا پلٹ بے وجہ کایا پلٹ۔ یہ کایا پلٹ کیسے عمل میں آئی۔ اس کا محرک کیا تھا۔ کون تھا؟

"یہ قیام ہے"۔ میرے دل سے آواز بلند ہوئی۔ "قیام"

"یہ حج کا وقوف ہے" ۔قریب ہی سے آواز آئی۔

میں نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا۔ یہ قیام خالی تو نہیں، یہ قیام خلا تو نہیں۔ یہ قیام تو جذبے کی مد سے بھرا ہوا ہے۔ یہ قیام تو اک طوفان ہے۔ لیکن...... لیکن خلا کیسے پر ہو گیا۔ کس نے اس قیام کو بھرپور بنا دیا۔ اس قیام کا مرکز کیا ہے ڈوبتا سورج؟ نہیں نہیں ڈوبتا سورج تو کبھی روح میں جوار بھاٹا پیدا نہیں کر سکتا۔ ڈوبتا کیا، چڑھتا سورج بھی جذبے کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ یہ سورج جو دن رات کی پابندی میں مقید ہے، یہ بے چارا کیا مرکز بنے گا۔ میں نے تحقیر سے سورج کی طرف دیکھا۔

میری نگاہوں تلے سورج ادب واحترام سے پیچھے ہٹ گیا۔ دو پتھر ابھرے۔ کالا اور سفید پتھر۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے تھے اور پھر وہ بڑھ کر سارے میدان پر مسلط و محیط ہو گئے۔

جمرۃ الباطنیہ

اندھیرا چھائے جا رہا تھا۔

سامنے میدان عرفات کا لق و دق ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔

ہم چاروں پتھر پر سرنگوں بیٹھے تھے۔ قدرت، ڈاکٹر عفت، عرب موٹر ڈرائیور اور میں۔ پاس ہی ہماری سیاہ رنگ کی لمبی کار کھڑی تھی۔

میدان عرفات میں سامنے ایک گیس جل رہا تھا جس کے اردگرد چار ایک ایک ہی قسم کے زائرین بیٹھے ہوئے تھے۔

وقوف اور خروج:

قریب ہی ایک شور برپا تھا، جیسے آبشار گر رہا ہو۔ یہ شور زائرین کے عمل اخراج کی وجہ سے تھا۔ زائرین میدان عرفات سے نکل بھاگنے کے لیے اس قدر مضطرب تھے کہ ہمیں یہ شک پڑنے لگا کہ میدان عرفات غروب آفتاب تک قیام کرنے کی شرط نہیں بلکہ غروب آفتاب سے پہلے اخراج کا حکم ہے۔

میدان عرفات میں غروب آفتاب سے پہلے ہی ایسی بھگدڑ پڑ جاتی ہے جس میں شدت بھری دیوانگی کا عنصر ہوتا ہے۔ خیمے اکھاڑ لیے جاتے ہیں، سامان باندھے جاتے ہیں، ٹرک سامان سے لاد دیئے جاتے ہیں۔

غروب آفتاب سے بہت پہلے زائرین ذہنی طور پر پابہ رکاب ہو جاتے ہیں۔ وقوف کی دعاؤں کی محویت میں فوری اخراج کے لیے بے تابی کا کانٹا لگ جاتا ہے۔ ایک نظر وقوف پر مرکوز ہوتی ہے دوسری اخراج پر۔ وقوف کی قند میں اخراج کا نمک شامل ہوتا رہتا ہے۔ پتہ نہیں یہ گنگا جمنی کیفیت کیوں پیدا ہو جاتی ہے۔ شاید منفی طاقتوں نے حاضری کو اغواء کرنے کے لیے یہ انوکھا طریقہ ایجاد کیا ہو۔

بہر حال نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادھر آفتاب غروب ہوا ادھر آٹھ دس لاکھ زائرین میں فوری اخراج کی خواہش جھکڑ بن کر چلنے لگی۔ ایک عجیب قسم کی نفسانفسی، ایک پریشان اضطراب "تو" سے سرشار ہونے کی غرض سے اتنی دور سے چل کر آنے والے زائرین اس نفسانفسی کی گھمنگیری میں پڑ کر گویا بکروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور سارا میدان عرفات ان کی "مَیں مَیں" سے گونجنے لگتا ہے۔ میرا سامان کدھر ہے؟ میرا کمبل کیا ہوا؟ میرا ٹرنک کون اٹھا کر بس تک لے جائے گا؟ میری گھڑی؟ میرا لوٹا، میرا تالہ۔

تعجیل:

پھر ہجوم مست ہاتھی کی طرح آگے بڑھتا ہے۔ ہر زائر چاہتا ہے کہ فوراً میدان عرفات سے نکل جائے۔ ہر ایک، دوسرے سے آگے نکل جانے کے لیے بے تاب ہے۔ دوسرا تیسرے پیچھے دھکیلنے کی کوشش میں لگا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی میدان عرفات سے باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ نکلنے کا راستہ اس دیوانگی، نفسانفسی اور تعجیل کی وجہ سے جام ہو جاتا ہے۔

گھنٹوں کوئی باہر نہیں نکل سکتا۔ اس بے بسی کے عالم میں موٹریں گھاؤں گھاؤں کرتی ہیں۔ زائرین کے دل دھک دھک کرتے ہیں اور پٹرول کے مرغولے اندھیرے کو اور بھی اداس بنا دیتے ہیں اور پھر میدان عرفات سے خوف آنے لگتا ہے۔

ہم چاروں چپ چاپ بیٹھے اس شوروغوغا کو سن رہے تھے۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے پاس ہی مکھیوں کا چھتہ چھڑا ہوا ہو۔

میں نے قدرت سے کہا "یہ آوازیں سب رہے ہیں آپ؟"

"ہاں" وہ بولے۔

''عجیب سا شور ہے جیسے جھگڑ چل رہا ہو''۔

''ہاں تعجیل بذاتِ خود ایک جھگڑ ہے''۔

''تعجیل کیا ہوتی ہے؟''

''عجلت، اللہ تعالیٰ نے عجلت سے منع فرمایا ہے''۔

''عجلت تو آج کے دور کی خصوصیت ہے۔ جلدی اور جلدی، جلدی جائیں، جلدی پہنچیں، جلدی لوٹیں، جلدی جئیں، جلدی مریں''۔

''ہاں۔'' وہ بولے ''قیام ایمان پیدا کرنے میں حمد ہوتا ہے۔ عجلت تذبذب پیدا کرتی ہے۔''

''ان سب کا خیال ہے کہ اگر غروب آفتاب کے فوری بعد اخراج نہ ہوا تو حج فسخ ہو جائے گا۔ کیا یہ اعتبار درست ہے؟''

''غروب آفتاب کے بعد POINT OF TIME نہیں PERIOD OF TIME ہے۔ اللہ کے احکامات مبہم نہیں ہوتے''۔

''تو یہ تعجیل غلط فہمی کی وجہ سے ہے؟''

''چاہے غلط فہمی ہو یا کچھ، بہر صورت اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اس وقت کی تعجیل اللہ کا حکم بجالانے کے شوق کی وجہ سے ہے۔ اسے تحقیر کی نظر سے دیکھنا اچھا نہیں۔ ان سب میں لگن ہے، جذبہ ہے''۔

''آپ تو کہا کرتے ہیں OVER ENTHUSIASM قابل ستائش نہیں؟''

''ہاں لیکن اسے برا بھی نہیں کہا جا سکتا۔''

دفعتاً ڈاکٹر عفت ہنسنے لگی ''YOUR LORDSHIP'' وہ بڑی سنجیدگی اور ادب سے بولی ''آپ زائرین پر جج بنا کر بھیجے گئے ہیں نا''۔

دور سے قہقہہ سنائی دیا۔ روشن گیس تلے بیٹھے ہوئے چپی نما زائرین قہقہے لگا رہے تھے۔ پتہ نہیں وہ کس بات پر ہنس رہے تھے۔ میری کوتاہ نظری پر یا ڈاکٹر عفت کی وسعت نگاہ پر۔

پھر میری نگاہ تلے وہ جلتا ہوا گیس گھومنے لگا اور گھومتے گھومتے دفعتاً سفید منور پتھر میں بدل گیا۔ وہی سفید پتھر جو شام کے وقت جبل الرحمر پر استادہ تھا۔ اس مقام پر استادہ تھا جہاں سے اٹھ کر آخری رسولؐ نے اپنا آخری خطبہ اپنی امت کو عطا فرمایا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں جیب کا رومال بچھا کر اس منور پتھر کے روبرو سربسجود ہو جاؤں۔

پھر چاروں طرف سے رات کی سیاہی نے منور پتھر کی طرف یورش کر دی۔ گویا سارا گرد و پیش سیاہ پتھر کا بنا ہوا کوٹھا بن گیا۔ اس کالے کوٹھے میں وہ سفید منور پتھر دل کی طرح دھڑک رہا تھا۔

مزدلفہ:

پتہ نہیں ہم کس وقت مزدلفہ پہنچے۔ پتہ نہیں مزدلفہ شہر تھا، گاؤں تھا یا کوئی پڑاؤ تھا۔ ہماری موٹر رکی تو سامنے ویرانے میں ایک ٹیلے کا ایک نشیب پھیلا ہوا تھا۔ رات کے اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ آٹھ لاکھ زائرین کہاں تھے۔

جہاں ہم اترے وہاں پندرہ بیس زائرین نماز پڑھنے کی تیاری میں مصروف تھے۔ ہم جلدی سے ان کی صف میں جا کھڑے ہوئے نماز کے بعد۔ وہ سب اس ویران اور اندھیرے نشیب پر بکھر گئے۔ پھر اندھیرے سے دو ایک آوازیں سنائی دیں "بھائیو کنکریاں چن لو"۔

"کنکریاں حساب سے چننے گا" ۔قدرت نے کہا۔

پہلے صرف سات کنکریاں جمرۃ العقبہ کو مارنی تھیں، اور باقی دو دن تینوں جمروں کو کنکریاں مارنے کا عمل دہرانا تھا۔ یعنی پہلے دن صرف سات، دوسرے اور تیسرے دن اکیس فی دن یعنی کل ۴۹ کنکریاں فی کس۔ احتیاطاً ہر کس تقریباً ساٹھ ستر کنکریاں چننے میں مصروف تھا یعنی اس وقت مزدلفہ کی پہاڑی سے آٹھ لاکھ زائرین چھ کروڑ کنکریاں چن رہے تھے۔

کنکریاں:

مزدلفہ کی پہاڑی کنکریوں کی پہاڑی ہے۔ اس کے باوجود کنکریاں چننے میں خاصی دیر لگ رہی تھی، جب کسی چیز کی بہتات ہو تو انسان چناؤ پر مائل ہو جاتا ہے، زائرین سائز کے حساب سے کنکریاں چن رہے تھے، بڑی نہ ہوں گول ہوں، ایک سی ہوں۔

پتہ نہیں کیوں کسی، ان جانی خواہش کے تحت میں بہت چھوٹی کنکریاں چننے میں مصروف تھا۔ شاید اس لیے کہ بہت چھوٹی اور ایک سی کنکریاں چننے میں بہت وقت درکار تھا اور یوں بچوں کی طرح بنٹے اکٹھے کرنے میں میں نے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کا بہانہ بنالیا تھا۔ یا شاید میں زیادہ بوجھ اٹھانے کی کوفت سے اپنے آپ کو بچا رہا تھا۔ یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں شیطان کو زیادہ ایذا پہنچانے سے گریز کر رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ ماضی میں ہمارا گہرا یارانہ رہا تھا۔ اور اب میں کس منہ سے اسے پتھر مارتا۔

حضرت عیسیٰ نے فرمایا تھا "اس فاحشہ عورت کو پہلا پتھر وہ مارے جس نے زندگی میں کبھی گناہ نہ کیا ہو"۔ شاید یہ بات میرے لاشعور میں کانٹا بن کر لگی ہو یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مجھے احساس تھا کہ شیطان کتنا منتقم واقع ہوا ہے اور مجھ پر اس کے انتقام کا خوف طاری تھا۔

ایک روز حرم شریف میں بیٹھے ہوئے میں نے قدرت سے کہا تھا: "یہاں حاضری دینے کے کوئی اثرات مرتب نہیں ہوئے۔ کیا یہ میری نااہلیت کی وجہ سے ہے؟"

رجعت:

قدرت بولے "یہاں حاضری دینے کے اثرات واپسی کے بعد مرتب ہوتے ہیں۔"

"کیا وہ آپ ہی آپ محسوس ہوتے ہیں؟"

"ہاں"۔

"کیا وہ لازماً مثبت ہوتے ہیں؟"

"ضروری نہیں"۔

"منفی بھی ہو سکتے ہیں؟"

"ہاں۔ مگر عام لوگوں کے لیے نہیں، صرف ان کے لیے جنھیں مقام حاصل ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر کہا۔

"کئی بار رجعت یعنی REVERSTION عمل میں آتی ہے۔"

"آپ کا مطلب REVERSE GEAR لگ جاتا ہے؟" "ہاں"۔ وہ بولے

"REVERSE GEAR تو صرف اسی صورت میں لگ سکتا ہے جب آپ آگے بڑھ چکے ہوں...... بڑھ رہے ہوں"۔

"ہاں"۔ وہ بولے "بہت سے اللہ والے حج پر آنے سے خائف ہوتے ہیں۔ وہ ڈرتے ہیں کہ ان کا مقام چھن نہ جائے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ریورس گیر

نہ لگ جائے۔ اللہ والوں کے لیے حرم میں حاضری ایک امتحان ہوتا ہے۔ جس طرح عام لوگ جوتا اتار کر حرم کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ اسی طرح اللہ والے اپنا مرتبہ اور مقام کا عمامہ حرم شریف کی ڈیوڑھی سے باہر اتار کر عام آدمی کی حیثیت سے اندر داخل ہوتے ہیں، اور کوئی فرد یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ جب وہ باہر نکلے گا تو اس کا عمامہ، مقام یا مرتبہ اسے واپس مل جائے گا''۔

''اللہ والوں کی بات نہیں، عام آدمی کی بات بتائیے''۔ میں نے پوچھا ''کیا عام آدمی کی REVERSTION کا بھی خطرہ ہو سکتا ہے؟''۔

''شاید''۔

''جس نے کبھی آگے قدم ہی نہیں اٹھایا اسے REVERSE GEAR کیا لگے گا۔ پیچھے ہٹنے کی گنجائش بھی ہو''۔

''جس طرح آگے بڑھنے کے امکانات کی کوئی حد نہیں ہوتی اسی طرح پیچھے ہٹنے کی گنجائش کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔'' قدرت نے جواب دیا۔

مزدلفہ میں کنکر چنتے ہوئے میرے ذہن میں قدرت کا وہ فقرہ گونج رہا تھا ''پیچھے ہٹنے کی گنجائش کبھی ختم نہیں ہوتی، پیچھے ہٹنے کی کوئی حد نہیں''۔

چھوٹی اور چھوٹی:

تینوں جمرے میرے روبرو کھڑے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے ریورس گیر مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ ان کی نگاہوں میں خوفناک عزائم جھلک رہے تھے۔ میرے چناؤ کا رجحان مزید خفیف کنکریوں کی طرف مائل ہوتا جا رہا تھا۔ اور چھوٹی اور چھوٹی ...... مزدلفہ پر چھایا ہوا اندھیرا سمٹ سمٹ کر کالے کوٹھے کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا اور منڈیر پر کوٹھے کا والی مسکرا رہا تھا۔

''اے کائنات کے والی!'' میں نے عرض کی ''جب تیرے حکم کے بغیر پتا بھی

نہیں ہل سکتا تو یہ ریورس گئیر لگانے والا کون ہے؟ میں اس سے کیوں ڈر رہا ہوں؟"

کوٹھے کے والی کی مسکراہٹ اور ہمہ گیر ہو گئی۔

نہ جانے اس مسکراہٹ میں کیا بات تھی۔

دفعتاً میں نے شدت سے محسوس کیا کہ اس وقت مزدلفہ کی پہاڑی پر آٹھ لاکھ بچے بنٹے چن رہے تھے تا کہ منیٰ میں جا کر جمروں کے نشانے لگائیں۔ بے شک وہ اپنے اللہ کا حکم بجا لا رہے تھے۔ لیکن کسی نے سوچا نہ تھا کہ اس میں کیا حکمت پنہاں ہے۔ پتھر مارنے کے فعل میں تواتر کیوں ہے۔ اور کیا یہ تواتر تین دن کے بعد ختم ہو جاتا ہے؟

کنکریاں چننے کے بعد زائرین پہاڑی کے ڈھلان پر بکھر گئے۔ اپنی اپنی دریاں زمین پر بچھا لیں، چادریں لپیٹ لیں اور اپنے اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے۔

پہاڑی کے پیچھے مدھم اور بے جان سا چاند نہ جانے کہاں لٹکا ہوا تھا۔ پہاڑی کے اس ڈھلان پر جہاں ہم بیٹھے تھے، اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس اندھیرے میں زائرین یہاں وہاں بیٹھے یا لیٹے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں وہ عبادت میں مصروف تھے یا سفر کی کوفت کی وجہ سے تھک کر پڑ گئے تھے۔

قدرت اور ڈاکٹر عفت کچھ دیر تو بیٹھے رہے۔ پھر وہ دونوں لیٹ گئے۔

"آپ لیٹ گئے؟" میں نے قدرت سے پوچھا۔

"ان کی طبیعت اچھی نہیں۔" ڈاکٹر عفت نے جواب دیا۔

"ان کی طبیعت بڑی موقع شناس ہے"۔ میں نے کہا۔

"کیوں؟" وہ بولیں۔

"یہ تو کہتے تھے کہ مزدلفہ کی رات عبادت کی رات ہوتی ہے"۔

"ہاں ہوتی ہے۔لیکن جب طبیعت ہی ناساز ہوتو......؟"

قدرت کی ناسازی طبع کا راز میں آج تک نہیں سمجھ پایا۔صرف قدرت ہی نہیں چند ایک اور لوگ بھی ہیں جن کی ناسازی طبع میرے لیے معمہ بنی رہی ہے۔

جان محمد بٹ:

مثلاً میرے اولین بنادی کرم فرما بھائی جان، جان محمد بٹ صاحب ہیں۔ان کی زندگی گویا ناسازی طبع کے محور پر گھومتی ہے۔ میں انہیں گذشتہ سترہ سال سے جانتا ہوں۔ان سترہ سالوں میں بمشکل چند ایک گنتی کے دن ہوں گے جب ان کی طبیعت ناساز نہ تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے شک پڑنے لگا کہ ان کی ناسازی طبع ہماری ناسازی طبع سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔اب مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ناسازی طبع کے بغیر بھائی جان کے لیے حرکت ممکن نہ ہو، جیسے حرکت ان کا مقصد حیات ہو جس کے لیے ناسازی طبع پیدا کرنا ازبس ضروری ہو۔

بھائی جان کی اس ناسازی طبع کی نوعیت کا اندازہ اس تفصیل سے لگ سکتا ہے کہ وہ اس کا سدباب کرنے کے لیے دل کو طاقت دینے والی دوا کورامن کا استعمال کرتے ہیں اور کورامن کی پوشی شیشی چار دنوں میں ختم کر دیتے ہیں۔

میرے ایک عزیز دوست اور ساتھی راجہ شفیع کو بھی بھائی جان سے عقیدت تھی۔ایک مرتبہ مارکیٹ میں طاقت والی کورامن کا توڑا ہوگیا بھائی جان نے راجہ کو کہا کہ ہمیں ہر چوتھے دن کورامن کی ایک شیشی درکار ہوتی ہے۔راجہ نے اپنے کیمسٹ دوست سے بات کیمسٹ یہ سن کر گھبرا گیا۔کہنے لگا "کورامن کی شیشی تو مہینوں چلتی ہے اور چونکہ زہریلی دوا ہے جو شخص اسے چار دن میں ختم کر دے وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔" راجہ صاحب اس کیمسٹ کو بھائی جان کی خدمت میں لے گئے۔ بھائی جان نے بڑی معصومیت سے کہا "جی ہماری کورامن کی شیشی تو صرف چار دن

چلتی ہے" کیمسٹ کی آنکھیں ابل کر باہر نکل آئیں لیکن بھائی جان کی معصومیت جوں کی توں قائم رہی جیسے وہ کورامن کی شیشی نہیں بلکہ ٹافیوں کے پیکٹ کی بات کر رہے تھے۔

قدرت کو جب بھی انجائنا کا دورہ پڑے تو کہا کرتے تھے: "گھبرانے کی بات نہیں مفتی صاحب، اگر برتن پر زیادہ دباؤ پڑ جائے تو وہ تڑخ جاتا ہے۔ میں ذرا تڑخ گیا ہو۔ ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

مجھے شک پڑتا ہے کہ وہ التزاماً برتن پر زیادہ دباؤ ڈالتے ہیں تا کہ تڑخ جائے۔ تڑخنے میں ایک لذت ہے، ایک کیفیت۔ اس کیفیت میں لذات اور اذیت یوں ملے جلے ہوتے ہیں کہ یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کہاں لذت ختم ہوئی اور اذیت شروع ہوگئی، کہاں اذیت ختم ہوئی اور لذت شروع ہوگئی۔ اس حقیقت کو تو نفسیات کے مشاہیر بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ECTASY اور PAIN کا ازلی ناطہ ہے۔

میں نے قدرت سے کہا: "ایک بات پوچھوں؟"

انہوں نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"کیا آپ کوشش کر کے تڑختے ہیں؟"

انہوں نے سر نفی میں ہلا دیا۔

"کیا آپ میں تڑخنے کی خواہش ہے؟"

"نہیں"۔

"کیا تڑخنے میں لذت کا احساس ہے؟"

"لذت بھی ہے" وہ بولے۔

"تو آپ لذت حاصل کرنے کے لیے تڑختے ہیں"۔

"حصول لذت سب سے بڑی دیوار ہے"۔ وہ بولے اور......

"بس بس" ڈاکٹر عفت بولیں "کوئی بحث نہیں ہو گی، انہیں اب سونے دیجئے۔"

واپسی:

پو پھٹتے ہی موٹر ڈرائیور نے ہمیں جگا دیا اور نماز پڑھنے کے بعد موٹر میں سوار ہو کر منیٰ کی طرف چل پڑے۔

دفعتاً قدرت چلائے: "کنکریاں۔ کنکریاں بھول تو نہیں آئے؟"

"ارے"! میں نے گھبراہٹ میں ادھر اُدھر دیکھا۔

"یہ رہیں"۔ ڈاکٹر عفت نے کنکریوں کی پوٹلی نکالی۔ ڈاکٹر وہ پوٹلی اس طرح کلیجے سے لگا کر رکھی ہوئی تھی جیسے وہ کنکریاں پتھر کی نہیں بلکہ سونے کی بنی ہوں، جیسے مزدلفہ سے نہیں بلکہ افریقی کی کسی سونے کی کان سے آ رہے تھے۔

صرف ڈاکٹر عفت ہی نہیں، تمام زائرین کنکریوں کی پوٹلیاں سینے سے لگائے بیٹھے تھے۔ وہ بار بار پوٹلیاں کھولتے، کنکریاں گنتے کہ کہیں کم تو نہیں ہو گئیں۔ بار بار پوٹلیوں کو سنبھالتے۔

جب ہم منیٰ کے قریب پہنچے تو موٹر رک گئی۔ دیر تک رکی رہی۔ میں موٹر سے اترا کہ دیکھوں بات کیا ہے۔ دیکھا تو سینکڑوں بسوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ منیٰ کے موڑ پر جہاں بہت سی سڑکیں ملتی ہیں ٹریفک جام ہو رہی تھی۔

میں نے واپس آ کر قدرت سے کہا "یہ ٹریفک جام تین چار گھنٹوں سے پہلے صاف نہ ہو گا۔" اس مقام سے منیٰ صرف چار ایک فرلانگ دور تھا اور فندق الکعکی کا خیمہ زیادہ سے زیادہ ایک میل ہو گا اس لیے ہم نے پیدل چلنے کا فیصلہ کر لیا۔

جب مجھے یہ علم ہوا کہ ہمیں منیٰ میں تین دن قیام کرنا ہے تو میں گھبرا گیا۔ منیٰ

کی اضطراب بھری اداسی نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اب کیا ہو گا، میں نے سوچا۔ اس وسوسوں بھرے شہر میں تین دن کیسے گزریں گے۔

میرے سامنے منیٰ کے ہوٹل والے بزرگ آ کھڑے ہوئے: ''یہ منیٰ ہے بھائی صاحب!'' وہ بولے ''انتشار کا شہر، تذبذب کا شہر، الحاد کا شہر...... پچھلی بار تو اندھے کے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹی تھی، اب کی بار پتہ نہیں کیا ہو جائے''۔

میں چونک پڑا! ''یا اللہ کوئی ایسی صورت بنا دے کہ منیٰ کا قیام منسوخ ہو جائے''۔ میرے دل سے منت بھری التجا نکلی ''یا اللہ کام بنانے والے''۔

سڑک سے پیدل چل کر آنے کی وجہ سے قدرت کی طبیعت اور بھی ناساز ہو گئی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ جا کر پوچھوں اب کیا حال ہے لیکن میں ڈرتا تھا۔ قدرت سے نہیں، منیٰ سے ڈرتا تھا۔

نہیں، نہیں، میں نہیں جاؤں گا۔ میں قدرت کے خیمے میں نہیں جاؤں گا۔ منیٰ کے قیام کے دوران میں قدرت سے ملوں گا ہی نہیں۔

لیکن اگر قدرت میرے خیمے میں آ گئے تو......؟ کیوں نہ میں اپنے خیمے سے باہر چلا جاؤں، شہر میں گھوموں پھروں۔ منیٰ کے اثرات کا جائزہ لوں۔ جمروں کو جا کر کنکر ماروں۔ میں جانے کے تیار ہونے لگا۔ تیار ہوتے ہوئے رہ رہ کر میرے دل میں خیال آتا تھا۔

دعا:

میرے اللہ! یہ منیٰ کا قیام خیریت سے گزر جائے۔ یا اللہ! میں ایک کمزور آدمی ہوں۔ مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں ہے اور یہ جمرے جو تو نے اس شہر پر مسلط کر رکھے ہیں، یہ بہت فعال ہیں، بہت طاقتور ہیں۔ میں ان سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یا اللہ اگر تو میرے لیے منیٰ کا وقوف منسوخ کر دے تو تیرا کیا جائے گا۔ تجھے پوچھنے والا

کون ہے؟

یہ دعا نہیں تھی، یہ تو میں تیار ہوتے ہوئے کوٹھے کے والی سے باتیں کر رہا تھا۔ برسبیل تذکرہ قسم کی باتیں۔

مجھے دعا مانگنی نہیں آتی، میں صرف دعا پڑھا کرتا ہوں۔ قرآن کریم میں بہت سی دعائیں ہیں لیکن انہیں پڑھتے وقت مجھے کبھی شعور نہیں ہوا کہ وہ دعائیں ہیں۔ میں نے زندگی میں بارہا سورۃ الحمد پڑھی ہے لیکن کبھی اللہ سے یہ درخواست نہیں کہ اے اللہ مجھے سیدھا راستہ دکھا بلکہ کئی ایک بار ایسا ہوا ہے کہ اھدنا الصراط مستقیم پڑھتے ہوئے دفعتاً مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں اللہ کے حضور کیا عرض کر رہا ہوں۔ پھر مجھ پر خوف طاری ہو جاتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اسے دعا سمجھ کر منظور فرمالیں اور مجھے سیدھے راستے پر چلا دیں تو کیا ہو گا۔

نہیں، نہیں میرے مولا میں دعا نہیں مانگ رہا، میں تو دعا پڑھ رہا ہوں۔ آیت پڑھ رہا ہوں۔ نماز پڑھ رہا ہوں۔ فرض ادا کر رہا ہوں، تو تو جانتا ہے۔ تو تو سمجھتا ہے۔

میرے مولا کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ میں دعا مانگ رہا ہوں۔ کہیں دعا سمجھ کر اسے منظور نہ کر لینا۔ کہیں مجھے صراطِ مستقیم کا پابند نہ کر دینا۔ بے شک صراط مستقیم بڑی عظیم چیز ہے، لیکن ابھی نہیں۔ ابھی کچھ دیر کے لیے مجھے جی لینے دے۔

زندگی میں میں چند ایک بار مسجد بھی گیا ہوں اور وہاں میں نے جناب امام مسجد کو بڑی لمبی چوڑی دعائیں پڑھتے ہوئے سنا ہے جن پر میں نے جملہ نمازیوں کے ساتھ آمین آمین بھی کہا ہے، لیکن وہ آمین میں یوں کہا کرتا ہوں جس طرح کسی سیکشن آفیسر کے پروپوزل پر ڈپٹی سیکرٹری ''نو آبجکشن'' کا اظہار کرتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دعا کے عمل میں دعائیہ جملے کی نہیں بلکہ مانگنے کے فعل کی

اہمیت ہوتی ہے۔اور مانگنے میں منت ہوتی ہے، احساس بے بسی ہوتا ہے، ندامت ہوتی ہے، رقت ہوتی ہے اور جس سے مانگا جائے اس کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔

باقی تُو جانے:

لاہور میں نور بابا کے ڈیرے پر ہر آنے والے کی خدمت میں گوشت روٹی پیش کی جاتی ہے۔بابا کے ڈیرے کا گوشت بہت عمدہ اور لذیذ ہوتا ہے۔

ایک دن نور ڈیرے کو گوشت مہیا کرنے والے قصائی کی ماں اور بیوی بھاگی بھاگی بابا کے پاس آئیں۔کہنے لگیں "بابا جی چل کر اپنے قصائی کا منہ دیکھ لیجئے۔وہ آخری دموں پر ہے"۔

جب بابا قصائی کے گھر پہنچے تو اس کی حالت غیر تھی۔قصائی کی حالت کو دیکھ کر بابا سرسری انداز میں بولے:

"یا اللہ! یہ قصائی ہمیں اچھا گوشت دیتا ہے اور تیرے بندے اسے کھاتے ہیں۔تو اگر اسے زندگی دے دے تو تیرے بندوں کو ڈیرے پر اچھا گوشت کھانے کو ملے گا اور تجھ سے پوچھنے والا کوئی ہے نہیں۔باقی تو جانے تیرا کام جانے"۔

اسی شام قصائی ڈیرے پر آیا اور بولا: "بابا جی! اللہ نے فضل کر دیا۔میں اچھا ہو گیا ہوں"۔

شیخ سعدی:

پھر وہ شیخ سعدی کا واقعہ ذہن میں آ گیا:

شیخ سعدی سفر کر رہے تھے۔ساتھ ان کا گدھا تھا۔ایک گاؤں میں پہنچے تو رات پڑ گئی۔سردی کے دن تھے۔رات بسر کرنے کا ٹھکانہ تلاش کرنے لگے۔گاؤں

والوں میں سے کوئی ٹھکانہ دینے پر رضامند نہ ہوا۔ آخر ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ گھر والے نے کہا: "میری بیوی دردزہ میں تڑپ رہی ہے، بچہ نہیں ہوتا۔ اگر تو دعا کرے تو جگہ دے دوں گا"۔ شیخ سعدی مان گئے۔ انہیں کمرہ مل گیا۔ پھر انہوں نے کاغذ کے ایک پرزے پر ایک تعویز لکھا اور گھر والے سے کہا "اسے مریضہ کی ناف پر باندھ دے۔ تعویز باندھتے ہی بچہ ہو گیا۔

اگلی صبح شیخ سعدی تو چلے گئے لیکن گاؤں والوں نے تعویز سنبھال کر رکھ لیا۔ جب بھی کسی گاؤں والی کو زچگی کی تکلیف ہوتی تو وہ وہی تعویز لے جا کر باندھ دیتے۔ تکلیف رفع ہو جاتی۔

گاؤں کے مولوی کو اس بات پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے سوچا کہ اگر تعویز پر لکھی ہوئی آیت کا پتہ چل جائے تو اسے بڑا فائدہ ہو گا۔ مولوی نے جھوٹ موٹ کا بہانہ تراشا اور تعویز مانگ کر لے گیا۔ اسے کھولا تو لکھا تھا:

"یا اللہ! میں اور میرا گدھا اب آرام سے ہیں۔ ٹھکانہ مل گیا ہے۔ باقی تو جانے اور تیرا کام جانے"۔

صحیح فریکوئنسی:

ایک دن میں نے قدرت سے پوچھا: "دعا کیا چیز ہے؟"

"دعا صحیح FREQUENCY کو جاننے اور اس سے ہم آہنگ ہونے کا نام ہے۔ اگر آپ کا RECEIVER اور TRASMITTER ٹھیک ہوں تو دعا ایک میکانکی عمل ہے۔ پھر نا منظوری کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا"۔

پتہ نہیں اس روز منیٰ میں خیمے میں گھومتے پھرتے ہوئے اپنے اللہ سے سرسری باتیں کرتے کرتے اتفاقاً میرے اندرونی ٹرانسمیٹر نے صحیح WAVE LENGTH کیسے پکڑ لی کہ کوٹھے کے والی سے میری سرسری بات دعا بن گئی۔

ابھی میں تیار ہو رہا تھا کہ قدرت میرے خیمے میں داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ غنی تھا۔ وہ آفیسر جو سعودی عرب کی حکومت کی طرف سے شہاب صاحب سے رابطہ رکھنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔

''آپ قربانی دینا پسند کریں گے؟'' قدرت نے مجھ سے پوچھا۔

''اس میں پسند اور ناپسند کا کیا سوال ہے؟'' میں نے جواب دیا

''حاجیوں کی بھاری اکثریت قربانی دیتی ہے''۔ وہ بولے ''اگرچہ یہ امر مرضی پر موقوف ہے''۔

''تو میں بھی دوں گا''۔ میں نے کہا ''یہ میری زندگی کی پہلی قربانی ہوگی''۔

''کیا آپ اپنے ہاتھوں سے قربانی دینا پسند کریں گے؟''

''میں سمجھا نہیں؟''

''میری طبیعت اچھی نہیں'' قدرت نے کہا ''میں نے غنی صاحب کو رقم دے دی ہے، یہ قربانی کا انتظام کر دیں گے۔ اگر آپ خود قربانی کرنا چاہتے ہیں تو غنی صاحب کے ساتھ قربان گاہ میں چلے جایئے ورنہ انہیں رقم ادا کر دیجیے''۔

میں نے قربانی کی رقم غنی صاحب کے حوالے کر دی۔

غنی کے جانے کے بعد قدرت بولے: ''ہمارا ارادہ ہے کہ مکہ شریف میں جا قیام کریں۔ حج کے ارکان اور واجبات ادا کرنے کے لیے ہم روز منیٰ آ سکتے ہیں۔ آپ چاہیں تو ہمارے ساتھ مکہ معظمہ چلیں، چاہیں تو یہیں رک جائیں، جیسے آپ کی مرضی''۔

میرا تجربہ ہے کہ جب کبھی ہماری دعا قبول ہو جائے تو ہمیں اس بات پر خوشی نہیں ہوتی کہ دعا قبول ہو گئی اور خوشی نہ ہو تو احساس شکر گزاری پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ الٹا ہمیں یہ غم لگ جاتا ہے کہ قبولیت کے اس لمحے میں ہم نے کچھ

اور کیوں نہ مانگ لیا۔

لیکن اس روز منیٰ میں پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ میری دعا قبول ہوگئی۔ منیٰ کا قیام میرے لیے اللہ نے منسوخ کر دیا۔ میرا دل شکر گزاری کے جذبات سے چھلک اٹھا۔

میرے دل سے جمروں کا خوف دور ہو گیا۔ اگر منیٰ پر جمروں کا تسلط ہے تو پڑا ہو، میرے اللہ بھی تو منیٰ میں موجود ہیں۔

میں نے خوشی خوشی کنکریوں کی پوٹلی اٹھائی اور جمروں کی طرف چل پڑا۔

منیٰ کا بازار کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ زائرین کے جوش و خروش میں تقدیس کا عنصر نہ تھا بلکہ خالی شدت تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ پتھر مارنے کے جا رہے تھے۔ انہوں نے کنکریوں کی پوٹلیاں سینے سے لگا رکھی تھیں۔ ان کی بھویں تنی ہوئی تھیں، ماتھوں پر تیوریاں تھیں۔ آج پہلی مرتبہ انہیں انتقام لینے کا موقع ملا تھا۔ اس سے انتقام لینے کا موقع جس نے زندگی بھر انہیں بہکایا تھا، ان کے دلوں میں وسوسے پیدا کیے تھے، شر کا خمیر اٹھایا تھا۔

کئی ایک زائرین تو جوش میں آستین چڑھا رہے تھے۔ کئی پہلوانوں کی طرح اپنے بازو ٹھونک رہے تھے۔

انتقامی غیظ و غضب:

جوں جوں جمرۃ العقبہ قریب آتا گیا، زائرین کا شور بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ جب جمرہ کے پاس پہنچا تو غیظ و غضب کا عجیب منظر نظر آیا۔ زائرین کے چہرے تمسخر اور حقارت سے سوجے ہوئے تھے۔ غصے سے ان کے منہ سرخ ہو رہے تھے۔ کوئی جمرہ کو گھونسے دکھا رہا تھا، کوئی اس پر تھوکنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ بیشتر لوگ اسے مغلظات سے نواز رہے تھے "تیرے فلاں کے فلاں کا فلاں"۔ ایسے بھی تھے جو

ساتوں کنکریاں مار چکے تھے لیکن ان کا دل ٹھنڈا نہیں ہوا تھا اور اب وہ اپنے دل کی تسکین کی خاطر پاؤں سے جوتا اتار کر جمرے کو دھڑا دھڑ پیٹ رہے تھے۔

ہجوم کا یہ جوش وخروش اگر چہ بے معنی نظر آتا تھا لیکن وہ اس قدر پر اثر تھا کہ جلد ہی اس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔

دفعتاً مجھے یاد آیا کہ منیٰ میں پہلے قیام پر جمار نے اندھے کے ہاتھ سے لاٹھی چھیننے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے مجھے قدرت سے جدا کرنے کی چال چلی تھی۔ اللہ کا حکم تو خیر ٹھیک ہے لیکن اب تو معاملہ ذاتی رنگ اختیار کر چکا تھا۔

میں نے غصے کے عالم میں کنکروں کو پوٹلی کھولی۔

"ارے!" ان کنکروں کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ "اتنی چھوٹی کنکریاں یہ کیا ضرب لگائیں گی؟" اس وقت میرا جی چاہا کہ کوئی بڑا سا پتھر اٹھا لاؤں اور جمرہ کو ماروں۔ شاید میں پتھر مارنے سے گریز نہ کرتا۔ مشکل یہ تھی کہ جمرہ کے گرد بہت بڑا ہجوم تھا۔ زائرین کے سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ اگر پتھر کسی کے سر پر جا لگا تو؟

جب سے میں نے سرزمین حجاز پر قدم رکھا تھا، میں نے کسی عورت کو غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ ان کے چہروں پر عجیب قسم کا نور ہوتا تھا۔ ان کے انداز میں نسائی شدت نہ تھی۔ صبر، تحمل اور سکون۔ یقین نہیں آتا تھا کہ وہ عورتیں ہیں۔

لیکن اس روز جمار کے قریب صبر و تحمل کی ملمع اتر چکی تھی۔ ایک عورت جمرے کو "کھلے" دکھا رہی تھی، دوسری بُجّے دے رہی تھی۔ تیسری بُجّا دکھاتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر کہہ رہی تھی: "وے دُر پھٹے منہ تیرا"۔

جمرۃ العقبہ:

"یا علیؑ" کا نعرہ سن کر میں چونک اٹھا۔ دیکھا تو ایک جوان زائر فاتحانہ انداز میں جمرہ پر چڑھا ہوا تھا اور دھڑا دھڑا سے جوتوں سے پیٹ رہا تھا۔

میں نے اس نوجوان کی طرف حسرت سے دیکھا کیونکہ میرے لیے وہاں پہنچنا بے حد کٹھن تھا۔ اس عمل میں دھکا بازی، مونڈھے چلانے اور داؤ پیچ کھیلنے میں دسترس کی ضرورت تھی۔ میرے پاس ان چھوٹی چھوٹی کنکریوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے دوبارہ پوٹلی کھولی۔ ان میں سے سات موٹی موٹی کنکریاں چن کر مٹھی میں دبا لیں اور جمرۃ العقبہٰ کی طرف بڑھا۔

چونکہ اس وقت میں جمرہ سے خاصے فاصلے پر تھا اس لیے کنکری جمرہ تک پہنچانے کے لیے میں مڑا اور پھر ہجوم کی طرف بھاگا جس طرح کرکٹ میں باؤلر گیند پھینکنے سے پہلے مڑ کر دوڑ لگاتا ہے۔ ہجوم کی حد تک دوڑ کر میں نے نے پورے زور سے کنکری جمرے کی طرف پھینکی اور پھر ایڑیاں اٹھا کر دیکھنے لگا کہ وہ نشانے پر لگی بھی ہے کہ نہیں؟

دفعتاً میرے ماتھے پر زور سے ایک کنکر آ کر لگی۔

"ارے!" میں گھبرا گیا۔ پتھر تو میں نے مارا تھا، پھر وہ مجھے آ کر کیسے لگا۔ میرے آگے کھڑے زائرین کا مارا ہوا پتھر مجھے کیسے لگ سکتا تھا۔ میرے پیچھے کھڑے زائرین کا پتھر میرے سر کے پچھلی حصے پر لگتا، پیشانی پر نہیں۔ میں بوکھلا گیا۔

پھر مزید غصے میں دوڑ لگا کر میں نے دوسرا پتھر مارا۔ معاً ایک پتھر میرے گال پر آ لگا۔ جب میری ناک پر تیسرا پتھر لگا تو میں سوچنے لگا: کیا میں جمرہ کو پتھر مار رہا ہوں یا جمرہ مجھے پتھر مار رہا ہے؟

کیا وہ مجھے اس بات کا احساس دلا رہا تھا کہ وسوسے ڈالنے والا، نافرمانی پر مائل کرنے والا، بہکانے والا، خود میرے ہی اندر موجود تھا کہ میرے دل کی گہرائیوں میں بہکنے والا اور بہکانے والا دونوں یارانہ لگائے بیٹھے تھے، گٹھ جوڑ سے

میرے سوا ساری کائنات واقف تھی اور شاید در پردہ میں خود بھی واقف تھا لیکن اپنی نظر میں اپنی عزت بچائے رکھنے کے لیے میں نے نہ جانے کا ڈھونگ رچا رکھا تھا۔

جب مجھے چوتھا کنکر لگا تو گویا میری نگاہ سے پردہ ہٹ گیا۔

میری طرف دیکھو:

میں نے چلا کر ہجوم کو مخاطب کیا: ''بھائیو! جمرہ وہ نہیں ہے، میں ہوں، میں۔ مجھے کنکر مارو، مجھے۔ اس بے جان کو کنکریاں مارنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ میں نے بنی نوع انسان کو بہکایا ہے، میں نے لوگوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کیے ہیں، میں نے کفر و الحاد کا بیج بویا ہے''۔

''میری طرف دیکھو، میں دانش ور ہوں، میں نے شک کو علم کی بنیاد قرار دیا ہے۔''

''میری طرف دیکھو، میں ادیب ہوں، میں نے نئی اور انوکھی بے ادبیوں پر جدید ادب کی تعمیر کی ہے۔''

''میں فلسفی ہوں، میں نے چون و چرا کی خوبصورت ٹائلوں سے ایوان فلسفہ کی تعمیر کی ہے۔''

''میں سائنسی انداز کا مفکر ہوں، اور میں نے فکر کو سیکولرازم کی حدوں سے باہر نکلنے پر پابندی لگا رکھی ہے۔''

''میں پڑھا لکھا فرد ہوں، میں نے کفر کو تہذیب کی بنیاد قرار دے رکھا ہے اور ایمان کو جہالت کی نشانی۔''

''بھائیو! مجھے کنکریاں مارو، میں جمرہ ہوں، مجھ سے ڈرو نہیں کہ میں تم میں سے ہوں۔''

میں وہاں کھڑا چلا رہا تھا لیکن میرے حلق میں آواز نہ تھی اور ہجوم غصے اور غیظ و

غضب سے جمرہ کو پتھر مارنے میں مصروف تھا۔

بال جنجال

میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ حج کرنے جائیں تو ساتھ ایک قینچی لے جانا مت بھولئے۔

اگر مجھ میں تلقین شاہ کی طرف تفصیلی مشاہدے کی صلاحیت موجود ہوتی تو میں ایک کتابچہ لکھتا: ''ہدایت نامہ حج'' جس میں یہ درج کرتا کہ حج کو جاتے وقت ساتھ کیا کچھ ضرور لے کر جائیے اور کیا کچھ ہرگز ساتھ نہ لے کر جانا۔

کیمرہ اور دل:

مثال کے طور پر حج پر جانے سے پہلے اچھی طرح سے تسلی کر لینی چاہیے کہ کہیں آپ اپنے ساتھ کیمرہ تو نہیں لے جا رہے۔

ہمارے حج پر جانے سے ایک سال پہلے کی بات ہے کہ ہمارے ایک دوست جہانگیر نے فون کیا۔ کہنے لگے ''میں اللہ کے فضل و کرم سے حج کر کے لوٹا ہوں اور اپنے ساتھ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور دیگر مقدس مقامات کی رنگین تصاویر لایا ہوں۔ اگر آپ دیکھنا چاہیں تو میں آج شام کو آپ کے ہاں آ جاؤں''۔

میں نے قدرت اللہ شہاب سے بات کی۔ وہ بولے۔ ''سبحان اللہ! شام گزارنے کے لے اس سے بہتر صورت کیا ہو سکتی ہے۔'' ڈاکٹر عفت کہنے لگیں ''میں بھی اس محفل میں شریک ہوں گی''۔

شام کو حاجی جہانگیر تشریف لے آئے۔ وہ سکرین، پروجیکٹر، تصاویر اور دیگر سامان ساتھ لائے۔ آتے ہیں انہوں نے تصویریں دکھانی شروع کر دیں اور ساتھ ساتھ ان تصویروں کے سے متعلق کمنٹری کرنی شروع کر دی۔

ان کی ہر تصویر کی کمپوزیشن اتنی خوبصورت تھی، رنگ اتنے دلکش تھے کہ ہم

تینوں مبہوت ہو کر دیکھتے رہے۔ دیکھتے رہے۔

دو گھنٹے کے بعد اتفاقاً ڈاکٹر عفت کو ایک ضروری کام یاد آ گیا اور وہ اس بات پر مصر ہوئیں کہ باقی تصویریں اس وقت دکھائی جائیں جب وہ فارغ ہو جائیں۔

میں نے حاجی جہانگیر سے پوچھا کہ کتنی تصویریں باقی رہ گئی ہیں؟ جہانگیر نے جواب دیا کہ ابھی تو بمشکل آدھی تصویریں دکھائی ہیں، آدھی سے زیادہ باقی ہیں۔

خیر محفل ملتوی ہو گئی۔ جہانگیر اپنا سامان لے کر رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے بعد میں بڑی دیر تک ان تصاویر کے گن گاتا رہا، واہ واہ کرتا رہا۔ قدرت میری باتیں غور سے سنتے رہے۔ آخر میں وہ بولے "معلوم ہوتا ہے جہانگیر حج کے دوران تصویریں ہی کھینچتے رہے"۔

معاً میری نگاہ سے گویا پردہ ہٹ گیا اور میں نے دیکھا کہ ارض پاک پر جہانگیر تصویریں کھینچنے میں شدت سے مصروف ہیں۔ ان کی نگاہ مناظر پر لگی ہے، توجہ کمپوزیشن پر مرکوز ہے۔ آنکھ ویو فائینڈر میں پھنسی ہے اور دل پر کیمرے کا لینز کا پردہ پڑا ہوا ہے اور حرمین حیرت سے پتھر کی دیواریں بنے کھڑے ہیں اور کوٹھے کا والی منہ میں انگلی ڈالے جہانگیر کا منہ تک رہا ہے۔

پتہ نہیں کس کا شعر ہے:

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار
جب ذرا گردن جھکائی ، دیکھ لی

شعر کے نفس مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر پہلی مرتبہ حرمین شریف میں گیا تو وہ اپنے ساتھ کیمرہ لے گیا تھا۔ واپسی پر اسے اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ ازالہ کرنے کے لیے دوسری مرتبہ وہ کیمرے کی جگہ دل لے کر حاضر ہوا۔

بہر طور میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اگر آپ حج یا عمرہ کے لیے حاضری دیں تو

اللہ کے واسطے اپنے ساتھ کیمرہ نہ لے جائیے گا۔

لنگوٹی:

وزارت مواصلات مغربی پاکستان نے ایک کتابچہ شائع کیا ہے۔نام ہے ''مفصل ہدایات برائے حازمین حج''۔اس کتابچے کے صفحہ ۴۴ پر قابل عمل ہدایات کی ذیلی سرخی کے تحت شق نمبر ۳ میں درج ہے کہ:

''حکومت کے مقررہ کردہ اصول کے تحت اپنے ساتھ راش ضرور لے جائیں۔خواہ آپ درجہ اول کے مسافر کیوں نہ ہوں، کیونکہ جہاز میں اشیائے خوردنی گراں ہیں''۔

بے شک جہاز میں اشیائے خوردنی گراں ہیں، لیکن اگر آپ راشن ساتھ لے جائیں گے تو یقین جانیئے یہ احتیاطی اقدام آپ کو بہت مہنگا پڑے گا۔

اگر آپ آٹا ساتھ لے جائیں تو اس کے ساتھ آپ کو ایک ایسا برتن لے جانا پڑے گا جس میں اسے گوندھا جا سکے۔پھر ایک توا لے جانا پڑے گا جس پر روٹی پکائی جا سکے۔ساتھ ہی ایک چولہا لے جانا پڑے گا کہ روٹی پکانے کے لیے آگ جلائی جا سکے۔پھر مٹی کے تیل کی ضرورت پڑے گی تو آگ جلانے میں مدد دے۔پھر کدی خاتون کی ضرورت لاحق ہو جائے گی جو روٹی پکا سکے۔پھر......

نقل ہے کہ ایک ننگے فقیر کو لوگوں نے کہہ سن کر لنگوٹی پہنا دی۔حجرے میں چوہے بہت تھے۔انہوں نے رات کے وقت لنگوٹی کو منہ مارنا شروع کر دیا۔کسی نے کہا کہ چوہوں سے بچاؤ کے لیے ایک بلی پال لو۔بلی پالی تو اس کے لیے دودھ کی فکر دامن گیر ہوئی۔ایک بہی خواہ نے مشورہ دیا کہ دودھ کی مسلسل سپلائی کے لیے ایک بکری خرید لی جائے۔بکری خرید لی تو اس کے لیے چارہ فراہم کرنے کا بندوبست کرنا پڑا۔لوگوں نے مشورہ دیا کہ یہ تو کوئی مشکل کام نہیں۔پاس ہی جنگل ہے۔روز

جا کر ہری ہری ٹہنیاں کاٹ کر لے آیا کیجئے۔ فقیر نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا۔ ایک روز جب وہ درخت پر چڑھ کر ٹہنیاں کاٹ رہے تھا تو پاؤں پھسلا اور وہ نیچے آ گرا..... عقیدت مندوں کو پتہ چلا تو وہ فقیر کو اٹھا کر گھر لے آئے۔ جب فقیر کو ہوش آیا تو اس نے اٹھتے ہی لنگوٹی اتار پھینکی اور بولا "سارا فساد لنگوٹی کا ہے۔ نہ ہم لنگوٹی پہنتے نہ چوہے منہ مارتے، نہ بلی پالنی پڑتی، نہ بکری خریدتے، نہ چارہ لانے کے لیے جنگل میں جانا پڑتا، نہ پاؤں پھسلتا، نہ ہم اس حالت کو پہنچتے۔ میاں یہ سب فساد لنگوٹی کا ہے۔ یہ رہی فساد کی جڑ ہماری لنگوٹی"۔

اہتمام:

حرمین میں میں نے راشن کی لنگوٹی باندھے ہوئے ایک نہیں کئی ایک قافلے دیکھے ہیں۔ یہ قافلے یا تو مصریوں کے تھے اور یا ایرانیوں کے۔ ہر ایسا قافلہ دو بسوں پر مشتمل تھا۔ ایک بس زائرین کی، دوسری میں مطبخ کا سامان اور لوازمات۔ دیگیں، دیگچے، چولہے، گیس کے سلنڈر، پلاسٹک کی پلیٹیں، چمچے، چھریاں، کانٹے، چائے کے سیٹ، نیپکن، چاول، آٹا، آئیس بکس اور نہ جانے کیا کیا۔

جہاں کہیں پڑاؤ آتا، دریاں اور غالیچے بچھ جاتے۔ چولہے جل جاتے، مرغ پلاؤ کی دیگیں چڑھ جاتیں۔ دیگچوں میں سویٹ ڈش کا اہتمام شروع ہو جاتا، پھر دستر خوان بچھ جاتے۔ پلیٹیں کھنکتیں، چمچے اور کانٹے بجنے لگتے۔

پتہ نہیں اس اہتمام اور بندوبست کا اہل قافلہ پر کیا اثر مرتبہ ہوتا ہوگا۔ البتہ راہ گیروں یا دیکھنے والوں پر جو کیفیت طاری ہوتی تھی وہ ظاہر تھی۔

راہ گیر یہ منظر دیکھ کر رک جاتے۔ پہلے تو حیرت سے ان کی آنکھیں کھلی رہ جاتیں چونکہ افراط اس ماحول میں عجیب سی لگتی تھی۔ پھر لذت طعام کا سحر چلتا۔ آنکھوں میں ہوس لہراتی۔ منہ میں پانی بھر آتا اور وہ بھول جاتے کہ وہ زائر ہیں اور

دیر تک وہ وہاں بت بنے کھڑے رہتے۔ افراط کا یہ منظر انہیں حرمین سے نکال کر کسی واجد علی شاہ کے مطبخ کی دہلیز پر لے جا کر کھڑا کر دیتا۔

پرہیز گار متقی راہ گیر نظر بچا کر گزر جانے کی کوشش کرتے۔ پھر بھی تقاضائے بشری کی زنجیر کی وجہ سے ان کی چال مدھم پڑ جاتی۔

سائیں حلوہ:

مجاہدے کے متوالے اس منظر کو دیکھتے تو ان کی کیفیت سائیں حلوہ کی یاد دلاتی۔

سائیں حلوہ تقسیم سے بہت پہلے انبالے کا ایک جانا پہچانا فقیر تھا۔ اس کا معمول تھا کہ صبح سویرے جمنا داس پوری والے کی دکان پر جا کھڑا ہوتا۔ وہاں سے وہ دو آنے کا حلوہ خرید کر اسے دونے میں ڈال اپنے بائیں ہاتھ پر رکھ لیتا۔ پھر وہ سارے شہر میں چکر لگاتا۔ بار بار حلوے کے دونے کی طرف دیکھتا۔ پھر قہقہہ مار کر ہنستا: "ہوں تو تُو حلوہ کھائے گا۔ حلوہ کھائے گا تو"؟ وہ قہقہہ مار کر کہتا۔ اس کے قہقہوں میں بلا کا تمسخر ہوتا تھا۔ اس کے اس جملے میں جو وہ سارا دن بار بار دہراتا رہتا تھا کہ "تو حلوہ کھائے گا" تلوار سی دھار ہوتی تھی۔

سارا دن سائیں حلوہ دونا ہتھیلی پر رکھے سارے شہر میں گھومتا رہتا تھا۔ وہ بار بار "تو حلورہ کھائے گا" دہراتا اور قہقہے مارتا رہتا۔ پھر جب شام پڑ جاتی تو کتے اس کے گرد جمع ہو جاتے۔ پھر وہ آخری مرتبہ نہ جانے کس سے پوچھتا "تو حلوہ کھائے گا"۔ اور پھر حلوے کا دونا کتوں کو ڈال دیتا۔ اس وقت اس کا طویل قہقہہ سارے بازار میں گونجتا اور ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔

بندوبستی قافلے:

منیٰ میں ایک ایسے ہی اہتمامی قافلے کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ایک روز جب میں شہر منیٰ کے پختہ حصے میں ایک عوامی مسافر خانے میں بیٹھا تھا تو دفعتاً برآمدے میں شوروغوغا بلند ہوا۔ پھر ایک اہتمامی بندوبستی قافلہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ قافلہ بیس پچیس افراد پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ سب کے سب بڑے مہذب اور متمدن تھے۔ ہال کمرے میں داخل ہو کر انہوں نے "السلام علیکم" کہا اور پھر کمرے میں مقیم زائرین کی خدمت میں بڑے ادب سے درخواست کی کہ اگر وہ کمرے کا ایک حصہ ان کے لیے وقف کر دیں تو نوازش ہو گی۔ اس وقت کمرے میں مقیم زائرین کی تعداد بہت کم تھی لہذا وہ سب سمٹ کر ایک طرف ہو گئے اور اہتمامی بندوبستی قافلے کے لیے جگہ بن گئی۔

پھر خدام دوڑے۔ دریاں بچھ گئیں۔ ان پر سفید چادروں کا فرش بچھا دیا گیا۔ گاؤ تکیے لگا دیئے گئے ہاتھ کے پنکھے بانٹ دیئے گئے اور وہ قافلہ جس میں خواتین بھی شامل تھیں، آرام سے بیٹھ گیا۔

انہیں بیٹھے کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ایک بہت بڑا سماور کمرے میں لایا گیا جس کے ساتھ پیالوں اور چمچوں کا ڈھیر تھا اور وہ سب سفر کی تھکن دور کرنے کے لیے قہوہ پینے لگے۔

اس کمرے میں زیادہ تر عوامی لوگ مقیم تھے۔ یہ لوگ سب غیر اہتمامی لوگ تھے۔ جب کھانے کا وقت آتا تو کوئی تندور کی روٹی پر چٹنی رکھ لیتا، کوئی تربوز کی پھانک خرید کر لے آتا، کوئی روٹی پر چار کھجوریں رکھ لیتا، کوئی اچار کے ساتھ روٹی کھاتا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو نمک اور پانی کے ساتھ روٹی کھاتے۔

یہ سب لوگ زائر تھے۔ وہ سب پانچ وقت نمازیں پڑھتے، سارا دن اور رات کو بیشتر وقت تسبیح چلاتے یا قرآن کریم پڑھنے میں مصروف رہتے تھے۔ روٹی کھانا

ان کے نزدیک ایک غیر اہم سا کام تھا۔

اس روز جب دوپہر کے کھانے وقت ہوا تو اہتمامی قافلے کے خدام پہلے مرغ پلاؤ کی بھری ہوئی چوئی دار رقابیں کمرے میں لے آئے۔ پھر شوربے، دہی، سلاد کے برتن آنے شروع ہوئے اور آخر میں سویٹ ڈش کے طشت۔ اس افراد اور اہتمام کو دیکھ کر عوامی زائر کلمہ پڑھتے ہوئے یوں اٹھ کر بیٹھ گئے جیسے صور اسرائیل پھونک دیا گیا ہو۔

تلذذ کا اژدھا:

ان کی تسبیحیں چلتے چلتے رک گئیں۔ باقاعدگی سے ہلتے ہوئے ہونٹ اٹک گئے۔ ان کی آنکھیں گھبرا گئیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کدھر دیکھیں، کدھر نہ دیکھیں۔

وہاں ایک عظیم کایا پلٹ عمل میں آ گئی جیسے سکون اور تقدیس بھرے فردوس میں افراط کا اژدھا آ گھسا ہو۔ اس منظر کا مجھ پر اس قدر گہرا اثر ہوا کہ اگر میرا بس چلے تو میں راشن ساتھ لے کر جانے والے اہتمامی بندوبستی قافلوں کا سرزمین حجاز میں داخلہ بند کرا دوں۔ اہتمام اور افراط اس ماحول میں یوں لگتے ہیں جیسے فقیر کی گدڑی پر زربفت کا پیوند لگا ہو۔ پتہ نہیں کس اصول کے تحت یہاں زمین پر بیٹھ کر چٹنی روٹی اور تربوز روٹی کھانا ہی زیب دیتا ہے۔

اہتمام کی تو وہاں گنجائش ہی نہیں۔ آپ اہتمام کے جھنجھٹ میں پڑ گئے تو سمجھ لیجئے ماحول سے کٹ گئے۔

وہاں پکی پکائی روٹی سستی اور عام ملتی ہے اور حرم شریف کی دیوار تلے بیٹھ کر چٹنی روٹی کھانے میں اتنی ہی لذت حاصل ہوتی ہے جتنی مدینہ منورہ میں جالی پکڑ کر درود شریف پڑھنے میں۔

بلے بلے بلے:

میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ جب آپ حج کے لیے جائیں تو اپنا علم ساتھ لے کر نہ جائیں۔

"علموں بس کریں او یار"

آپ چاہتے ہیں کہ خانہ کعبہ میں حاضری دیتے وقت آپ پر "بلے بلے" کی کیفیت طاری ہو جسے بلھے شاہ نے قلم بند کیا ہے۔

"جے میں دیکھا تیرے ولے، بلے بلے بلے"

تو اپنے پلے علم باندھ کر نہ لے جائیں، بلکہ پلا جھاڑ کر جائیں۔

اگر آپ علم، شوق، تحقیق یا طلب علم ساتھ لے کر جائیں گے تو آپ کا بھی وہی حشر ہوگا جو شبلی بی کام کا ہوا۔

شبلی بی کام میرے بہت پرانے دوست ہیں۔ اگر ان کی طلب علم کو نظر انداز کر دیا جائے تو بہت ہی اچھے آدمی ہیں۔

حال ہی میں شبلی صاحب نے فریضۂ حج ادا کیا ہے اور واپسی پر ایک ضخیم کتاب تصنیف کی ہے۔

حج پر جانے سے پہلے اور واپسی کے بعد میں نے حج پر بہت سی کتابیں پڑھی ہیں لیکن شبلی بی کام سی کتاب میری نگاہ سے نہیں گزری۔ شبلی صاحب کی اس کتاب میں حج کے ہر پہلو پر مفصل معلومات موجود ہیں۔ تاریخی، جغرافیائی، تمدنی، اسلامی اور شرعی۔ یہ کتاب ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ صرف ایک خامی ہے وہ یہ کہ اس کتاب کا نام غلط رکھا گیا ہے۔ اس کا نام "رب کعبہ کے حضور" نہیں بلکہ حج انسائیکلوپیڈیا ہونا چاہیے۔

شبلی بی کام:

اندازہ ہے کہ شبلی صاحب جب عازم حج ہوئے تو انہوں نے اپنا سارا کا سارا علم پلے باندھ لیا اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ طلب علم کی ایک بھاری گٹھڑی سر پر اٹھالی۔ پھر شوق تحقیق کی چھڑی ہاتھ میں اٹھائی۔ پھر وہ رب کعبہ کے حضور چل پڑے۔ شبلی جی! رب کعبہ کے حضور بھلا اس طرح جایا کرتے ہیں؟

نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ حرم شریف کی ڈیوڑھی پر پہنچے اور ان کی نگاہوں نے دیواروں کی طرف دیکھا تو علم، جذبہ تحقیق اور طلب علم نے سنپولیوں کی طرح سر اٹھائے۔

یہ دیواریں اتنے گز اونچی ہیں، اوپر سے اتنے فٹ موٹی ہیں۔ ڈیوڑھی کی محراب فلاں طرز تعمیر سے اخذ کی گئی ہے۔ سنگ مرمر کے رنگ اور ریشوں سے ظاہر ہے کہ فلاں ملک سے درآمد کیا گیا ہے۔ حرم شریف میں داخل ہوئے تو انہوں نے خانہ خدا سے کہا:

"آئی بیگ یو پارڈن! ذرا ٹھہریئے، پہلے میں مسجد الحرام کی محرابیں گن لوں، مسجد کے صحن کا رقبہ کیا ہوگا، کتنے زائرین نماز پڑھ سکتے ہیں"۔

دنیا میں ایسے مجاہد بھی ہیں جو آپ کو، ان کو، مجھ کر، سب کو اور آنے والی نسلوں کو یہ مقدس معلومات بہم پہنچانے کے لیے رب کعبہ کے حضور خود حاضری دینے کی عشرت کی قربانی دینے سے گریز نہیں کرتے۔

خانہ خدا پر نظر پڑی تو چونکے۔ ارے! اس کوٹھے کی اونچائی، چوڑائی اور لمبائی کا تناسب کتنا غیر معمولی ہے۔ اور یہ جو دروازہ خانہ خدا میں کھلتا ہے، یہ فرش سے اتنا اونچا کیوں ہے۔ کتنا اونچا ہوگا بھلا؟

ذرا ٹھہریئے، یہ جو کبوتر مسجد پر اڑ رہے ہیں، کیا یہ واقعی مسجد پر بیٹ نہیں

کرتے اور خانہ خدا کے اوپر پہنچ کر اڑان کی سمت بدل لیتے ہیں۔ کیا یہ احترام کی وجہ سے ہے یا کبوتروں کی نسلی عادت کی وجہ سے ہے۔

اگر آپ حج پر جائیں تو زیارتوں کے کے طواف میں نہ پڑ جایئے گا، ورنہ طالب علم اور شوق تحقیق آپ کے پاؤں میں چکر ڈال دے گی۔ زیارتیں آپ کے لیے ایسا صحرائے اعظم بن جائیں گی کہ آپ صحرا نوردی کو منزل سمجھنے لگیں گے۔

"رب کعبہ کے حضور" کی ایک جلد لے کر میں قدرت اللہ شہاب کے پاس گیا۔ میں نے کہا "حج پر اس سے بہتر اور اتنی مکمل کتاب میں نے آج تک نہیں دیکھی"۔ قدرت نے کتاب کو دیکھ کر کہا "ہاں میں نے اسے پڑھا ہے، بہت خوب کتاب"۔ میں نے کہا "پڑھی ہے تو یہ بتایئے کہ کیا اس کتاب کا نام ٹھیک بنتا ہے؟ کیا اس کتاب میں رب کعبہ میں حاضری ہے؟"

دہکا کوئلہ:

آپ حاضری کو کیا سمجھتے ہیں؟ قدرت نے پوچھا۔

"میں اسے ایک کیفیت سمجھتا ہوں۔ ECSTASY کی کیفیت، جیسے "حال" ہوتا ہے"۔

قدرت نے کہا "مجھے غوث علی شاہ صاحب کی ایک بات یاد آ گئی"۔

"ایک روز میر تقی نے غوث علی شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کی: شاہ سلیمان صاحب تونسوی ابتدائی ایام میں بہت حال کھیلا کرتے تھے لیکن آخر ایام میں انہیں حال آنا بند ہو گیا۔ اس کی کیا وجہ تھی؟"۔ غوث علی شاہ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ "جب تک کوئلہ دہک نہیں جاتا، چٹختا اور دھواں دیتا رہتا ہے، لیکن جب آگ اس کے اندر سرایت کر جاتی ہے اور وہ ہم رنگ آتش ہو جاتا ہے، پھر نہ چٹختا ہے نہ دھواں دیتا ہے"۔

میرا سارا بنا بنایا محل دھڑام سے گر کر ڈھیر ہوگیا۔ ایک چھوٹا سا کنکر مار کر دوسروں کے عظیم الشان محل گرا کر ڈھیر کردینے میں قدرت کو بڑا ملکہ حاصل ہے۔

جب قدرت، صدر ایوب کے سیکرٹری تھے تو صدر ایوب اکثر مسکرا کر کہا کرتے

MUST YOU THROW A BRICK AT ME EVERY TIME WHEN I SAY SOME THING کیا یہ ضروری ہے کہ جب بھی میں کچھ کہوں تو تم جواب میں مجھے پتھر دے مارو"۔

اس وقت میں نے شدت سے محسوس کیا کہ صدر ایوب قدرت کے ہاتھوں کس قدر ستائے ہوئے تھے۔

تواتر:

پھر مجھے وہ دن یاد آ گیا جب صدر ایوب اپنے وزرا کے ساتھ کانفرنس میں مصروف تھے۔ زیر بحث کوئی قانونی نکتہ تھا۔ صدر ایوب نے بر سبیل تذکرہ کہا I AM THE FINAL APPEALANT AUTHORITY "میں اپیل پر آخری فیصلہ کرنے کا مجاز ہوں"۔

قدرت یوں مودبانہ اٹھے جیسے جماعت میں کوئی نالائق لڑکا استاد سے خطاب کرنے کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے بولے: "سر آخری فیصلہ آپ کے ہاتھ میں نہیں، آخری فیصلہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے"۔

صدر ایوب نے قہقہہ مارا۔ بولے "وہ تو Implied ہے، اسے ہر بار زبان پر لانے کی کیا ضرورت ہے"۔

قدرت نے کہا: "سر اسے بار بار زبان پر لانے کی اشد ضرورت ہے۔ تواتر نہ ہو تو یہ حقیقت ذہن سے نکل جاتی ہے"۔

"میں سمجھا نہیں کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" صدر نے کہا۔

"سر یقین جانئے اتنی سی بات ذہن میں رکھنے سے بہت فرق پڑتا ہے"۔

خیر...... یہ تو سارا ہی جملہ معترضہ تھا۔

اصل بات تو یہ تھی کہ جب آپ حج پر جائیں تو اپنے ساتھ ایک قینچی ضرور لے جائیں، ورنہ آپ کا بھی وہی حشر ہوگا جو میرا ہوا تھا۔

سیلون:

منیٰ سے واپسی پر مکے کے راستے پر جگہ جگہ حاجی سر جھکائے بیٹھے تھے، اور ناکندہ حجام تراش اپنے استروں سے ان کی کھوپڑی کا آملیٹ بنا رہے تھے۔

فندق الملعکی پہنچ کر قدرت تو ناسازی طبع کی وجہ سے بستر پر لیٹ گئے۔ ڈاکٹر عفت ان کی تیمارداری میں مصروف ہوگئیں اور میں حجام حجام کے نعرے لگاتا ہوا باہر نکل گیا۔

سڑک پر جگہ جگہ حجاموں کے گرد حاجیوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں اس روز مجھ میں نفاست طبع کیسے جاگ اٹھی۔ سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے حجاموں کے سامنے بیٹھنے کو جی نہ چاہا۔ کسی معقول سیلون کی تلاش میں میں سارے شہر میں مارا مارا پھرتا رہا۔ دو ایک دوکانیں نظر آئیں۔ تو ان کے باہر بالکل ایسا ہی ہجوم تھا جیسے نئی پنجابی فلم لگنے پر بکنگ آفس کے گرد مار دھاڑ قسم کی بھیڑ لگی ہوتی ہے۔

پتہ نہیں اس روز میرے ایمان کو کیا ہوا تھا۔

پتہ نہیں اس روز میرے دل پر پتھر کیوں پڑ گئے تھے۔ سیلون کی تلاش میں میں گھنٹوں مسلسل حرم شریف کے گرد چکر کاٹتا رہا۔

پتہ نہیں اس روز مجھ میں اتنا دل گردہ کیسے پیدا ہوگیا تھا کہ میں حرم شریف کے دروازے کے سامنے سے گزر جاتا۔ دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے

مجھ پر اتنا جذبہ بھی طاری نہ ہوا کہ میں بال کٹوانے کی تفصیل کو بھول جاتا۔

پتہ نہیں کیوں بال کٹوانے کی تفصیل اس روز اتنی بڑی دیوار کیسے بن گئی۔ اتنی بڑی رکاوٹ کہ اس نے حرم شریف کے کھلے ہوئے دروازوں کو مجھ پر بند کر دیا۔

''شواط'' میرے رستے کی رکاوٹ نہ بن سکے۔

''استلام'' میرے رستے کی رکاوٹ نہ بن سکا۔

''ملتزم'' میرے رستے کی رکاوٹ نہ بن سکا۔

''رمی'' میرے رستے کی رکاوٹ نہ بن سکی، لیکن حجامت پہاڑ بن کر سامنے آ کھڑی ہوئی۔

پاگل ای اوئے:

مجبور ہو کر میں ایک سیلون کے سامنے کیو میں کھڑا ہو گیا۔ وہ بہت لمبا کیو تھا۔ اس کیو میں میں بہت پیچھے کھڑا تھا۔ میں وہاں کھڑا رہا کھڑا رہا کھڑا رہا۔

صدیاں بیت گئیں۔

حتیٰ کہ کھڑا کھڑا بھول گیا کہ میں وہاں کیوں کھڑا تھا۔

کیو رینگتا رہا، رینگتا رہا، اتنی دیر رینگتا رہا کہ میں بھول گیا کہ مجھے جلدی ہے، مجھے جانا ہے۔ قریب ہی کوئی منڈیر سے جھانک جھانک کر دیکھ رہا ہے کہ ابھی پہنچا ہے یا نہیں۔

پھر جو مجھے ہوش آیا تو میں حجام کی گھومنے والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ حجام نے میری دونوں قلموں پر مشین چلائی۔ دفعتاً میری نگاہوں سے بال جنجال کا پردہ ہٹ گیا۔

میں کرسی اٹھ بیٹھا۔ حجام نے میرے کندھوں کو نیچے کی طرف جھٹکا دیا۔ میں پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ حجام نے میری گردن پر مشین پھیری۔ جوش میں میں پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ حجام غصے میں چلانے لگا۔

پتہ نہیں ہو کیا کہہ رہا تھا۔ مجھے صرف دو لفظ سمجھ میں آئے: "بارہ ریال"۔ میں نے جھٹ بیس ریال میز پر رکھے اور بقایا لینے کے بغیر ہی باہر بھاگا۔ باہر کھڑے لوگوں کو میں نے کندھے مارے جیسے وہاں فٹ بال کا کھیل ہو رہا ہو۔ پھر وہ سب میری کیفیت دیکھ کر قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ ان کی نگاہوں سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ چلا چلا کر کہہ رہے ہوں: "پاگل ای اوئے پاگل ای اوئے"۔ جب میں دیوار نہ وار حرم میں داخل ہوا تو کوٹھے پر کوئی کھڑا قہقہے مار کر ہنس رہا تھا: "پاگل ای اوئے۔ بال جنجال میں الجھا ہوا پاگل"۔

طواف وداع

احساس مفارقت:

اس روز حرم شریف کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ اگرچہ وہی فرش تھا، وہی دیواریں تھیں، وہی ستون تھے، وہی زائرین تھے، وہی نمازی تھے، وہی سجدے تھے، وہی طواف تھا..... لیکن نہ وہ شوق تھا، نہ وہ شدت تھی، نہ وہ ولولہ تھا۔

سارے حرم پر اک اداسی چھائی ہوئی تھی۔ تسبیحیں رک رک کر چل رہی تھیں۔ انگلیاں کانپ رہی تھیں، ہونٹوں پر لرزش تھی، کندھے ڈھلکے ہوئے تھے، گردنیں جھکی ہوئی تھیں، نگاہیں نم آلود تھیں۔

مطاف میں وہ جوش نظر نہ آتا تھا۔ طواف کرنے والے رک رک کر چل رہے تھے جیسے ڈرتے ہوں کہ طواف ختم نہ ہو جائے۔

اس وقت زائرین طواف وداع میں مصروف تھے۔ خانہ کعبہ کے حضور وہ ہمارا آخری دن تھا، آخری حاضری۔

اس روز ہم سب زائرین نہیں بلکہ حاجی تھے۔

احرام اتر چکے تھے۔

"یا اللہ میں حاضر ہوں" کے نعرے ختم ہو چکے تھے۔

خانہ خدا خود بدلا ہوا تھا۔

خانہ کعبہ پر نیا غلاف چڑھا ہوا تھا۔

نئے کپڑے پہنے وہ یوں نیا نیا سا لگتا تھا جیسے اجنبی ہو۔ جیسے ہماری صرف سرسری جان پہچان ہو۔

خانہ کعبہ کی منڈیر خالی پڑی تھی، کوئی وہاں سے جھانک نہیں رہا تھا۔

صرف منڈیر پر نہیں، سارا کوٹھا خالی پڑا تھا۔ اس کو دیکھ کر محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ آباد ہے۔ اس میں وہ احساسِ موجودگی نہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ خالی بت ہو۔

جب اور اب:

جب ہم پہلی مرتبہ زائرین کی حیثیت سے مکہ معظمہ میں آئے تھے تو خانہ خدا کو دیکھ کر شدت سے ایک موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ اس کے ایک ایک پتھر میں زندگی تھی۔ پتھر کی ایک ایک رگ کسی وجود کی تڑپ سے سرشار تھی۔ اس وقت کسی نے محسوس نہیں کیا تھا کہ وہ پتھر کا بنا ہوا ایک بت ہے۔ کسی کو یہ خیال نہ آیا تھا کہ لامحدود اللہ کو اس چھوٹے سے کوٹھے میں کس طرح مقید کیا جا سکتا ہے کہ ایک اتنی عظیم قادر مطلق ہستی اس کوٹھے میں کس طرح سما سکتی ہے کہ لامتناہی کائنات کے والی کو ایک چھوٹے سے پتھر کے کوٹھے میں محدود کر دینا ایک مضحکہ خیز بات ہے۔

پتہ نہیں کیوں پڑھے لکھے لوگ، اسلام کو جاننے سمجھنے والے لوگ ان دنوں سبھی محسوس کرتے تھے کہ وہ اس کا گھر ہے کہ وہ اس کوٹھے میں مقیم ہے کہ وہ اس چار دیواری میں چھپا بیٹھا ہے۔ ان دنوں وہ کوٹھا ساری کائنات پر مسلط و محیط تھا۔

لیکن آج وداع کے روز وہ کوٹھا خالی خالی دکھتا تھا۔ اس کے باوجود زائرین مفارقت کے جذبے سے نڈھال تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ اپنے اللہ سے جدا ہو رہے ہیں، اسے الوداع کہہ رہے ہیں۔ خدا حافظ کہہ رہے ہیں، جدائی کے خیال سے ان کی آنکھیں آنسوؤں میں تیر رہی تھیں۔

دفعتاً حرم شریف میں ایک شور اٹھا۔

افریقی قافلہ:

وداع ہونے والا وہ پہلا قافلہ تھا۔

وہ قافلہ چالیس پچاس افریقیوں پر مشتمل تھا جن میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی اور بچے بھی۔ وہ سب حرم میں بنی ہوئی اس شاہراہ پر کھڑے تھے جو سیدھی بیرونی دروازے کو جاتی ہے۔

ان وداع ہونے والے افریقیوں کے چہرے پر فرط محبت اور غم جدائی سے مسخ ہو رہے تھے۔ ان کی نگاہیں خانۂ خدا پر مرکوز تھیں۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پیشانیوں میں سجدے تڑپ رہے تھے۔ ان کا رنگ رنگ عجز و احترام اور دکھ سے بھیگا ہوا تھا۔

وہ سب خانۂ خدا کی طرف منہ کیے الٹے پاؤں مسجد کے بیرونی دروازے کی طرف چل رہے تھے۔ ہر قدم اٹھانے کے بعد ان کے جذبے میں مزید شدت پیدا ہو جاتی، تڑپ میں اضافہ ہو جاتا...... دکھ میں گہرائی اور آنسوؤں میں مزید روانی۔

ان کے چہرے جدائی کے درد اور کرب کے جذبے سے پھوڑوں کی طرح رس رہے تھے۔

یہ قافلہ الٹے پاؤں رینگتا رہا رینگتا رہا۔

حرم میں بیٹھے ہوئے زائرین ہکے بکے ان کی طرف دیکھتے رہے، دیکھتے رہے۔ زندگی میں میں نے کئی ایک عظیم جذباتی مناظر دیکھے ہیں لیکن اس روز حرم میں وداع کے اس منظر میں اتنا تاثر تھا، اتنی شدت تھی جو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

زائرین اپنی نگاہیں اس منظر سے ہٹا نہیں سکتے تھے، جیسے کسی سحر سے پتھر کے بن گئے ہوں۔

لت پت:

ایسے لگتا تھا جیسے اللہ اپنے گھر سے نکل کر وداع ہونے والے قافلے میں تحلیل ہو گیا ہو۔

وہ پچاس افریقی اس وقت اللہ سے لت پت ہو رہے تھے۔ ان کے چہرے اللہ کی محبت سے یوں نچڑ رہے تھے جیسے جلیبیاں شیرے سے نچڑتی ہیں۔ ان کی آنکھوں سے اللہ آنسوؤں کی پھوار بن کر بہہ رہا تھا، پیشانیوں پر نور بن کر چمک رہا تھا۔ ان کے عجز کو دیکھ کر اللہ منہ میں انگلی ڈالے حیران کھڑا تھا۔

وہ قافلہ الٹے پاؤں رینگتا رہا، رینگتا رہا......

صدیاں بیت گئیں۔

جب اس قافلے کا آخری فرد بیرونی دروازے سے نکل گیا تو میں چونکا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے اللہ کو وہ اپنے ساتھ لے گئے ہوں۔

سارا حرم خالی پڑا تھا جس کے درمیان میں خانہ کعبہ ایک بت کی طرح ایستادہ تھا...... پتھر کا بت......

میں بیرونی دروازے کی طرف اٹھ بھاگا۔

باہر نکلا تو دیکھا کہ افریقی قافلے کا نشان تک نہیں۔ "کھو دیا" میں نے سوچا۔ "کھو دیا"۔ مجھے اس افریقی قافلے کے ساتھ شریک ہو جانا چاہیے تھا۔ میں بھی اللہ سے لت پت ہو جاتا، چند ساعتوں کے لیے میں بھی اللہ بن جاتا "کھو دیا"۔

مایوسی کے عالم میں میں بیرونی دروازے کے سامنے ایک چبوترے پر بیٹھ گیا۔ نہ جانے کب تک سر جھکائے میں وہاں بیٹھا رہا۔

مکان اور مکین:

پھر جو میں نے نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ وہ بیرونی دروازے کی سیڑھیوں پر اپنے اعضاء پر ٹھوڑی رکھے بیٹھا ہے۔ کپڑوں پر جا بجا پیوند لگے ہیں، چہرے پر جھریاں

لٹک رہی ہیں، پپوٹے آنکھوں کو ڈھانپے ہوئے ہیں۔

جب بھی کوئی وداع ہونے والا دروازے سے باہر نکلتا تو وہ محبت بھری نظروں سے اسے دیکھتا اور اپنی انگلی آگے بڑھا کر کہتا: ''مجھے چھوڑ کے نہ جاؤ۔ مجھے ساتھ لے چلو۔ میری انگلی پکڑ کر مجھے ساتھ لے چلو۔ نہیں، نہیں، اس کوٹھے کی جدائی کا غم مت کھاؤ۔ وہ کوٹھا تو خالی ہے۔ میں تو اب یہاں بیٹھا تمہارا رستہ دیکھ رہا ہوں، تمہارا منتظر ہوں، تمہارے ساتھ جانے کا خواہاں ہوں۔ میری انگلی پکڑو، مجھے ساتھ لے چلو۔'' وہ ہر وداع ہونے والے کا دامن پکڑتا تھا۔

لیکن کوئی اس کی جانب نہ دیکھتا، کوئی اس کی بات نہ سنتا، کوئی اس کی طرف توجہ نہ دیتا۔ وہ سب پتھر کے اس کوٹھے پر مرکوز تھے۔ وہ اس سے وداع ہونے کے غم میں نڈھال تھے۔ وہ مکان میں کھوئے ہوئے تھے۔ اس قدر کھوئے ہوئے تھے کہ مکین کو بھول چکے تھے۔

اور مکین حیرت اور بے بسی سے ان کا منہ تک رہا تھا۔

اس نے ملتجی نظروں سے میری طرف دیکھا اور اپنی انگلی بڑھا دی۔

''نہیں نہیں، میں تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا''۔ میں نے کہا ''میں تو ''میں'' سے بھرا ہوا ہوں۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے ''میں'' کی انگلی پکڑ رکھی ہے۔ میں نے تو ''میں'' کو بت بنا رکھا ہے۔ میں تجھے ساتھ کیسے لے جا سکتا ہوں۔''

''میں تیرے دوار پر آ سکتا ہوں، میں تیرے حضور حاضری دے سکتا ہوں، میں تجھے سجدہ کر سکتا ہوں، تیرے پاس رہ سکتا ہوں لیکن صرف چند ساعتوں کے لیے، چند لمحات کے لیے، چند دنوں کے لیے۔ میں تجھے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ میں تجھے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ میں اپنی ''میں'' کی نفی نہیں کر سکتا۔ نہیں، نہیں''۔

میں دوسرے دروازے کی طرف اٹھ بھاگا تا کہ ادھر سے حرم میں داخل ہو

جاؤں ۔ ارے وہ تو وہاں بھی بیٹھا تھا۔ وہ حرم کے ہر دروازے پر بیٹھا تھا۔

وہ مکے کے ہر موڑ پر بیٹھا تھا۔ ہر سڑک ہر گلی ہر راستے کی نکڑ پر بیٹھا تھا۔ لوگ چل پھر رہے تھے۔ وہ مدینہ منورہ جانے کی خوشی میں پھولے نہیں سما رہا تھے۔ کوئی اس کی جانب توجہ نہیں دے رہا تھا۔

دفعتاً میں نے محسوس کیا جیسے وہ مکہ معظمہ نہ ہو بلکہ یورپ کا شہر ہو۔ جیسے وہ چیکوسلاویکیہ کا پراگ ہو۔

عکسی مفتی اور پراگ:

مجھے اپنے بیٹے عکسی مفتی کا وہ خط یاد آ گیا جو اس نے پراگ پہنچ کر مجھے لکھا تھا:

"باپو! پراگ بڑا خوبصورت شہر ہے۔ یہاں بڑی گہما گہمی ہے لیکن پتہ نہیں کیوں سارے شہر پر بے نام اداسی کا سائبان سایہ کیے ہوئے ہے"۔

یہاں کے لوگوں کو تمام سہولتیں حاصل ہیں۔ بنیادی ضروریات کوڑیوں کے مول ملتی ہیں۔

سرکار روٹی کپڑا دیتی ہے، رہنے کو مکان دیتی ہے۔ تعلیم دیتی ہے۔ کرنے کو کام دیتی ہے۔ علاج معالجہ کرتی ہے۔ انہیں سب کچھ حاصل ہے، یہ سب فکر معاش سے آزاد ہیں۔ لیکن یہاں کوئی خوش نہیں، کوئی مطمئن نہیں۔

یہاں ہر سڑک پر ہر موڑ پر ایک نہ ایک گرجا موجود ہے۔ یہ گرجے گوتھک طرز تعمیر کے ہیں اور سنگ تراشی کے انمول نمونے ہیں۔ اندر نقاشی کے نایاب ڈیزائن بنے ہوئے لیکن انہیں دیکھنے والا کوئی نہیں۔ وہ سب مقفل پڑے ہیں۔ قفل زنگ آلود ہو چکے ہیں۔ چوکیداروں کو تنہائی نے بوڑھا کر دیا ہے۔

کمیونزم نے خدا کو ملک بدر کر دیا تھا، گرجوں کو مقفل کر دیا تھا۔

فالتو ہستی:

گرجے سے نکالے جانے کے بعد خدا گرجوں کے دروازوں کی دہلیزوں پر آبیٹھا۔ وہ آج بھی وہیں بیٹھا ہے۔ ہر گرجے کے صدر دروازے کے باہر وہ اپنے عصا پر ٹھوڑ رکھے بیٹھا ہے۔ وہ حسرت بھری حیرت سے گردوپیش کو دیکھ رہا ہے۔

ہر راہ گیر کو دیکھ کر اس کے چہرے کی لٹکتی ہوئی جھریوں میں امید کی کرنی چمکتی ہے۔ شاید یہ آنے والا مجھے دیکھ لے، شاید اس کی توجہ مجھ پر مبذول ہو جائے، شاید وہ رک کر پوچھے تو کون ہے؟ یہاں کیوں بیٹھا ہے؟ اور تو مجھے امید بھری نظروں سے کیوں دیکھ رہا ہے۔ شاید......

وہ ابھی تک اپنے بندوں سے مایوس نہیں ہوا۔ وہ ابھی تک اپنی تخلیق پر نازاں ہے۔ انہیں دیکھ دیکھ کر اپنے ہاتھ چومتا ہے۔ لیکن راہ گیر آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ کوئی اسے نہیں دیکھتا، کوئی اسے نہیں جانتا۔ کوئی اس کی موجودگی کو نہیں مانتا۔ کوئی اس سے بات نہیں کرتا۔ وہ ایک فالتو ہستی ہے۔

صرف پراگ میں ہی نہیں، ہر بڑے شہر میں۔ صرف کمیونسٹ ملکوں میں ہی نہیں، یورپ کے ہر ملک میں۔ وہ اپنا عصا تھامے سڑکوں، گلیوں، کوچوں میں گھوم رہا ہے، اس امید پر کہ کوئی اسے اپنا لے۔

منافقت منافقت منافقت:

اسے شہر نوردی کرتے ہوئے اتنے سال گزر گئے ہیں لیکن وہ مایوس نہیں ہوا۔ اس کی تھکی ہاری آنکھوں میں امید کی کرن بجھتی نہیں۔ الٹا اس میں مزید چمک پیدا ہو گئی ہے۔

یوں لگتا ہے جیسے وہ جانتا ہو، جیسے اسے یقین ہو کہ وہ دن جلد آنے والا

ہے۔ جب اہل مغرب پھر سے اسے DISCOVER کریں گے، اسے دیکھیں گے، تسلیم کریں اور منائیں گے اور پھر اسے انگلی لگا کر مشرق میں لائیں گے، ساتھ ساتھ لیے پھریں گے۔

پھر انگلی لگا کر اسے ساتھ ساتھ لیے پھرنا فیشن بن جائے گا۔ عین اسی طرح جس طرح ماضی میں شک کرنا۔ کفر، الحاد، سیکولرازم فیشن بن گئے تھے۔

پھر اللہ کو انگلی لگائے پھرنے کا فیشن مغرب سے ہم تک پہنچے گا اور ہم اس فیشن کو اپنا لیں گے، جس طرح ہم نے کفر و الحاد کے فیشن کو اپنایا تھا۔ جس طرح ہم نے منی سکرٹ کے فیشن کو اپنایا تھا۔ SLEAVELESS کو اپنایا تھا، بیل باٹم کو اپنایا تھا۔

مغربی قوموں میں کفر و الحاد اپنانے کی جرأت تھی۔ ان میں اللہ کو اپنانے اور انگلی لگانے کی بھی جرأت ہے۔ مغربی قوموں میں خلوص ہے فعالیت ہے، جرأت ہے۔ ہم میں منافقت ہے، منافقت ہے، منافقت ہے۔

جب میں بھاگا بھاگا ہوٹل پہنچا تو میرا دم چڑھا ہوا تھا۔

قدرت ناسازی طبع کی وجہ سے پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر عفت پاس بیٹھی ہوئی انہیں یہ SUGGESTION دے رہی تھیں کہ آپ آج کے آخری واجبات ادا کر سکتے ہیں، طواف وداع کر سکتے ہیں۔

''نہیں، نہیں، نہیں...... ہوٹل سے باہر نہ جانا۔'' میں نے گھبراہٹ میں کہا ''ہوٹل سے باہر نہ جانا''۔

''کیوں باہر کیا ہے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

ثواب کی گٹھڑیاں:

''باہر وہ ہر موڑ پر بیٹھا ہے۔ حرم کے ہر دروازے پر بیٹھا ہے۔ ہر جانے

والے کی طرف وہ امید اور منت بھری نگاہوں سے اپیل کرتا ہے "مجھے ساتھ لے چلو" لیکن وہ سب حج کے ثواب کی گٹھڑیاں اٹھائے یوں جا رہے ہیں جیسے لوٹ کے مال کا حصہ سمیٹ کر لیے جا رہے ہیں۔"

"وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، پھر بھی وہ بندوں سے مایوس نہیں ہوتا۔ وہ ان سے کبھی مایوس نہیں ہوا۔ لیکن...... لیکن اس کی طرف دیکھا نہیں جاتا ہے"۔

"وہ اکیلا رہ جائے گا۔ تنہا کوئی اسے ساتھ نہیں لے جائے گا اور پھر تازہ زائرین آ کر پھر سے اسے اس پتھر کے کوٹھے میں مقید کر دیں گے"۔

ڈاکٹر ہنسنے لگی "مفتی صاحب آپ کا ذہن تو خراب نہیں ہو گیا؟"

"آپ کا نہیں ہوا کیا؟" میں نے غصے میں کہا "نہیں ہوا تو اتنی دور چل کر آنے کا فائدہ؟ یہاں کون ہے جس ذہن خراب نہیں ہوا؟"

سب ٹھیک ہو جائے گا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" قدرت اپنی تکلیف بھول کر اٹھ بیٹھے ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی، جیسے دکھی دوسرے کو دکھ میں مبتلا دیکھ کر ان جانے میں ہمدردی بھری خوشی محسوس کرتا ہے۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ بولے۔

"میں ٹھیک ہونا نہیں چاہتا"۔ میں نے کہا۔

"یہ بیماری ہی ایسی ہے۔" ڈاکٹر عفت بولیں "جس کے تحت مریض صحت یاب ہونا نہیں چاہتا"۔

قدرت نے قہقہہ مارا، ان کی آنکھ کی چمک کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ بولے "آج شام کو جب آپ مدینہ شریف پہنچیں گے تو......"

"میں مدینہ منورہ جانا نہیں چاہتا"۔ میں چلایا۔

"ڈاکٹر اور قدرت حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے"۔

''میں یہیں رہنا چاہتا ہوں۔ میں خانہ خدا کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا۔''

''آپ چلیں تو سہی قدرت بولے ''وہاں سب ٹھیک ہو جائے گا''۔

میں کون ہوں:

''میں نہیں چاہتا کہ سب ٹھیک ہو جائے۔'' میں چلا کر بولا ''میں نہیں چاہتا کہ کچھ بھی ٹھیک ہو''۔

ان کی نگاہوں کو محسوس کر کے مجھ پر مزید گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ ''نہیں، نہیں'' ۔میں چلایا ''دراصل آپ کو یاد ہو گا'' عفت نے میری بات کاٹ کر کہا'' کہ مکہ معظمہ آتے ہوئے کار میں آپ نے کہا تھا ''مجھے مکہ معظمہ سے کوئی دلچسپی نہیں، مجھے اللہ تعالیٰ سے کیا لینا دینا، میں انہیں نہیں جانتا...... مجھے تو مدینہ منورہ کی لگن ہے''۔یاد ہے؟''

''ہاں یاد ہے''۔ میں نے جواب دیا۔

''پہلے آپ اس بات کا فیصلہ کریں کہ آپ کون ہیں''۔

''میں کون ہوں؟''

''آپ وہ ہیں جنہوں نے کہا تھا کہ میں اللہ کو نہیں جانتا۔ مجھے تو مدینہ منورہ کی لگن ہے، یا آپ یہ ہیں جو کہہ رہے ہیں ''میں مدینہ منورہ جانا نہیں چاہتا؟''

اس وقت میرا جی چاہ رہا تھا کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ دونوں کو چھوڑ کر صحرا میں چلا جاؤں اور وہاں جا کر دیوانہ وار نعرے لگاؤں: ''میں کون ہوں، میں کون ہوں؟''

تذکرۂ غوثیہ میں لکھا ہے کہ:

''ایک وہمی آدمی نے پہچان کے لیے اپنے گلے میں ایک سرخ رسی لٹکالی تاکہ لوگوں میں گم نہ ہو جائے۔ کسی مسخرے کو اس کے خبط کا علم ہو گیا۔ اس نے بوقت

خواب وہ دھجی اسکے گلے سے نکال کر اپنے گلے میں ڈال لی۔

جب وہ نیند سے بیدار ہوا تو دیکھا کہ علامت دوسرے کے گلے میں پڑی ہے۔اس نے کہا: میاں اگر تو میں ہے تو پھر میں کون ہوں میں تو ہوں یا تو میں ہے یا تو تو ہے اور میں میں ہوں۔بتائیں کون ہوں؟"

رخ:

قدرت بولے" اسلام آباد سے راولپنڈی آتے ہوئے وہ کون بزرگ آپ کو ملے تھے جنہوں نے آپ سے کہا تھا اگر رسول اللہ ﷺ آپ کو یہ کہتے ہوئے سن لیں کہ" میں اللہ کو نہیں جانتا، تو انہیں اس بات پر کتنا دکھ ہوگا"۔

"مجھے نہیں پتہ وہ کون بزرگ تھے"۔میں نے جواب دیا۔

"شاید اس بزرگ نے آپ کا رخ بدل دیا ہو۔آپ کی توجہ مدینہ منورہ سے ہٹا کر مکہ معظمہ کی طرف کر دی ہو"۔

"کیا واقعی؟"...... میں سوچ میں پڑ گیا۔کیا یہ اللہ والے اس قدر پر اثر لوگ ہیں کہ وہ ایک نگاہ سے دوسرے کا رخ بدلنے پر قادر ہیں؟

رخ (ATTITUDE) کیا ہے۔ رخ وہ پھول ہے جو شخصیت کے پودے کا ماحصل ہے۔تنا ٹہنیاں، پتے سب باہمی جدوجہد سے ایک پھول پیدا کرتے ہیں۔اسی طرح تعلیم، خیالات اور جذبات سب مل کر ایک رخ پیدا کرتے ہیں۔سالہا سال کی جدوجہد اور محنت کے بعد شخصیت کو ایک پھول لگتا ہے۔ایک رخ حاصل ہوتا ہے۔

کیا یہ بابا لوگ اتنے فعال ہیں؟ اتنے بڑے جادوگر ہیں کہ وہ ایک راہ گیر پر نگاہ ڈال کر اس کا رخ بدل سکتے ہیں؟

کیا میرا رخ میرا رخ نہیں؟ کیا مجھے اتنا اختیار نہیں کہ اپنا ایک رخ خود وضع

کروں اور اس پر قائم رہوں؟

حاجی صاحب:

پھر مجھے وہ دن یاد آ گیا جب میں دلی کی جامع مسجد میں حاجی صاحب کے ہاتھوں میں اپنے ہاتھ دیئے بیٹھا تھا۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب برٹرینڈ رسل، جولین، ہکسلے اور ہالڈین مجھے انگلی لگائے پھرتے تھے۔ جب میرا مطمح نظر SCIENTIFEC ATTITUDE کا حصول تھا۔ جب میرے لیے حصول علم کی بنیاد شک تھا۔ جب میرے نزدیک SCEPTICISM کی سیڑھیاں چڑھے بغیر حقیقت تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔

ان دنوں مجھے بے راہ روی کی طرف بھٹکنے سے بچانے کے لیے میری ماں نے مجھ سے کہا تھا: "بیٹا تو میرے کہنے میں نہیں۔تو ہمیشہ اپنی کرتا ہے۔میری ایک آخری بات مان لے، صرف ایک بات...... آخری بات۔ پھر میں تجھے کچھ نہیں کہوں گی۔تو دلی جا اور حاجی صاحب کی بیعت کر لے"۔

حاجی اماں کے پیرو مرشد تھے۔وہ بہت اچھے انسان تھے۔ بزرگ تھے یا نہیں ،اور تھے تو ان کا مرتبہ کیا تھا، یہ مجھے علم نہ تھا۔

ان دنوں میں اللہ یا اللہ کے بندوں سے واقف ہی نہ تھا۔ مجھے ان کے وجود کا احساس ہی نہ تھا۔ جب وجود ہی نہ ہو تو مرتبہ کیسا۔

رہی بیعت، تو بیعت کے مفہوم سے تو میں آج تک واقف نہیں۔ میں یہ لفظ کتابوں میں کئی ایک جگہ پڑھا ہے۔لیکن اس کے مفہوم سے واقف نہیں ہو سکا۔

بیعت:

حاجی صاحب مجھے جامع مسجد میں گئے، وضو کرایا۔ پھر ایک کونے میں بٹھا کر میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے اور کچھ پڑھنے لگے۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے بولے "آپ اپنا آپ میرے حوالے کر دینے کا جذبہ پیدا کریں"۔ میں نے اپنے ہاتھ چھڑا لیے اور کہا "حاجی صاحب! یہ فرمائیے کہ بیعت کا مطلب کیا ہے؟"

"اپنا آپ حوالے کر دینا، سپرد کر دینا، حوالگی اور سپردگی کا جذبہ پیدا کرنا۔" انہوں نے جواب دیا۔

"حاجی صاحب سپردگی کا جذبہ پیدا نہیں کیا جا سکتا، وہ پیدا ہو جاتا ہے، از خود" "اللہ کے ایسے بندے بھی ہیں جو دوسرے میں یہ جذبہ پیدا کر سکتے ہیں"۔ وہ مسکرائے۔

"یہ ظلم ہے"۔ میں نے کہا "مجھے زبردستی نیک نہ بنائیے۔ زبردستی مسلمان نہ بنائیے، مجھے موقع دیجیے کہ میں اپنی زندگی خود جیوں، اپنا راستہ خود تلاش کروں۔ اپنا رخ خود وضع کروں اور پھر اس پر قائم رہوں۔ مجھے مانگے کے زیور پہننے سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

حاجی صاحب مسکراتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ "آپ کا مرشد عظیم تر ہے" وہ بولے۔

"میری اس کے روبرو کوئی حیثیت نہیں۔ انشاءاللہ آپ ضرور پہنچ کر رہیں گے۔ صرف وقت حائل ہے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ!" کہتے ہوئے وہ جامع مسجد سے باہر نکل آئے۔

اس روز مکہ معظمہ کے ہوٹل فندق الکعکی میں بیٹھے ہوئے میں نے محسوس کیا جیسے میں ہنوز اسی مقام پر بیٹھا تھا جس پر ۴۳ سال پہلے تھا۔ جب میں دلی کی جامع مسجد میں حاجی صاحب کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے بیٹھا تھا۔

رکاوٹیں، رحمتیں:

"چھوڑیئے مفتی صاحب"۔ڈاکٹر عفت نے کہا "آپ کیا خواہ مخواہ کا جھگڑا لے بیٹھے"۔پھر وہ قدرت سے مخاطب ہوئیں "سمجھ میں نہیں آتا"۔وہ بولیں "کہ جب سے آپ یہاں آئے ہیں، آپ کے راستے میں اتنی رکاوٹیں کیوں حائل ہوتی جارہی ہیں۔چلئے اٹھیے حرم شریف چل کر طواف وداع کیجئے۔مفتی صاحب کی باتیں نہ سنئے۔مفتی صاحب خود آپ کے راستے کی رکاوٹ ہیں"۔

قدرت اٹھ بیٹھے اور مسکرا کر بولے "ہاں جبھی یہ مجھے عزیز ہیں"۔

قدرت اور ڈاکٹر عفت کے جانے کے بعد میں پھر سوچ میں پڑ گیا۔

"یہ قدرت کیسا آدمی ہے جو رکاوٹوں کو عزیز رکھتا ہے، جو RESESTANCE کو اہمیت دیتا ہے، جو ان کی پرورش نہیں کرتا۔ان سے خوف نہیں کھاتا، ان کے خلاف غصہ نہیں پالتا۔ان سے نفرت تک نہیں کرتا، الٹا انہیں عزیز رکھتا ہے۔"

"کیا رکاوٹیں واقعی در پردہ رحمتیں ہوتی ہیں؟ کیا رکاوٹیں واقعی اس بات کی دلیل ہوتی ہیں کہ آگے بڑھنے کا عمل جاری ہے؟ حرکت مثبت ہے اور رخ درست ہے"۔

"لیکن کیا رخ بھی اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔نہیں نہیں میرا دل نہیں مانتا۔اگر رخ بھی اسی کی دین ہے تو پھر ہماری CONTRIBUTION کیا ہے؟"

اگر اسلام آباد کی ایک ویران سڑک پر بیٹھا ہوا ایک بابا چشم زدن میں میری مرضی کے خلاف ان جانے میں میرا رخ اس حد تک موڑ سکتا ہے۔

اس روز مکہ معظمہ میں میری تمام تر توجہ خانۂ خدا پر مرکوز تھی۔میرے خیالات اور جذبات اللہ کے لیے وقف ہو چکے تھے۔ہر جگہ ہر مقام پر مجھے اللہ دکھائی دے رہا

تھا۔ وداع ہونے والے زائرین کے چہروں پر، ان کی نگاہوں میں، ان کے دکھ میں، ان کے بند بند میں۔

محاصرہ:

حرم شریف کے دروازوں پر، مکے کی گلیوں میں، کوچوں میں، سڑکوں پر، اللہ نے چاروں طرف سے میرا محاصرہ کر رکھا تھا۔ میں اس سے یوں بھرا ہوا تھا جیسے مالٹا رس سے بھرا ہوتا ہے۔ مجھ میں کسی غیر کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ قدرت اور ڈاکٹر عفت مجھے وہیں چھوڑ کر مدینہ منورہ چلے جائیں۔ اور میں مکے کی گلیوں، بازاروں اور سڑکوں پر گھومتا پھروں اور اس کا نظارہ کرتا رہوں۔ کبھی وہ خانہ خدا میں چھپا بیٹھا ہو، کبھی منڈیر پر سے جھانکتا ہو، کبھی زائرین کے خدوخال پر یوں جھلکتا ہو جیسے شوربے پر گھی تیرتا ہے، کبھی وہ حرم کے دروازوں پر بیٹھا ہو اور جانے والوں سے منتیں کر رہا ہو...... "مجھے اپنے ساتھ لے چلو، مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جاؤ، مجھے اپنا ساتھی بنالو، میری انگلی پکڑ کر مجھے ساتھ لے چلو"۔

مدینہ روڈ

وہی کالی موٹر، وہی کالی سڑک، اردگرد وہی ویرانہ، وہی اداسی قدیم جھلسی ہوئی پہاڑیاں، بالکل ویسا ہی منظر جیسا جدہ سے مکہ معظمہ کو جاتے ہوئے پیش پیش تھا۔

اللہ اور محمدؐ:

اس وقت میرے دل میں مدینہ منورہ کے لیے کوئی امنگ نہ تھی۔ البتہ خانہ خدا سے وداع ہونے کا ملال دل میں بوند بوند ٹپک کر رہا تھا؟ ایسا کیوں تھا۔ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

جب میں وطن سے روانہ ہوا تھا تو اگرچہ بظاہر حج کے لیے چلا تھا لیکن دل ہی دل میں میری منزل مدینہ منورہ تھی۔

عظیم ترین انسان:

مدینہ منورہ سے میری عقیدت بہت پرانی تھی۔ محمد ﷺ سے میرا جذبۂ احترام اسلام کی وجہ سے نہ تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ رسول اللہؐ تھے، بلکہ اس لیے کہ وہ عظیم ترین انسان تھے۔

اس زمانے میں انگریزی زبان میں کوئی ایسی کتاب دستیاب نہ تھی جو اسلام یا محمد ﷺ کا حقیقت پسندانہ جائزہ پیش کرتی۔ البتہ ایسے ہندو اور عیسائی مصنفوں کی کتابیں ضرور ملتی تھیں جو اسلام کے خلاف تعصب کی وجہ سے مشہور تھے، جو اسلام میں دشمنی میں پیش پیش تھے۔

یہ اس دور کی بات ہے کہ جب میں REVOLT کی عمر میں تھا۔ جب مذہب میرے نزدیک اپاہج کی اے لیے ایک سہارا تھا۔ اندھے کے لیے راستہ تلاش کرنے کی لاٹھی تھی۔ جب میں نہ تو اندھا تھا نہ اپاہج۔ جب میں سب کچھ جانتا تھا،

سمجھتا تھا۔ ان دنوں مجھے ایسی کتابوں کی تلاش تھی جو اسلام کے عیب گنواتی تھی۔ اس سے مجھے عجیب سی تسکین ہوتی تھی۔

میں نے ایسی کئی ایک کتابیں پڑھیں تھیں۔ سمتھ و ڈی این سین، لاجپت رائے، ایڈورڈ گبن، باڈلے، سٹینلے پول......

یہ سب مصنف اسلام کے خلاف زہر افشانی کرنے میں لذت محسوس کرتے تھے۔ لیکن نہ جانے بات کیا تھی کہ وہ سب یک زبان ہو کر محمدؐ کی تعریف کرنے پر مجبور تھے۔

یا اللہ تیرا یہ بندہؐ کتنا عظیم انسان ہوگا کہ دشمن بھی اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہیں۔ کوئی کہتا ہے انہوںؐ نے کبھی جھوٹ نہ بولا تھا۔ کوئی کہتا ہے انؐ کے قول و فعل میں تضاد نہ تھا، کوئی کہتا ہے انہوںؐ نے سب امتیازات مٹا دیئے کوئی کہتا ہے وہؐ گھر کا کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ جھاڑو دیتے، دودھ دوہتے، کپڑوں میں پیوند لگاتے، چولہے میں آگ جلاتے، لیکن کئی دن ایسے بھی آتے جب اس عظیم انسانؐ کے گھر چولہے میں آگ نہیں جلتی تھی۔

ان تعصب بھری تحریروں کے دھوئیں سے حضورؐ کی منور کرن ابھری اور میرے ذہن پر چھا گئی۔

پھر سالہا سال بعد میرے دوست ایم بی خالد نے مجھے مثبت مطالعے کی طرف مائل کر دیا۔

ایم بی خالد:

ایک روز میں خالد سے ملنے گیا تو میں نے دیکھا کہ اس کے پلنگ پر سرہانے تلے ایک ضخیم کتاب پڑی ہے۔

میں نے پوچھا "کیا یہ تمہاری بیڈ بک ہے؟"

خالد نے جواب دیا "یہ میری سب کچھ ہے ہیڈ بک ہے، حدیث ہے، قرآن ہے، سب کچھ ہے۔"

میں اس کتاب کو کھول کر دیکھا۔ وہ حضورؐ کی سوانح تھی۔

"یہ تو حضورؐ کی سوانح ہے" میں نے کہا۔

"یہ وہ کتاب ہے" خالد نے کہا "جس نے مجھے پھر سے مسلمان بنایا"۔

خالد بچپن سے ہی مذہب کا دیوانہ تھا۔

بچپن سے ہی اسلام اس کا اوڑھنا بچھونا تھا۔

پھر اسے ایک رہبر مل گیا۔ یہ رہبر صوم وصلوۃ کے پابند تھے۔ ان میں ہر وہ خوبی موجود تھی جو ایک صالح مسلمان میں ہونی چاہیئے۔

ان کے زیر اثر خالد کے جذبہ اسلام میں مزید رنگ پیدا ہوئے۔ عنفوان شباب میں اس نے داڑھی رکھ لی۔ صوم وصلوۃ کی پابندی کے علاوہ اس نے اسلام کی تبلیغ کرنی شروع کر دی۔

پھر ایک روز نہ جانے کس ضرورت کے تحت دروازہ کھٹکھٹائے بغیر اپنے مصالح راہبر کے کمرے میں جا داخل ہوا۔ وہاں اس نے اپنے راہبر کو ایسے عالم مصروفیت میں پایا کہ اس کے ذہن کا فیوز اڑ گیا۔

خالد نے داڑھی منڈوا دی، صوم صلوۃ چھوڑ دی، اسلام کے نام سے بیزار ہو گیا۔ سالہا سال خالد کی دنیا اجڑی رہی۔

پھر نہ جانے کس نے اس کے ہاتھ میں وہ کتاب تھما دی۔ اس نے حضورؐ کی سوانح کو پڑھا۔ اس کی اجڑی ہوئی دنیا کے تنکے پھر سے یک جا ہو گئے۔ اسلام جو اس کی نگاہ میں ریزہ ریزہ ہو چکا تھا، پھر سے استوار ہو گیا۔ خالد پھر سے مسلمان ہو گیا۔

حضورؐ کی سوانح پڑھ کر میں مسلمان تو نہ ہوا لیکن حضورؐ کے لیے محبت اور احترام کی مشعل میرے دل میں ضرور روشن ہو گئی۔

نوجوانی میں ہی میرے دل میں یہ آرزو تھی کہ اس عظیم انسان کو جا کر سلام کروں۔ جس کی عظمت کو سبھی تسلیم کرتے تھے، جس کی انسانیت کے سبھی گن گاتے تھے۔ اپنے، بیگانے، دوست دشمن سبھی۔

جس ماحول میں میں نے پرورش پائی تھی اس میں محمد ﷺ کی محبت اور عقیدت یوں رچی بسی تھی جیسے گندھے ہوئے آٹے میں پانی۔ محمد ﷺ کا نام آتا تو لوگ انگلیاں چوم کر آنکھوں پر لگاتے۔ محمدؐ کا تذکرہ ہوتا تو آنکھیں بھر آتیں، دل دھڑکتے محمدؐ کا نام سن کر لوگوں پر کیفیت طاری ہو جاتی۔ سر دھنتے، حال کھیلتے، وجد کرتے۔

اللہ کا نام چاہے لیے جاؤ، کچھ بھی نہ ہوتا، کچھ بھی نہیں۔

ان دنوں میں محسوس کرتا تھا کہ میں واقعی محمڈن MOHAMMADAN ہوں، مسلم نہیں کیونکہ مجھے محمد ﷺ سے لگاؤ ہے، اسلام سے نہیں۔ اس میں میرا قصور نہیں تھا۔ برصغیر کے سبھی مسلمانوں کو محمد ﷺ سے محبت تھی۔ یہ وہ دن تھے جب مسلمانوں کے جذبے کا یہ عالم تھا کہ:

خدا گر محمدؐ کو پیدا نہ کرتا
قسم ہے خدا کی، خدائی نہ ہوتی

پاکستان:

پھر قیام پاکستان کے بعد میرے دل میں حضور اعلیٰؐ سے ایک نیا رشتہ ابھرا۔ اس رشتے کی نوید سب سے پہلے بھائی جان، جان محمد بٹ صاحب نے دی۔ جان محمد بٹ میرے اولین اور بنیادی رہبر ہیں۔ وہ بات بات پر فرمایا کرتے: مفتی جی

آپ پاکستان کا غم نہ کھائیں۔ پاکستان جس نے بنایا ہے وہ خود اس کی رکھوالی کریں گے۔ آپ صرف اس بات کا خیال رکھا کریں کہ آپ کا کوئی قول یا فعل ایسا تو نہیں جو پاکستان کے لیے باعث نقصان ہو"۔

ایک روز میں نے بھائی جان سے پوچھا۔ میں نے کہا "پاکستان کے محفوظ ہونے کے متعلق آپ اتنے وثوق سے کیسے بات کر سکتے ہیں"۔

بھائی جان نے فرمایا "ہمارے سرکار قبلہ ان بزرگوں میں سے تھے جو قیام پاکستان کے لیے کام کرنے پر مامور تھے ہمیں علم ہے کہ پاکستان کے سر پر حضور اعلیٰؐ کا ہاتھ ہے۔"

اس روز میں نے ایسے محسوس کیا جیسے پاکستان کے توسط سے میں حضور اعلیٰؐ کے قدموں میں جا بیٹھا ہوں۔

پھر جب میرا تبادلہ کراچی ہو گیا اور وہاں میں قدرت اللہ سے متعارف ہوا، اور ہم دونوں آپس میں ملنے لگے، تو جھنگ کے ایک بزرگ کا خط موصول ہوا۔ لکھا تھا: ان دنوں جن صاحب سے آپ ملنے لگے ہیں ان کو ہمارا سلام دیجیے۔

چند ایک ماہ کے بعد جھنگ کے ان بزرگ سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا کہ "جن صاحب سے میں ملنے جلنے لگا تھا ان کو خصوصی سلام بھیجنے کی کیا وجہ تھی؟"

انہوں نے فرمایا "وہ صاحب حضور اعلیٰؐ کے ادنیٰ غلام ہیں اس لیے"۔

ادنیٰ غلام:

"ادنیٰ غلام؟" بات میری سمجھ میں آئی۔

جھنگ والے بزرگ نے فرمایا "سرکار اعلیٰؐ کی شان نرالی ہے۔ غلاموں میں جتنا ادنیٰ اتنا ہی ارفع"۔

اس وقت میں نے یوں محسوس کیا جیسے حضور اعلیٰؐ کے پاؤں میری آنکھوں کو چھو رہے ہوں۔ یہ احساس قربِ قدرت کے توسط سے تھا۔

اس کے بعد جب میری تعیناتی پریذیڈنٹ ہاؤس راولپنڈی میں قدرت اللہ کے تحت ہوگئی تو ایک روز ایک شخص مدینہ منورہ سے صدر کے نام ایک پیغام لایا۔

یہ پیغام مسجد نبوی کے چابی بردار کی طرف سے تھا۔

آپ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ فوج میں بھرتی ہوئے، جنگ عظیم میں مڈل ایسٹ میں پہنچے۔ حضور اعلیٰؐ کی خدمت میں حاضری کا جذبہ جنون بن گیا۔ ایک روز چپکے سے مدینہ منورہ کو عازم ہوئے۔ وہاں پہنچ کر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ وہیں کے ہو رہے۔ خادم بنے۔ پھر یہ عظیم اعزاز حاصل ہوا کہ مسجد نبویؐ کے چابی بردار بن گئے۔

بھیڑوں کا رکھوالا:

ان کا یہ پیغام صدر پاکستان کے نام ہے۔

فرمایا: ''۱۹۴۷ء میں ہم نے خواب دیکھا۔ دیکھا کہ ایک پودا مسجد نبویؐ سے پھوٹا اور دیکھتے ہی دیکھتے بیل کی طرح دور بہت دور تک چلا گیا۔ اس کے پرلے سرے پر سبز پتیاں نکل آئیں۔''

''کئی ایک سال کے بعد پھر وہی خواب دیکھا۔ دیکھا کہ اس پودے کے پرلے سرے پر جو پتیاں پھوٹی تھیں، وہ خشک ہوگئی ہیں لیکن مسجد نبویؐ میں اس کی جڑ جوں کی توں ہری ہے۔''

''کئی ایک سال کے بعد اب پھر وہی خواب دیکھا ہے۔ پرلے سرے کی خشک پتیاں پھر سے ہری ہو رہی ہیں۔ مبارک ہو۔''

فرمایا: ''صدر پاکستان کو ہمارا پیغام دینا۔ کہنا بھیڑوں کا رکھوالا خود چھاؤں

میں نہیں بیٹھتا"۔

اس پیغام کو سننے کے بعد میں نے محسوس کیا جیسے میں اس پودے کی ایک مرجھائی ہوئی پتی ہوں جس میں جڑیں مسجد نبویؐ میں ہیں۔

اس روز میں حضور اعلیٰؐ کی ایک بھیڑ بن گیا۔

اس وقت میں ان حضور اعلیٰؐ کی خدمت میں حاضری دینے جا رہا تھا۔

اور اس شخص کی معیت میں جا رہا تھا جسے حضورؐ کا اک ادنیٰ غلام ہونے کا شرف حاصل تھا۔

چاہیے تو یہ تھا کہ جذبے کی شدت سے میرا سینہ پھٹ جاتا، جسم کی پھچھوندیاں اڑ کر سڑک پر بچھ جاتیں، مٹی میں جذب ہو جاتیں اور پھر صدیوں اس راہ پر جانے والوں کے قدم چومتا رہتا۔

لیکن کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا، کچھ بھی نہیں۔ دل بند، قلب بند، خالی، جیسے ساری کائنات کا خلا میرے سینے میں آ گھسا ہو۔

عالم:

اس خلا کی وجہ سے میں شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ احساس شرمندگی بڑھتا گیا، حتیٰ کہ وہ اس قدر بڑھ گیا کہ میں نے جھوٹ موٹ سوچنا شروع کر دیا کہ میں مدینہ منورہ میں حاضری دینے کے جذبے سے سرشار ہوں۔ میں تو ہمیشہ سے حضورؐ کا دل دادہ رہا ہوں۔ ہمیشہ سے۔

میری اس منافقت پر میرے روبرو ایک چہرہ ابھرا۔ "آخ تھو" کی آواز سنائی دی۔ میرے منہ پر تھوک کا ملبہ آ گرا اور میں نے محسوس کیا جیسے میں عالم تھا۔

عالم ایک عیاش تاجر تھا۔ دنیا کی سیاحت کے لیے پاکستان سے نکلا۔ اتفاقاً پہلے سعودی عرب جا پہنچا۔ سوچا چلو، چلتے چلتے عمرہ ہی کر لیں۔ مکہ معظمہ پہنچ کر اس

نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ ایک غلیظ شے ہے۔ یہ احساس اس پر طاری ہوتا گیا، ہوتا گیا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ لوگ حیرت اور نفرت سے اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ "تو یہاں...... تو"؟ حقارت بھری آوازیں چاروں طرف گونجیں۔ پھر "آخ تھو" کی آواز آئی۔ اس کے منہ پر تھوک کا ملبہ آگرا۔ پھر چاروں طرف سے آخ تھو، آخ تھو کی چاند ماری ہونے لگی۔ عالم بھاگ اٹھا۔ سر پر پاؤں رکھ کر مکے سے بھاگا۔

"کہاں جاؤں، کہاں جاؤں" وہ سوچنے لگا۔

مدینے شریف جانے والی بس نے اسے اٹھایا۔

مدینے شریف میں داخل ہونے سے پہلے اسے خیال آیا اگر یہاں بھی پناہ نہ ملی تو؟ اس پر خوف طاری ہو گیا۔ وہ بس سے اتر گیا۔ ڈرتا ڈرتا پیدل شہر میں داخل ہوا۔

شہر کے باہر حضورؐ خود کھڑے تھے "آ جا عالم"۔ حضورؐ نے فرمایا "آ جا ڈر نہیں"۔

عالم آج تک مدینے میں مقیم ہے۔

دفعتاً مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ میں تو منافق ہوں۔ میرا قلب غلاظت سے بھرا ہوا ہے۔ پھر میں کس منہ سے حضورؐ کی خدمت میں حاضری دے سکتا ہوں۔ حضورؐ صرف عظیم انسان ہی نہیں۔ رسول اللہؐ بھی ہیں۔ اگر انہوں نے مجھے رد کر دیا تو "نہیں نہیں، ایسا نہ کہو، ایسا نہ کہو" حمیدہ کور میری منتیں کرنے لگی۔

حمیدہ کور:

حمیدہ ایک خوبصورت نوجوان لڑکی تھی۔ ابھی وہ دس سال کی تھی کہ تقسیم ہند عمل میں آ گئی۔ سکھوں کے جتھے نے ان کے گاؤں پر حملہ کر دیا۔

جاتے ہوئے حملہ آور سکھ، حمیدہ کو اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں پہنچ کر حمیدہ کور بن گئی۔ پھر تین سال کے وہ لہنا سکھ کی بیوی بنا دی گئی۔ اس کے گھر دو بچے ہوئے۔ اس کے باوجود وہ گھر حمیدہ کا گھر نہ بنا۔ حمیدہ ان بچوں کی ماں نہ بن سکی۔ لہنا سکھ کی والہانہ محبت اسے اپنا نہ سکی۔ دن رات، صبح شام وہ اللہ سے دعا کرتی "یا اللہ مجھے اس کال کوٹھڑی سے نکال"۔

پھر حالات نے ایسا رخ پلٹا کہ ہندوستان پولیس حمیدہ کو بھارت سے لا کر پاکستان چھوڑ گئی۔ بڑی مشکل سے اسے ماں باپ کا گھر مل گیا۔ لیکن ماں باپ نے اسے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ وہ برادری کی وجہ سے مجبور تھے کیونکہ حمیدہ سکھ کی بیاہتا تھی اور دو سکھ بچوں کی ماں تھی۔

پھر حمیدہ نے گڑگڑا کو رسول اللہ ؐ کی خدمت میں عرض کی "یا رسول اللہ ؐ! مجھ پر میرا اپنا وطن تنگ ہو گیا ہے مجھ پر میرے اپنے ماں باپ کے گھر کر دروازہ بند ہو گیا ہے، میرے لیے اب دنیا میں کوئی پناہ گاہ نہیں رہی۔ یا رسول اللہ ؐ! مجھے اپنے قدموں میں بلا لو۔" حضور ؐ کے قدموں میں امان پانے کی خواہش حمیدہ کے دل میں جنون بن گئی۔

لیکن مدینہ منورہ میں پہنچنے کے لیے روپے کی ضرورت تھی۔ روپیہ اکٹھا کرنے کی صرف ایک صورت تھی۔ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے حمیدہ نے اپنا جسم بیچنا شروع کر دیا۔ دو ایک سال میں رقم اکٹھی ہو گئی تو حمیدہ عازم مدینہ منورہ ہو گئی۔

جب حمیدہ مدینہ منورہ کے قریب پہنچی تو اس کے دل پر دہشت سوار ہو گئی۔ دفعتاً اسے خیال آیا کہ وہ تو حرام کی کمائی سے وہاں پہنچی ہے۔ وہ کس منہ سے مدینہ میں داخل ہو سکتی ہے۔ ناپاک جسم لے کر کس طرح مسجد نبوی ؐ میں حاضری دے سکتی ہے؟ روتے روتے حمیدہ کی گھگھی بندھ گئی۔

اسی حالت میں حمیدہ کی آنکھ لگ گئی۔ حضورؐ خود تشریف لائے، فرمایا "اٹھو حمیدہ ملال نہ کرو، دیکھو تو تمہارا جسم کتنا پاکیزہ ہے"۔

حمیدہ نے دیکھا، اس کا جسم منور تھا۔

پھر وہ جاگی تو اس نے اپنے آپ کو مسجد نبویؐ میں پایا..... حمیدہ آج تک مدینہ میں مقیم ہے۔

حمیدہ کی بات سے میرے دل میں اطمینان سا پیدا ہو گیا۔ "میں بھی بیوقوف ہوں" میں نے سوچا "جو خواہ مخواہ ڈر رہا ہوں۔ یہاں تو رحمت کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہے، پھر ڈر کیسا۔ "یا حضورؐ یہ سچ ہے"۔ میں نے گڑگڑا کر گزارش کی کہ اس وقت میرے دل میں مدینہ منورہ میں حاضری دینے کی طلب نہیں، پھر میں حضورؐ کے ایک ادنیٰ غلام کی معیت میں حاضر ہو رہا ہوں۔

کچھ دیر تو میں مطمئن بیٹھا رہا۔ پھر وسوسوں نے پھر سے سر اٹھایا۔ خیال آیا کہ حمیدہ کا صرف جسم ناپاک تھا میری تو روح بھی ناپاک ہے۔ حمیدہ نے تو صرف جسم بیچا تھا، میں نے تو ذہن اور روح ہی گروی رکھے ہوئے تھے۔

تڑخیں ہی تڑخیں:

میرا جی چاہتا تھا کہ میں قدرت سے پوچھوں کہ میرے دل میں وسوسے کیوں اٹھ رہے ہیں۔

میں نے قدرت کی طرف دیکھا۔ پچھلی سیٹ پر ڈاکٹر عفت کے ساتھ بیٹھے ہونے کے باوجود وہ ہم سے کوسوں دور تھے۔ پتہ نہیں وہ کہاں تھے۔ تھے بھی یا نہیں۔ بہرطور وہ نہ تو موٹر میں تھے، نہ اس کالی سڑک پر تھے جو مدینہ منورہ کی طرف دوڑے جا رہی تھی۔

ایک بات بہرطور واضح تھی۔ قدرت کے چہرے پر دراڑیں پڑی ہوئی تھیں

جیسے بارش کے دباؤ تلے کچی دیوار میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ ان کا چہرہ جگہ جگہ سے تڑخا ہوا تھا، جیسے شیشے کا گلاس چور چور ہو رہا ہو۔

ارے! میں چونکا! میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس گلاس پر ایک تازہ تڑخ نمودار ہوگئی۔ پھر جو میں غور سے قدرت کی طرف دیکھتا رہا تو مجھے پتہ چلا کہ ہر میل کے بعد ان کے چہرے ہر ایک تازہ دراڑ پڑتی جا رہی تھی۔ پتہ نہیں ہو کون سا دباؤ تھا جو ہر ساعت اس شدت سے بڑھتا جا رہا تھا کہ قدرت کو چور چور کئے جا رہا تھا۔

میرے دل میں ترس کی ایک لہر دوڑ گئی۔ یا اللہ! منزل تک پہنچتے پہنچتے اس شخص کی کیا کیفیت ہو جائے گی۔

پھر مجھے ہنسی آ گئی "میں بھی کیسا پاگل ہوں کہ اس شخص کو رہبر بنائے بیٹھا ہوں جسے اپنا ہوش نہیں۔ جو آپ لت پت کے اس عالم میں ہے، وہ مجھے کیا راستہ دکھائے گا۔"

سکر اور صحو:

اس وقت میرا جی چاہا کہ منبر پر کھڑا ہو کر لوگوں کو تلقین کروں: "اے لوگو! ندی کو رہبر بنانا۔ کبھی بھول کر بھی سمندر کو رہبر نہ بنانا۔ اس لیے کہ ندی ایک سمت بہتی ہے۔ وہ تمہیں انگلی پکڑ کر ساتھ لے جائیگی، کہیں تو پہنچا دے گی۔ یہ تو نہیں کہ سمندر کی طرح آپ کو اس قدر پھیلا دے گی کہ نہ کوئی سمت رہے گی، نہ کوئی بہاؤ، نہ رخ"۔

"اے لوگو! کسی ہیڈ کانسٹیبل سے تعلق استوار کرنا، ڈی آئی جی سے نہیں۔ ہیڈ کانسٹیبل آپ کے چھوٹے چھوٹے کام کرے گا۔ آپ کی ٹھوس امداد کرے گا۔"

"اے لوگو! میں نے بھول کی کہ سمندر کو راہبر بنا لیا اور اب میں خس و خاشاک کی طرح لہروں کے رحم و کرم پر پڑا ہوں۔ نہ میری کوئی سمت ہے نہ منزل

ہے''۔

پہلے بھی میں نے کئی بار قدرت سے پوچھ دیکھا تھا جب کبھی مجھ پر بالکل ایسی ہی کیفیت طاری ہوئی تھی جیسے اس روز مدینہ منورہ جاتے ہوئے طاری تھی۔ میں نے قدرت سے پوچھا تھا ''مجھے بتائیے کہ عالم سکر کیا ہے؟ عالم صحو کیا ہے؟ کبھی سرشاری کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی خلائی۔ ایسا کیوں ہے؟''

''ایک ہی بات ہے''۔ قدرت نے جواب دیا تھا ''سرشاری ہو یا خلائی کیفیت، سکر ہو یا صحو، یہ ایک ہی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ صحو ہو تو سکر کی آرزو نہ کرو، صحو ہو تو دل میں ملال نہ لاؤ، صحو ہو تو پڑا ہونے دیجئے۔ سرشاری ہو تو اسے اہمیت نہ دیجئے۔''

دفعتاً ایک جھٹکے سے گاڑی رک گئی۔ آیئے آیئے رابطہ افسر گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے بولا ''میں آپ کو ایک مقام دکھاؤں''۔

جنات کا مسکن:

ہم سب گاڑی سے باہر نکل آئے۔ سامنے پہاڑیوں کا ایک سلسلہ سا کھڑا تھا۔ سڑک کے پہلو میں ڈھلان پر ایک ٹوٹی پھوٹی سی چاردیواری کے اندر چند ایک پتھر کی سلیں سی بکھری پڑی تھیں۔ چند ایک پتھر یہاں وہاں زمین گڑے ہوئے تھے۔ اس قطعۂ زمین پر عجیب سی وحشت چھائی ہوئی تھی۔ زمین کی ساخت عجیب کی سی تھی۔ مٹی کا رنگ بھی عجیب سا تھا۔ ہلکی ہلکی سرخی، زردی سے ملی جلی ہوئی تھی۔ کہیں زردی ابھری ہوئی تھیں کہیں سرخی۔ ایک گہرا سکوت چھایا ہوا تھا، ایک ویرانی...... سرخ ویرانی، جیسے...... جیسے اس مقام کو جن روند گئے ہوں۔ ''یہ جنوں کا مسکن ہے کیا؟'' میں نے حسن سے پوچھا۔

''یہ شہدائے بدر ہیں۔'' وہ بولا ''یہ شہدائے بدر کی قبریں ہیں۔ یہ وہ مقام ہے

جہاں جنگ بدر لڑی گئی تھی۔"

واقعی وہ جنات کا مسکن تھا۔ شہدائے بدر جن ہی تو تھے۔ ایثار و قربانی کے جذبے نے انہیں جن بنا دیا تھا۔ وہ قبریں نہیں لگتی تھیں، قبریں تو ان کی ہوتی ہیں جو فوت ہو جاتے ہیں۔ شہید تو فوت نہیں ہوتا۔ شہید کا جسم ہمیشہ گرم رہتا ہے، خون ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ شاید رستے ہوئے خون کی وجہ سے وہ میدان اور پہاڑیاں گلابی ہو رہی تھیں۔

دفعتاً مجھے یاد آیا کہ وہ تو ہمارے محسنوں کا مسکن تھا۔ میر اسر احسان مندی اور شکر گزاری کے جذبات سے جھک گیا۔

شرمساری:

۱۹۶۵ء کی جنگ کی یادیں پھر سے تازہ ہو گئیں۔

لاہور کے مشہور و معروف حکیم اور دانش ور نیر واسطی صاحب ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران مدینہ منورہ میں مقیم تھے۔ جب واپس پاکستان پہنچے تو انہوں نے ریڈیو پاکستان سے جنگ کے متعلق اپنے تاثرات بیان کئے۔ فرمایا:

"لاہور کی وہ خاتون، جو ۱۸ سال سے مدینہ منورہ میں مقیم ہے اور روضہ پاک کی جالی کے پاس بیٹھی رہتی ہے، اس نے بتایا کہ ۶ ستمبر کو میں نے حضورؐ اعلیٰ کو اس قدر پریشان حال دیکھا جیسا کہ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔"

"ایک بزرگ جو روز روضۂ اطہر پر مجھ سے ملتے تھے ۶ ستمبر کو کہیں دکھائی نہ دیئے۔ ایک مرید نے بتایا کہ آپ جہاد کے لیے پاکستان گئے ہیں۔"

"ایک اور بزرگ نے فرمایا کہ جنگ بدر کے تمام شہید پاکستان پہنچ چکے ہیں تا کہ جہاد میں شامل ہو سکیں۔"

پھر اکتوبر ۶۵ء میں روزنامہ جنگ میں کئی ایک خبریں اس موضوع پر شائع

ہوئی تھیں جن میں بھارتی قیدیوں کے بیانات بھی شامل تھے۔ان بیانات کے مطالعے سے ظاہر تھا کہ بھارتی سپاہی پاکستان کی اس فوج سے خائف تھے جو تلواروں سے لڑتی تھی اور جس کی تلواروں سے بجلی کے شعلے نکلتے تھے۔

شہداء بدر:

آج میں ان شہداء کے حضور میں کھڑا تھا۔شرم سے میرا سر جھکا ہوا تھا۔میں ان کی جانب سر اٹھا کر نہ دیکھ سکتا تھا اس لیے کہ وہ ہماری مدد کے لیے اتنی دور سے جنگ میں شرکت کرنے کے لیے یہاں آئے تھے لیکن ہم نے ان کا ساتھ نہ دیا تھا۔ الٹا ہم نے جنگ بندی کا حکم دے دیا تھا اور وہ حیرت سے ہمارا منہ تکتے رہ گئے تھے کہ یہ پاکستان نے کیا کر دیا۔

ان دنوں خوشاب کے بزرگ ایڈووکیٹ صاحب نے کئی ایک خط صدر کے نام لکھے تھے جن میں بار بار تاکید کی تھی کہ جنگ بندی کو تسلیم نہ کرنا۔

قدرت اللہ ان دنوں ہالینڈ میں سفیر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔انہوں نے بھی صدر ایوب کو خط لکھ کر مشورہ دیا تھا کہ جنگ بندی سے متعلق مذاکرات کو غیر معمولی طول دے دیا جائے۔گفت وشنید میں جنگ بندی کے مقررہ وقت کو ٹال دیا جائے۔اگر جنگ بندی ضروری ہو تو عارضی تعطل کے فوری بعد لڑائی از سر نو چھیڑ دی جائے۔

پتہ نہیں کیوں پاکستان کے سربراہوں کو ہمیشہ بزرگوں کی طرف سے مشورے اور ہدایات موصول ہوتی رہی ہیں۔

بہر حال ہمارے سربراہوں نے ذاتیات کی بنا پر ہمیشہ جنگ کو ٹالنا چاہا۔ صدر ایوب اقتدار ہاتھ سے جانے کے خوف سے جنگ کرنے کے حق میں نہ تھے۔ جنرل یحییٰ مغربی پاکستان میں اپنی حکومت قائم رکھنے کی غرض سے ایسٹ پاکستان کو

دشمنوں کے حوالے کرنے کا پہلے سے ہی فیصلہ کر چکے تھے۔

پاکستان کو کوئی ایسا سربراہ نصیب نہ ہوا تھا جو مجاہدانہ شان سے اللہ کے نام پر جنگ کرتا۔ جو شہیدان بدر کی امداد پر ایمان رکھتا اور ان کا ساتھ دیتا۔

ہاں! شہیدان بدر کے روبرو میرا سر شرمساری کی وجہ سے جھکا ہوا تھا۔

پھر مجھے یاد نہیں، پتہ نہیں ہم کب موٹر میں بیٹھے، کب موٹر چلی، کتنی دیر چلتی رہی۔

تبرکات مدینہ

مدینہ:

ڈاکٹر عفت کی آواز نے مجھے چونکا دیا: ''مفتی صاحب! وہ کہہ رہی تھیں ''ہم مدینہ منورہ میں داخل ہو چکے ہیں''۔ ڈاکٹر کا اعلان سن کر میں چونکا ضرور لیکن یوں جوں کا توں بیٹھا رہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو، جیسے ہم مدینہ منورہ نہیں بلکہ کاموںکے میں داخل ہو رہے ہیں۔

سڑک کے دونوں اطراف عام سے مکانات بنے ہوئے تھے۔ ایک منزلہ مکانات۔ بازار میں لوگ کاروباری انداز میں چل پھر رہے تھے۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ پنجاب کا کوئی قصبہ ہو۔

ہماری گاڑی ایک چار چھ منزلہ ہوٹل کے سامنے رک گئی۔ رابطہ افسر باہر نکلے۔ ہوٹل کے منیجر سے باتیں کرنے کے بعد ہمارے پاس آئے، بولے ''آیئے میں آپ کو آپ کے کمرے دکھا دوں۔''

اگرچہ ہوٹل جس پر فندق الستیر (FANDAQ AL STAISAR) کا بورڈ لگا ہوا تھا، عمدہ سٹائل کا بنا ہوا تھا لیکن ایسا لگتا تھا جیسے پاکستان کا کوئی متوسط

درجے کا ہوٹل ہو۔

جب ہم ہوٹل میں پہنچے تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔ قدرت اللہ کی طبیعت حسب معمول ناساز تھی...... شیشے کا گلاس چور چور تھا۔

قدرت بولے "مفتی صاحب! آپ مسجد نبویؐ سے ہو آئیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔"

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ میں اکیلا مسجد نبویؐ میں نہیں جاؤں گا۔ یہ سوچ کر میں ہوٹل کی کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

بازار:

سامنے ایک عام سا بازار تھا۔ زیادہ تر دکانیں یک منزلہ تھیں۔ تنگ، پرانی، دھواں آلود۔ عین سامنے کوئی بھاما جھا دکان پر بیٹھا تکلے تل رہا تھا۔ اس کے ساتھ والی دکان پر ایک کشمیری تنور پر نلچے لگا رہا تھا۔ ساتھ ہی ایک کھوکھے میں کڑک چائے بن رہی تھی۔ کیتایاں آگ پر رکھی ہوئی تھیں۔ دکان کے سامنے کرسیوں پر گاہک بیٹھے ہوئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ہمارے صوبہ سرحد میں کسی بس سٹاپ پر چائے کا ہوٹل ہو۔

یہ منظر دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مکہ معظمہ سے چل کر ہم پاکستان کے کسی قصبے میں آ گئے ہوں۔ میرا جی چاہا کہ چل کر دیکھوں تو سہی دوسرے بازار کیسے ہیں۔ سیڑھیاں اتر کر میں ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ ابھی بیس قدم ہی چلا تھا کہ ایک وسیع میدان نظر آیا جس میں لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

"ارے......!" میں نے مڑ کر دیکھا میدان کے ایک طرف مسجد نبویؐ کی اونچی لمبی دیواریں کھڑی تھیں۔ وہی سنگ مرمر جو مکہ معظمہ کی مسجد پر لگا ہوا تھا وہی اونچی محرابیں، وہی انداز تعمیر۔ چند ایک ساعت کے لیے میں وہاں کھڑا مسجد نبویؐ

کے بیرونی منظر کو دیکھتا رہا۔ پھر اونچی محراب والے دروازے کی طرف چل پڑا۔

یہ دروازہ خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ عورتیں مسلسل آ جا رہی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی مرد بھی اس دروازے سے داخل ہو جاتا۔ عورتوں کی بھیڑ میں سے گزرتا۔ نہ عورتوں کو احساس ہوتا کہ ان میں مرد آ گھسا ہے، نہ ہی مرد کو احساس ہوتا کہ وہ عورتوں کی بھیڑ میں آ پھنسا ہے۔ اور نہ ہی دروازے پر کھڑا دربان اسے ٹوکتا کہ اس دروازے سے داخل نہ ہو، ادھر دوسرے دروازے سے جا۔

ایٹمی آنکھیں:

جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ بابِ نسواں پر کھڑا وہ دربان نہ تھا بلکہ جوتوں کا رکھوالا تھا۔

اس کا قد اونچا لمبا تھا، رنگ گندمی تھا، چہرے پر ایک عجیب سی کرختگی اور سنجیدگی طاری تھی۔ خدوخال سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ عرب نہ ہو بلکہ جہلم یا کیمبلپور کا جوان ہو۔ اسے قریب سے دیکھنے کے لیے میں محراب میں جا کھڑا ہوا اور بلا سوچے سمجھے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگا۔ میری نگاہ کو محسوس کر کے دفعتاً وہ چونکا جیسے کوئی کتا اس کی جائے نماز پر آ بیٹھا ہو۔

دو سرخ چیونٹے میری طرف لپکے۔

دو قہر آلود شنگرفی آنکھیں میرے سامنے معلق ہو گئیں۔ مسجد نبویؐ مدینہ منورہ بلکہ ساری کائنات ان سرخ آنکھوں کی اوٹ میں آ گئی۔ ان سرخ آنکھوں نے میرے جسم، قلب اور روح کو بلو کر رکھ دیا۔ یوں کیل دیا جیسے مصور کینوس کے ٹکڑے کو میخوں سے بورڈ پر کیل دیتا ہے۔ میں نے محسوس کیا جیسے میں قصائی کی دکان پر بکرے کی طرح دو سرخ کنڈیوں پر ٹنگا ہوا ہوں۔

صدیوں میں ان سرخ کنڈیوں پر ٹنگا رہا۔

پھر جو مجھے ہوش آیا تو میں محراب کی دیوار کا سہارا لیے کھڑا تھا۔ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں، جسم سے گویا جان نکل چکی تھی، ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ دیر تک میں وہاں ڈھیر پڑا رہا۔ پھر سامنے اس لمبے تڑنگے جوتا رکھوالے کو اپنے کام میں ہمہ تن مصروف دیکھ کر میری زائل شدہ یادداشت پھر سے لوٹ آئی ''یا اللہ! یہ کون شخص ہے جس کی آنکھوں میں اتنی طاقت ہے جیسے ان میں ایٹمی ذرات ٹوٹ رہے ہوں''۔

''یا اللہ! اس درگاہ کی کیا عظمت ہو گی جس کے ایک ادنیٰ کارندے کی آنکھیں ایٹمی توانائی سے مسلح ہیں'' اَن جانے میں مَیں پھر اس جوتا رکھوالے کی طرف دیکھنے لگا۔ دفعتاً اس نے پھر گردن موڑی۔ پیشتر اس کے کہ اس کی نگاہ مجھ پر پڑتی، ڈر کے مارے میں وہاں سے بھاگا حتیٰ کہ مسجد نبویؐ سے دور پہنچا۔ میرا سانس پھول گیا اور میں دم لینے کے لیے پتھر پر بیٹھ گیا۔

چیزیں ہی چیزیں:

پھر جو آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہوں تو میں مسجد نبویؐ سے ملحقہ بازار میں کھڑا تھا۔ سامنے دکانیں ہی دکانیں تھیں۔ مال سے لدی ہوئی دکانیں۔ بائیں ہاتھ فٹ پاتھ پر جھلمل جھلمل کرتی ہوئی اشیاء کے ڈھیر لگے تھے۔ چیزیں ہی چیزیں، چیزیں ہی چیزیں۔ جس طرف نگاہ اٹھاتا ہوں چیزوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ رنگ رنگ کی چیزیں، چمکتی ہوئی چیزیں، خوبصورت دل کش چیزیں۔ میڈ ان فرانس، میڈ ان اطالیہ، انگلینڈ، یو ایس اے۔ جگہ جگہ کی چیزیں، ملک ملک کی چیزیں۔ ہر قسم کی چیزیں، پارچہ جات، ریشم، کمخواب، اطلس، نائلون کے کپڑے۔ برتن، چینی، شیشے پلاسٹک، پتھر کے برتن۔ گھڑیاں ہی گھڑیاں۔ رسٹ واچز سے بھرے ہوئے چھابے، ٹائم پیس، کلاک، طرح طرح کی دیوار گھڑیاں۔ فرج، ایئر کنڈیشنر، کولر، پنکھے ہی پنکھے، ٹیبل فین، پیڈسٹل، مٹی کے تیل سے چلنے والے پنکھے، چھت کے پنکھے،

دیواری پنکھے۔ پاؤڈر، لپ سٹک، خوشبو کی شیشیاں، لمبی شیشیاں، لمبوتری شیشیاں۔ مخمل، کمخواب، ریشم کے ڈبوں میں رکھی ہوئی شیشیاں۔ تسبیحوں کے ڈھیر، جاء نمازوں کے انبار۔

اس بازار کو دیکھ میری نگاہیں پھٹ گئیں۔ ذہن کو نہ جانے کیا ہوا۔ میں سب، کچھ بھول گیا۔ میں یہ بھول گیا کہ میں مدینہ منورہ میں ہوں اور مسجد نبویؐ سے ملحقہ علاقے میں کھڑا ہوں۔ میں یہ بھول گیا کہ ہم وہاں زیارت کی لیے آئے ہیں کہ قدرت کی طبیعت ناساز ہے اور میں اردگرد کا جائزہ لینے کی غرض سے ہوٹل سے باہر نکلا ہوں۔ اور مسجد نبویؐ کے دروازے پر کھڑے جوتوں کے رکھوالے نے نظر بھر کر مجھے دیکھا تھا اور ساری کائنات الٹ پلٹ ہوگئی تھی کہ میرے جسم کی ہڈیاں ابھی تک چلاؤں چلاؤں کر رہی تھیں۔

خریدا رہی خریدار:

اس بازار میں سینکڑوں زائر خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ یوں مصروف تھے جیسے علی بابا کے غار سے سامان لوٹنے میں مصروف ہوں۔ جن میں خریدنے کی استطاعت نہ تھی وہ پھٹی پھٹی آنکھوں اور گرسنہ نگاہوں سے چیزوں کے ڈھیر کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں حسرت بھری ہوس کے انبار لگے ہوئے تھے۔

مجھے مکہ معظمہ کی مارکیٹ یاد آ گئی۔ مکہ معظمہ میں مَیں نے قدرت سے پوچھا تھا "کیا مکہ میں بھی شیطان کی پہنچ ہے؟" قدرت نے جواب دیا تھا کہ "حرم شریف کو چھوڑ کر یہاں خود ابلیس سرگرم کار ہے۔ آیئے میں آپ کو دکھاؤں"۔ یہ کہہ کر قدرت مجھے مارکیٹ میں لے گئے۔ جو حرم کے باہر بہت ہی قریب بنی ہوئی تھی۔ وہاں بھی چیزوں کی اتنی ہی افراط تھی۔ خوبصورت، جاذب نظر، کارآمد سستی چیزیں۔ وہاں پہنچ کر میری آنکھیں پھٹ گئیں تھیں، کیونکہ وہاں بھی ہر وہ چیز موجود تھی جسے

خریدنے کی زندگی بھر مجھے آرزو رہی تھی اور...... اور میں وہاں کھو گیا تھا۔

پھر قدرت نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھ کر مجھے جھنجھوڑا تھا اور کہا تھا ''دیکھ لیا آپ نے؟'' اور میں نے محسوس کیا تھا جیسے مارکیٹ کے اوپر خود ابلیس بیٹھا فاتحانہ انداز میں مسکرا رہا ہو۔

دفعتاً کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور مجھے جھنجھوڑا۔ میں چونکا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ میں کون ہوں اور کہاں کھڑا ہوں۔ سامنے ابلیس کے دانت نکلے ہوئے تھے اور وہ حقارت سے میرا منہ چڑا رہا تھا۔

غصے سے چھلانگ لگا کر میں چوک کے درمیانی تھڑے پر چڑھ گیا۔ دائیں ہاتھ میں میں نے مائیک کو پکڑ لیا اور با آواز بلند چلانے لگا:

تبرکات مدینہ:

''بھائیو! سنو، سنو! یہ تم کہاں کھڑے ہو۔ مسجد نبویؐ کی دیوار کے سایہ تلے چراغ کے زیر سائے۔ تم تو گھر سے اس عظیم چراغ کے نور سے منورہ ہونے کے لیے اتنی دور سے چل کر آئے ہو۔''

''رک جاؤ رک جاؤ بھائیو! یہ تم کیا خرید رہے ہو۔ تمہارے عزیز و اقربا نے تو کہا تھا کہ مدینہ منور کی تسبیحیں لانا۔ یہ تسبیحیں مدینہ منورہ کی تو نہیں۔ یہ تسبیحیں تو اٹلی کی بنی ہوئی ہیں۔ شاید ان منکوں میں وہ ذرات بھی شامل ہوں جو رومن کروسیڈرز کے گھوڑوں کے سموں سے جھڑے تھے۔''

''نہ نہ، یہ جائے نماز نہ خریدنا۔ یہ جائے نماز مدینے شریف کے نہیں۔ ان پر تو یورپ کی چھاپ لگی ہے۔ جب تم یہ جائے نماز وطن لے کر جاؤ گے اور اپنے عزیزوں کو تحفے کے طور پر دو گے تو وہ سمجھیں گے کہ یہ جائے نماز مدینہ منورہ کے بنے ہوئے ہیں اور صبح شام ان جائے نماز کے ہر تار کو عقیدت سے چومیں گے۔ آنکھوں

سے لگائیں گے۔ بھائیو! اپنے عزیزوں کو دھوکا نہ دو۔ یہ جائے نماز نہ خریدو"۔

"بھائیو! اس جھلمل جھلمل بازار میں کوئی بھی ایسی چیز موجود نہیں جو مدینہ منورہ یا مکہ معظمہ کی بنی ہوئی ہو۔ کوئی چیز نہیں جو سعودی عرب کی پاک سرزمین کی بنی ہوئی ہو۔ یہ جو کھجوروں کے ڈھیر تم دیکھ رہے ہو جنہیں دکاندار مدینے شریف کی کھجوروں کا ہانکا لگا کر بیچ رہا ہے، یہ بھی مدینہ منورہ کی نہیں"۔

"یہاں کوئی چیز مدینہ منورہ کی نہیں، یہاں کوئی چیز سعودی عرب کی بنی ہوئی نہیں۔ یہاں کوئی ایسی چیز نہیں جو کسی اسلامی ملک کی بنی ہوئی ہو"۔

"تم نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر تبرکات مدینہ خریدنے کے لیے پیسے جوڑے ہیں اور اب تم وہ پیسے یورپ کی بنی ہوئی مصنوعات پر خرچ کر رہے ہو۔ ایسی چیزوں کو خرید کر تم ہر سال کروڑوں روپے کے مغربی سرمایہ داروں کی تجوریوں میں بھر دیتے ہو۔ یہاں مدینہ منور کا صرف ایک تحفہ ہے..... خاکِ پاک"۔

سبز جنگلے کی سلاخیں:

جب قدرت پہلی مرتبہ حج پر گئے تھے تو انہوں نے مدینہ منورہ پہنچ کر جذبۂ عقیدت سے مسحور ہو کر مسجد نبویؐ کے سامنے میدان سے چٹکی بھر مٹی اٹھا کر اپنی آنکھوں میں ڈال لی تھی۔ ان کی آنکھیں بوٹی کی طرح سرخ ہو گئی تھیں اور پھر اس قدر سوج گئیں کہ تین روز تک کھل نہ سکیں۔ اس عالم میں وہ روز سونٹا ٹیک ٹیک کر مسجد نبویؐ میں پہنچتے اور پھر سارا دن سوجی ہوئی بند آنکھوں سے وہاں بیٹھ رہتے کیونکہ بار بار مسجد سے آنا اور وہاں جانا ان کے لیے بے حد مشکل تھا۔

میں نے قدرت سے کہا تھا "یہ آپ نے کیا کیا؟ یہ تو سراسر حماقت تھی"۔

"ہاں"۔ وہ بولے "تھی تو حماقت"۔

"حماقت تھی تو کی کیوں؟"

"پتہ نہیں۔" وہ بولے "کی نہیں تھی، ہو گئی"۔

"اس حماقت کی وجہ سے کتنا نقصان ہوا؟"

"نقصان؟" انہوں نے پوچھا۔

"تین دن آپ سبز گنبد کو دیکھ سکے۔"

"ہاں" وہ بولے "تین دن سبز گنبد کو نہ دیکھ سکا۔ لیکن ان تین دنوں کے دوران مسلسل طور پر میری بند آنکھوں کے سامنے سبز جالی معلق رہی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ سوجن نہ ہو بلکہ سبز جالی کی سلاخیں ہوں"۔

خاکِ پاک:

مدینہ منورہ کے قیام کے دوران میں نے بڑی کوشش کی۔ مسلسل کوشش کرتا رہا کہ کسی طرح مجھے خاک پاک دستیاب ہو جائے۔

میں نے سن رکھا تھا کہ مدینہ منورہ میں خاکِ پاک کی ٹکیاں ملتی ہیں جو ہدیہ ادا کرنے پر دستیاب ہو سکتی ہیں۔

جگہ جگہ میں نے راہ گیروں سے، دکان داروں سے، زائرین سے پوچھا کہ خاک پاک کہاں ملے گی؟ جواب میں سب نے نفی میں سر ہلا دیا۔ کسی شخص نے مجھے یہ نہ بتایا کہ وہ کہاں سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔

آخر ایک روز مسجد نبویؐ میں بیٹھے ہوئے ایک زائر نے حامی بھر لی۔ بولا "میرے پاس تو نہیں لیکن مجھے علم ہے کہ وہ کہاں دستیاب ہو سکتی ہے۔ چونکہ وہ مقام میرے ڈیرے کے قریب ہے، لہذا اگر آپ چاہیں تو میں کل آتے ہوئے چند ٹکیاں خرید لاؤں۔ آپ مجھے کل نماز عصر سے قبل مسجد سے باہر باب نسواں پر ملنے اور اپنی چیز لے لیجئے۔"

شکر گزاری کے جذبات سے میرا دل چھلکنے لگا۔

اس رات رہ رہ کر مجھے خیال آتا کہ شکر ہے میں وطن جاتے ہوئے ایک چیز تو ایسی لے جاسکوں گا جو مدینہ منورہ کی ہے۔

اگلے روز باب نسواں کے باہر وہی زائر مجھ سے ملا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے باآواز بلند پوچھا۔ "کیا خاکِ پاک لے آئے؟" اس پر وہ گھبرا سا گیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر وہ مجھے دوسری طرف لے گیا۔ جب وہ مجھے خاک شفا کی ٹکیا دے رہا تھا تو پیچھے سے سعودی پولیس کے سپاہی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر گھسیٹتے ہوئے اسے نہ جانے کہاں لے گیا۔ میں حیران کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ بات کیا ہے۔

اسی شام میں نے اس کا تذکرہ قدرت اللہ کے رابطہ افسر سے کیا۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسا، بولا "مفتی صاحب! یہاں کچھ لوگوں نے خاک پاک کی ٹکیاں بنانے کا روبار شروع کر لیا تھا۔ اس پر سعودی حکومت نے خاک پاک کو بیچنے کو غیر قانونی قرار دے دیا ہے۔ اب یہاں خاک پاک بیچنا جرم ہے"۔

جذبہ انتقام:

میں وہاں چوک میں کھڑا چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا، میرے منہ سے کف جاری تھا۔

"بھائیو! یہاں کوئی چیز ایسی نہیں جس پر مدینہ منور کی چھاپ لگی ہو۔ کوئی چیز ایسی نہیں جسے متبرک سمجھا جاسکے۔ یہاں کی خاکِ پاک بھی مدینہ منورہ کی مٹی سے نہیں بنی ہوئی۔ وہ بھی دساور سے درآمد کی جاتی ہے۔ کوئی چیز بھی اس قابل نہیں جو تبرک کے طور پر وطن لے جائی جاسکے، جو مدینہ منورہ کی سوغات کہلانے کی مستحق ہو۔"

"بھائیو۔ سنو سنو!!!"

لیکن کوئی بھی میری بات نہیں سن رہا تھا۔ کسی کو احساس نہ تھا کہ چوک میں

کھڑا ایک زائر ان سے مخاطب ہے۔وہ دھڑا دھڑ چیزیں خریدنے میں مصروف تھے۔وہ ان جائے نمازوں کو یوں ہاتھ لگا رہے تھے جیسے اپنی انگلیوں پر انہوں نے آنکھیں بچھا رکھی ہوں۔ان کے ہاتھ جذبہ احترام سے بھیگے ہوئے تھے۔وہ سب ان جاءنمازوں کا یوں طواف کر رہے تھے جیسے وہ خانۂ کعبہ کے غلاف کے ٹکڑے ہوں۔

"اچھا تو تم میری بات نہیں سنو گے؟" میں غرایا۔ان کی بے حسی پر مجھے غصہ آ گیا۔

"نہیں سنتے تو نہ سنو نہیں مانتے تو نہ مانو"۔

میرا دل جذبۂ انتقام سے بھر گیا۔منہ سرخ ہو گیا، کنپٹیاں تھرکنے لگیں۔

"اچھا تو خریدو، خریدو۔یہ سب چیزیں جو تمہارے سامنے پڑی ہیں، مقدس و متبرک ہیں۔انہیں اٹھا کر اپنی آنکھوں سے لگاؤ، چوم کر آنکھوں سے لگاؤ"۔

روشن منکے:

"ہاں ہاں یہ تسبیحیں مدینہ منورہ کی مٹی سے بنی ہیں۔یہ جائے نماز خانہ کعبہ کے غلاف سے کاٹے ہوئے ٹکڑوں سے بنے ہیں۔کھجوریں اس پیڑ پر لگی تھیں جو سبز گنبد کے پچھواڑے لگا ہوا ہے۔"

"خریدو۔خریدو۔ان سب چیزوں کو سمیٹ کر لے جاؤ۔یہ تمہارے گھروں کو متبرک بنا دیں گی، تمہاری زندگی میں برکت کا باعث ہوں گی۔خریدو۔"

جذبۂ انتقام جنون بن کر میرے ذہن پر سوار ہو گیا۔

میں نے ایک جست لگائی اور تسبیحوں کے ڈھیر کے قریب جا پہنچا۔"یہ اندھیرے میں چمکنے والے منکوں کی تسبیحیں جو ہیں چار درجن، یہ سیاہ منکوں والی تین درجن، براؤن منکوں والی آٹھ درجن ...... ابھی باندھ دو۔ابھی۔نہ نہ انہیں اخبار

کے کاغذ میں نہ لپیٹو۔ احمق! کیا تمہیں پتہ نہیں کہ یہ مدینہ منورکی تسبیحیں ہیں۔ انہیں میری چادر میں ڈال دو۔ اور یہ جائے نماز۔ اور یہ کھجوریں اور یہ......"

مارکیٹ کے اوپر بیٹھے ہوئے ابلیس کے دانت یوں چمک رہے تھے جیسے وہ اٹلی کے بنے ہوئے اندھیرے میں روشن ہونے والی تسبیحوں کے روشن منکے ہوں۔

حجرۂ مبارک

رات کو کسی نے میرا شانہ ہلا دیا۔ میں جاگ پڑا۔ اٹھ کر بتی جلائی۔ قدرت میرے سرہانے کھڑے تھے۔

''چلئے''۔ وہ بولے۔

''کہاں؟''

''مسجد نبویؐ کے کھلنے کا وقت ہو گیا۔''

''لیکن آپ کی طبیعت تو ناساز تھی''۔

''اب ٹھیک ہوں''۔

بابِ جبرئیل:

ہوٹل کی سیڑھیاں اتر کر جب ہم نیچے پہنچے تو سڑک سنسان پڑی تھی۔ مسجد نبویؐ کے صدر دروازے بند تھے۔ قدرت مسجد نبویؐ کی دیوار کے ساتھ یوں چلے جا رہے تھے جیسے راستے سے پورے طور پر واقف ہوں۔ کچھ دور جا کر وہ رک گئے۔

''ادھر آ جائیے''۔ وہ دیوار کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ باب جبرئیل ہے۔ اس دروازے سے حضرت جبرئیل حضورؐ کے پاس آیا کرتے تھے۔''

وہ ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ زائرین کی قطار لگی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں وہ اچھی طرح نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہم دونوں دیوار کے ساتھ قطار میں کھڑے ہو گئے۔

''یہ دروازہ کہاں کھلتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

"حجرہ مبارک میں۔ یہاں نوافل پڑھنا افضل عبادت ہے"۔

کئی ایک منٹ ہم وہاں دیوار سے لگے کھڑے رہے۔ آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو میں نے دیکھا کہ قطار میں کھڑے زیادہ تر لوگ عمر رسیدہ، ناتواں اور نحیف تھے۔ ان کی گردنیں ہل رہی تھیں، ہاتھوں میں تسبیحیں چل رہی تھیں۔ ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں، انداز میں انتہا کی خاکساری تھی۔

دروازہ کھل گیا۔ ہم سب باری باری اندر داخل ہو گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا...... پتہ نہیں اندر داخل ہوتے ہی ان نحیف و نزار بڈھوں کو کیا ہوا کہ ان کی گردنوں نے ہلنا بند کر دیا، ٹانگوں نے لڑکھڑانا چھوڑ دیا۔ پتہ نہیں ان میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی؟...... جس طرح کوئی دبلی پتلی آسیب زدہ لڑکی پر دفعتاً جن چڑھ جاتا ہے، وہ اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے، اکڑی ہوئی گردن، چڑھی ہوئی لال سرخ آنکھیں اور وہ عالم دیوانگی میں اِدھر اُدھر دیکھتی ہے، اس میں اتنی قوت ابھر آتی ہے کہ چار آدمی بھی اسے سنبھال نہیں سکتے۔

جذبہ، جنون:

حجرے میں داخل ہوتے ہی ان دس پندرہ نحیف و نزار بڈھوں پر ایسی کیفیت طاری ہو گئی جیسے وہ سب کے سب جن بن گئے ہوں۔

اس دیوانگی میں شر کا عنصر نہ تھا، جارحانہ رنگ نہ تھا۔ صرف جذبے کی وارفتگی تھی جو جنون بن گئی تھی۔

حجرے میں داخل ہوتے ہی قدرت نے دیوار کے پاس کھڑے ہو کر نفلوں کی نیت باندھ لی۔ اس کے پاس ہی میں نے بھی دو رکعت نفل کی نیت باندھی۔ دفعتاً پیچھے سے ایک دھکا آیا۔ میں ہوا میں اچھلا اور قلابازی کھا کر مقابل دیوار سے جا ٹکرایا۔ چند ساعت کے لیے مجھے سمجھ میں نہ آیا کہ ہوا کیا ہے۔ پھر یاد آیا کہ مجھے نفل

پڑھتے ہیں۔ میں نے اٹھ کر پھر نیت باندھی۔ چند ساعت کے بعد میں نے اپنے کو اوندھے منہ گرا ہوا پایا۔ ارے یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے سوچا۔

کچھ دیر تو میں اپنے آپ کو سنبھالنے میں مصروف رہا، پھر اٹھ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ از سر نو نیت باندھوں کہ نہیں۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ حجرے میں نمازیوں کی کیفیت دیکھ کر ہمت نہ پڑی۔ ''بیکار ہے'' میں نے سوچا۔ ''یہاں نفل پڑھنا میرے بس کی بات نہیں۔ نہیں میں نفل نہیں پڑھوں گا۔ اس فیصلے کے بعد میں سرک سرک کر کونے میں جا بیٹھا اور حجرے جائزہ لینے لگا۔''

مٹی کا پہلوان: حجرے کی کیفیت عجیب سی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں کلکتے کے ''بلیک ہول'' میں جا بیٹھا ہوں اور اس ''بلیک ہول'' میں کہیں کوئی ہاتھی گھسا ہوا ہے۔ پھر میری نگاہ قدرت پر جا پڑی۔

قدرت اس وقت فٹ بال کی طرح حجرے میں ادھر اُدھر اچھل رہے تھے۔ ابھی اس دیوار سے ٹکرائے، اب اس دیوار کے پاس اوندھے منہ پڑے ہیں۔ لو وہ پھر اٹھ بیٹھے اور یوں کھڑے ہو گئے جیسے نیت نہ ٹوٹی ہو، جیسے نماز جاری ہو، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ارے وہ پھر دھڑام سے پیچھے کو گرے۔ ان کے پیچھے سات آٹھ نمازی سب کے سب لڑھک گئے۔ جیسے قریب قریب کھڑی اینٹوں کی قطار میں سے ایک اینٹ گرے تو ساری اینٹیں گر جاتی ہیں۔

ارے وہ تو پھر کھڑے نفل پڑھ رہے تھے! حیرت کی بات یہ تھی کہ قدرت صرف جسمانی طور پر گرتے رہے اور یہ جسمانی تھپیڑے ان کے ذہن پر کوئی اثر نہیں رکھتے تھے۔ گرنے کے بعد وہ فناک سے یوں اٹھ کر کھڑے ہوتے جیسے مٹی کے پہلوان ہوں۔ نہ وہ یہ دیکھتے تھے کہ دھکا کدھر سے آیا، نہ دیکھتے کہ انہیں کہاں چوٹ لگی، نہ دیکھتے کہ اب کہاں کھڑے ہیں۔ وہ تو یوں اٹھ کر ہاتھ باندھ لیتے جیسے

سجدے سے اٹھے ہوں۔

میں حیرت سے ان کی طرف دیکھتا رہا، دیکھتا رہا۔

پہلے تو مجھے خیال آیا کہ انہوں نے پاکھنڈ مچا رکھا ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص چاروں طرف سے یوں دھکا کھائے، لڑکھڑائے، قلابازیاں لگائے، دیوار سے بھنچا جائے، لیکن اس کی یکسوئی میں فرق نہ آئے۔ نماز جاری رہے، نیت نہ ٹوٹے۔

میں نے خود دو مرتبہ قلابازیاں کھائی تھیں۔ کئی منٹ میں جسم کو سہلاتا رہا تھا۔ نماز کی بات چھوڑیئے، ایک بار تو میں نے اپنے آپ کو یہ سوچتے ہوئے پکڑ لیا تھا کہ اب کی بار جس نے مجھے دھکا دیا، بڑھ کر اس کی گردن دبوچ لوں گا "تیرے فلاں کے فلاں کے فلاں......"

بدھ اور نروان:

قدرت کے علاوہ وہاں دوسرے لوگ بھی نفل پڑھنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ انہیں بھی دھکے لگتے تھے۔ وہ بھی لڑکھڑا کر گرتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ نیت نہ ٹوٹے لیکن ان کی توجہ بھٹک جاتی۔ ادھر اُدھر دیکھنے لگتے اور انہیں پھر سے نیت باندھنی پڑ جاتی تھی۔

پھر جو میں نے دیکھا کہ ایک تازہ دھکا کھانے کے بعد قدرت میرے قریب آ کھڑے ہوئے ہیں۔ میں نے ان کی طرف غور سے دیکھا۔

ان کے چہرے کو دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ چہرے پر اس قدر سکون تھا جیسے پہاڑ کے ویرانے میں سنو لائن (SNOW LINE) سے اوپر کسی کھوہ میں تن تنہا کوئی یوگی دھیان لگائے بیٹھا ہو۔ ان کے چہرے پر کوئی الجھن نہ تھی، فکر کی کوئی سلوٹ نہ تھی، آزردگی کا کوئی نشان نہ تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ بڑ کے درخت کے نیچے

بیٹھے ہوئے ''بدھ'' ہوں جنہیں نروان حاصل ہو چکا ہو۔ نہیں، نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ تقاضائے بشری کے منافی ہے۔ یہ لوگ جو اس افراتفری میں بھی دھیان لگائے رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، کیا بشری تقاضوں سے بے نیازی حاصل کر چکے ہیں؟

دفعتاً مجھ پر انکشاف ہوا کہ صرف وہی لوگ اس حجرے میں نفل ادا کر سکتے ہیں جنہیں اللہ نے UNISON کی نعمت بخشی ہے۔ صرف وہی لوگ جو پہلے ہی سے نوازے ہوئے ہیں۔ صرف وہی لوگ جنہیں پہلے ہی سے اللہ اور محمدؐ کی خوشنودی حاصل ہے۔

''یا رسول اللہؐ!'' مجھ سے گنہگاروں پر یہاں نفل پڑھنے کے دروازے کیوں بند کر دیئے ہیں؟ مجھ سے دنیادار جنہیں یک سوئی کی طاقت حاصل نہیں، جو پہلے ہی سے نوازے ہوئے نہیں، وہ اس نعمت عظمیٰ سے کیوں محروم ہیں؟''

اجلے اور میلے:

''یا رسول اللہؐ! کیا تیری درگاہ میں بھی صرف اجلوں کو مزید اجلے ہونے کے مواقع میسر ہیں؟ کیا میلوں کو یہاں بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا ہے؟''

اس حجرے میں میرے نفل پڑھنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ ''ہٹاؤ'' میں نے سوچا۔ ''زبردستی کرنے کا کیا فائدہ؟'' کونے میں بیٹھ کر میں چاروں طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ ان زائرین کی طرف دیکھ رہا تھا جو اس دھکم پیل میں بھی اللہ کی طرف دھیان لگائے رکھنے کی طاقت رکھتے تھے۔ میں ان کی نگاہوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہاں مجھ ایسے لوگ بھی تھے جو نیت قائم نہیں رکھ سکتے تھے، پھر بھی زبردستی ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ جو ٹوٹی ہوئی نیت کو زبردستی بندھی ہوئی نیت سمجھ رہے تھے۔ جو وہاں ستر ہزار نمازوں کا ثواب حاصل کرنے پر مصر کھڑے تھے، جو خود پر

دوزخ کی آگ حرام کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔

وہ سلام:

"یا رسول اللہ!" میرے دل سے ایک منت ابھر رہی تھی جسے دبانے کی شدید کوشش ناکام ہوئی جا رہی تھی۔ "یا رسول اللہ! یہاں میں ستر ہزار نمازیں اپنے نام کرانے کے لیے حاضر نہیں ہوا۔ بہشت میں اپنی جگہ محفوظ کرانے کے لیے یہاں نماز پڑھنے کا متمنی نہیں ہوں۔ میں تو صرف اس لیے یہاں نماز پڑھنا چاہتا ہوں کہ تیرے گھر کی دہلیز پر کھڑا ہو کر تجھے سلام کروں"۔

وہ سلام نہیں جو دوسرے پر سلامتی بھیجتا ہے۔ وہ سلام نہیں جو کتابوں میں لکھا ہوتا ہے، بلکہ وہ سلام جو ایک ادنیٰ عاجز مسکین شخص ایک اعلیٰ اور ارفع ہستی کو جھک کر ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کرتا ہے۔ میری آرزو ہے کہ اپنی عقیدت کا اظہار کروں۔ تیری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سجدہ کروں۔ تیری خوشنودی سے عظیم تر نعمت کیا ہو سکتی ہے؟ میرا جی چاہتا ہے کہ میں تیرے قدموں میں کھڑا ہو کر نعرہ لگاؤں کہ اے عظیم ترین انسان! میں جو ننگِ انسانیت ہوں، میں تجھے سلام کرتا ہوں۔ تو جو میرا سلام قبول کرلے تو میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ رہے۔ اور تجھے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ ایسے شخص کا سلام کیوں قبول کیا؟ جو انسانیت کے نام پر کلنگ کا ٹیکا ہے"۔

دفعتاً میری نگاہ قدرت پر جا پڑی۔ وہ سلام پھیر چکے تھے اور میری طرف بڑی شفقت سے دیکھ رہے تھے۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے ان کی مسکراہٹ میں حضورِ اعلیٰ کا پیغام جھلک رہا ہو کہ "اے ممتاز! ہم نے تیرا سلام قبول کیا"۔

"آؤ اب چلیں"۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ فرطِ انبساط سے قدرت کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ چل پڑے اور میں ان کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

بابِ جبرئیل سے زائرین کا ایک تازہ ریلا آیا اور ہم چشم زدن میں حجرے

سے باہر نکل گئے۔ میں نے دیکھا کہ مسجد نبویؐ کے اس حصے میں جا نکلے ہیں جو ترکی تعمیر کا چھتا ہوا وسیع و طویل دالان ہے جس میں یہاں، وہاں قطار میں کئی ستون کھڑے ہیں۔قدرت دالان میں داخل ہوتے ہی دائیں مڑ گئے۔ ہمارے سامنے مزار مقدس کا سبز جنگلا تھا۔

جنگلے کے سامنے قدرت رک گئے اور ہاتھ اٹھا کر دعا پڑھنے لگے۔ میں نے بھی ان کے پیچھے کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھا لیے۔جلد ہی میں نے محسوس کیا کہ حضور اعلیٰؐ کی خدمت اقدس میں پیش کرنے کے لیے میرے پاس کوئی دعا نہیں۔

دعا:

دعا کے معاملے میں میں عام مسلمانوں کی طرح بہت احمق واقع ہوا ہوں نہ جانے کیوں دعا مانگتے وقت میرے دل کی گہرائیوں سے یہ خیال ابھرتا ہے کہ دعا سنتے وقت اللہ تعالیٰ شنک بخش مولوی صاحب کا روپ دھار لیتے ہیں، پہلے وہ ناک پر رومال رکھ لیتے ہیں پھر ہاتھ میں ایک چمٹی پکڑ لیتے ہیں اور گندی، غلیظ، ہوس بھری اور ناجائز دعاؤں کو اس چمٹی سے اٹھا اٹھا کر دور پھینک دیتے ہیں۔ پھر ناک سے رومال ہٹاتے ہیں۔ چمٹی ایک طرف رکھ دیتے ہیں اور ہاتھ دھو کر بچی کھچی صاف ستھری دعاؤں کا جائزہ لیتے ہیں۔ان میں سے بھی نامعقول دعائیں نکال کر پھینک دیتے ہیں اور پھر بقیہ دعاؤں کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں کہ فرصت کے وقت ان پر غور کریں گے۔

لاشعور میں رچے بسے ہوئے اس اعتبار کی وجہ سے مجھ ایسے عام گنہگار مسلمانوں نے نہ تو کبھی دعا کے مفہوم کو سمجھا ہے، نہ مانگنے کے فعل کو جانا ہے اور نہ قبول کرنے والے کی عظمت کا راز پایا ہے۔

میری اپنی حالت یہ ہے کہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے سے پہلے سوچتا ہوں کہ

کہیں میں اتنا تو نہیں مانگ رہا کہ دینے والے پر بوجھ ہو جائے؟ کہیں ایسی چیز تو نہیں مانگ رہا جو ناجائز ہے، جو غلیظ ہے، جس میں گناہ میں عنصر موجود ہے۔ کہیں اس دعا سے میری طبعی ہوس کا بھید تو نہیں کھلتا؟ پھر میں عرض کرتا ہوں کہ یا اللہ! میں حریص نہیں ہوں، میں تجھ سے زیادہ نہیں مانگتا۔ صرف اتنا مانگ رہا ہوں جس کی مجھے اشد ضرورت ہے اور جسے دینا تیرے لیے بار نہ ہوگا۔

مانگنے والا اور دینے والا:

اس کے ساتھ ہی میرے دل سے ایک ہلکی سی آواز آتی ہے۔ اتنی ہلکی سی کہ سنی نہیں جاسکتی:

"یا اللہ! دیکھ لے، میں کتنا اچھا آدمی ہوں۔ میں نے تجھ پر بوجھ نہیں ڈالا۔ میں نے ایسی دعا نہیں مانگی کہ تجھے ناک پر رومال رکھنا پڑے، چھٹی اٹھانی پڑے۔ یا اللہ دیکھ لے ایسی دعا مانگ کر میں نے تجھ پر کتنا احسان کیا ہے؟"

غلام دین وانی:

میرے ایک دوست ہیں غلام دین وانی۔ انہوں نے ساری عمر نمازوں اور عبادتوں میں گزار دی ہے لیکن آج تک وہ "دعا" "مانگنے" اور "دینے والے" کے مفہوم سے واقف نہیں۔ وہ اتنی خست سے دعا مانگتے ہیں کہ میرے نزدیک ان کی دعا، دینے والے کی توہین کا باعث ہوتی ہے۔

ان کی دعا کا متن کچھ ایسا ہوتا ہے کہ "یا باری تعالیٰ! بے شک مجھے زیادہ نہ دے لیکن اتنا تو دے کہ میرا گزارہ ہو جائے۔ یا اللہ! اور کیا عرض کروں، تو مالک ہے، جیسے تیرے مرضی۔"

میں نے بارہا غلام دین وانی کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ باری تعالیٰ کے

حضور میں دعا مانگو تو اس پر قبول کرنا عاید کرنے کی کوشش کرو۔ یوں کہ "باری تعالیٰ! میرا کام مانگنا ہے، تیرا کام دینا ہے۔ تو جو بن مانگے دیتا ہے، مانگنے پر کیوں نہ دے گا ضرور دے گا۔ یا باری تعالیٰ! مجھے دے، اتنا دے کہ پھر مانگنے کی حاجت نہ رہے۔" بارہا میں نے وائی صاحب سے کہا "یا تو مانگو اور دینے والے پر پورا بھروسہ کر کے مانگو اور یا نہ مانگو۔ یہ کیا ظلم کرتے ہو کہ مانگتے بھی ہو، ساتھ ہی یہ بھی تاکید کرتے جاتے ہو کہ زیادہ نہ دینا۔ پھر اپنی مسلسل تنگدستی پر روتے بھی رہتے ہو۔ یہ کیا تک ہے کہ ایک طرف تو مانگتے ہو دوسری طرف دینا یا نہ دینا اس کی مرضی پر چھوڑ دیتے ہو، کہ آگے تو مالک ہے جو تیری مرضی"۔

سچا منگتا:

پہلی مرتبہ جب میں نے ایک شخص کو مانگتے ہوئے سنا تو حیران رہ گیا۔ داتا کا مزار تھا۔ ایک جٹا دھاری فقیر آیا۔ یوں داخل ہوا جیسے مقروض کے گھر قرض خواہ آیا ہو۔ اس نے داتا کو للکارا: "جو داتا بنا بیٹھا ہے تو دے۔ دیکھ تیرے دوار پر مانگنے والا آیا ہے۔ دے۔ دس کروڑ روپے کا سوال ہے۔" دس کروڑ روپے دس کروڑ روپے دس کروڑ روپے" چلاتا ہوا وہ دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔

"ارے!" میں بھونچکا رہ گیا۔ "یہ جٹا دھاری ہو کر روپیہ مانگ رہا تھا! اپنی اس مانگ پر ندامت نہیں محسوس کر رہا تھا۔ ہماری طرح داتا کو خسیس مولوی نہیں سمجھ رہا تھا۔ یہ نہیں سمجھ رہا تھا کہ داتا ناک پر رومال رکھ لیں گے، ہاتھ میں چمٹی اٹھا لیں گے۔"

"ارے!" گویا میری آنکھیں کھل گئیں۔ زندگی میں میں نے پہلی مرتبہ سچا مانگنے والا دیکھا تھا...... پہلی مرتبہ۔ ایک ایسا شخص جو مانگنے کی عظمت سے واقف تھا، جو داتا کو داتا سمجھتا تھا۔

ہاں تو حضور اقدس کی جالی کے پاس کھڑے ہو کر قدرت کو دعا پڑھتے دیکھ کر میں نے بھی ہاتھ اٹھا لیے، لیکن چند ساعت کے لیے میں خالی ہاتھ اٹھائے کھڑا رہا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا دعا مانگوں، دعا مانگنے میں میں کئی بار فاش غلطیاں کر جایا کرتا ہوں۔ لہذا ایسے وقت، میں ڈرتا رہتا ہوں کہ کہیں جذبات طاری نہ ہو جائیں اور ترنگ میں ایسی بات نہ کہہ دوں کہ بعد میں شرمساری سے اپنے آپ سے منہ چھپاتا پھروں۔

کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کرم نوازیاں اس حد تک بڑھ جاتی ہیں کہ میں جذبات کی رو میں بہہ کر اللہ کے حق میں دعائیں مانگنے لگتا ہوں کہ "یا اللہ تو اتنا اچھا ہے۔ کہ اللہ تجھے خوش رکھے۔ اللہ تجھے عظمتیں بخشے"...... پھر دفعتاً مجھے احساس ہوتا ہے کہ یہ میں کیا بک رہا ہوں۔ کیا میں باری تعالیٰ پر ایک اور اللہ مسلط کر رہا ہوں۔ اس پر اتنا شرمسار ہوتا ہوں کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ پھر مجھے غصہ آنے لگتا ہے کہ میرے اللہ مجھ پر اتنی کرم فرمائیاں کرتے ہیں اور میں ان کے حق میں دعا بھی نہیں مانگ سکتا۔

حضور اقدسؐ کی خدمت میں کھڑے ہو کر میرے ذہن میں صرف ایک بات آئی، سو میں نے عرض کر دی "یا حضورؐ! میں اتنی دور سے چل کر اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کی خدمت میں سلام عرض کروں۔ آپ کی کتنی کرم نوازی ہے کہ حضورؐ نے مجھ ایسے کا سلام قبول فرمایا۔ اللہ آپ کو مزید عظمتیں عطا فرمائے، مزید رفعتوں سے نوازے، مزید قرب حاصل ہو۔"

دفعتاً مجھے خیال آیا کہ یہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ گویا عرش بریں سے کہہ رہا ہوں کہ اللہ آپ کو عرش بریں کے مرتبے سے نوازے۔

"یا حضورؐ!" میں نے شرمساری سے عرض کی "میری باتوں کا برا نہ مانئے،

میں بیوقوف ہوں، جاہل ہوں"۔

عین اس وقت مجھے وہ ردتاج یاد آ گیا اور میں حضورؐ کی حمد و ثنا میں اپنی خفت مٹانے کی کوشش کرنے لگا۔

دھنکی:

جنگلے کو پکڑے ایک صاحب ڈھائیں مار مار کر رو رہے تھے۔ دوسرے صاحب کی آنکھوں سے خاموش آنسو رواں تھے۔ میرا جی چاہا کہ میں بھی روؤں۔ لیکن میری آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔

گذشتہ گناہوں پر سچے دل سے توبہ کی جائے تو رقت پیدا ہوتی ہے۔ رقت گویا ایک دھنکی ہے جو روح کو دھنک کر رکھ دیتی اور قلب میں ایک نئی پاکیزگی پیدا کر دیتی ہے۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ مجھ پر بھی رقت طاری ہو، میری روح بھی دھنکی جائے، مجھ میں بھی ایک نئی پاکیزگی پیدا ہو۔ لیکن مجھ پر کبھی رقت طاری نہیں ہوئی، شاید اس لیے کہ میں نے سچے دل سے گذشتہ گناہوں پر کبھی اظہار ندامت نہیں کیا۔ کبھی اظہار توبہ نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ مجھے اپنی معصیت کا احساس نہیں یا مجھے اپنے گذشتہ گناہوں پر ندامت نہیں۔

یقین جانئے مجھے گناہ پر آلودہ ہونے کا شدت سے احساس ہے لیکن جب بھی مجھے توبہ کا خیال آتا ہے تو اندر سے ایک آواز آتی ہے کہ توبہ کرنے کا حق صرف اسے حاصل ہے جسے اپنے آپ پر اعتماد ہو۔ جو یقین سے کہہ سکے کہ آئندہ گناہ کا اعادہ نہ ہوگا۔ مجھے اپنے آپ پر اعتماد نہیں۔

سب سے بڑا انسان اور رسول اللہؐ:

دفعتاً میری نگاہ قدرت پر جا پڑی۔ جنگلے سے ذرا پیچھے ہٹ کر وہ ہاتھ اٹھائے

کھڑے تھے۔

"یااللہ! اتنی لمبی دعا؟" میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر ان کی جانب دیکھا۔

"میرے اللہ! یہ قدرت کو کیا ہوا ہے؟ میرے سامنے قدرت نہیں بلکہ ایک نحیف و نزار بوڑھا کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ ڈھلک گیا تھا، آنکھوں کی چمک گل ہو گئی تھی، پیشانی پر بے شمار سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ منہ پر منوں عجز کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ گردن خاکساری کے دباؤ تلے ڈھلکی ہوئی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے عجز و انکسار میں جان پڑ گئی ہو۔" "یہ دعائیہ انداز تو نہیں" میں نے سوچا "رقت بھی نہیں، احساس معصیت بھی نہیں۔ پھر یہ عجز کیا ہے؟"

جنگلے سے لپٹے ہوئے زائر نے ایک نعرہ مارا۔ میری توجہ اس کی جانب مرکوز ہو گئی۔

پھر جو دوبارہ میں نے قدرت کی طرف دیکھا تو وہ مزید بوڑھے ہو چکے تھے۔ ہر ساعت کے بعد ان کی عمر میں دس سال کا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ وہ دعا نہیں پڑھ رہے تھے، حمد و ثنا نہیں کر رہے تھے۔ ارے! شاید وہ حضوری میں کھڑے ہوں۔ میں نے پھر سے غور سے انہیں دیکھا۔ میرے دل پر ایک خوف طاری ہو گیا۔

جناب محمد ﷺ کی رفعت اور عظمت کو میں نے صرف سنا ہے پڑھا ہے، جانا نہیں۔ قدرت کے عجز و انکسار کو دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ ضرور اس شخص نے حضورؐ کی عظمت و رفعت کو جانا ہے۔ ان کا انگ انگ اس بات کی شہادت دے رہا تھا کہ وہ اس لمحے میں بھی "جاننے" کے عالم میں تھے۔ یہ محسوس کرتے ہی میرے جسم و روح میں خوف کی ایک پھریری سی چل گئی۔ "یا اللہ! تیرا رسولؐ اتنا عظیم ہے۔ اتنا عظیم!" اب تک میں دنیا کے عظیم ترین انسان کی خدمت میں حاضر تھا، لیکن اب

جناب رسولؐ اللہ کی خدمت میں اقدس میں ایستادہ ہو گیا۔قدرت نے دعا ختم کر لی۔

"چلو چلیں"۔انہوں نے مجھے اشارہ کیا۔

"کیوں نہ ہم اس جگہ پر قبضہ جما لیں۔"میں نے کہا۔

میری بات سن کر ان پر شدید گھبراہٹ طاری ہو گئی۔"نہیں نہیں ،ایسا نہیں سوچنا چاہیئے"۔

"کیوں؟"میں نے پوچھا۔

"ہمیں دوسروں کو موقع دینا چاہیئے"۔یہ کہہ کر قدرت مسجد کے دوسرے حصے کی طرف چل پڑے۔دور جا کر ہم دونوں ایک کونے میں بیٹھ گئے۔میں نے ان کی جانب دیکھا۔آہستہ آہستہ ان کی کیفیت نارمل ہوتی جا رہی تھی۔مسجد میں پہنچ کر ان پر ایک عجیب سا سکون طاری ہوتا جا رہا تھا۔یوں لگتا تھا جیسے کوئی ندی پہاڑی علاقے میں سر پٹختی، دوڑتی بھاگتی آتی ہے اور پھر میدان میں پہنچ کر اس کا پانی چاروں طرف پھیل کر ساکن ہو جاتا ہے۔اس روز سارا دن قدرت پر ایک عجیب سا سکون طاری رہا۔ان کے انداز میں تڑپ یا بے قراری نہ تھی۔انہیں یہ فکر بھی دامن گیر نہ تھا کہ نماز کے لیے مسجد کے اندر جگہ ملے۔

مسجد نبویؐ نمازیوں سے بھر جاتی ہے تو لوگ مسجد کے سامنے میدان میں صفیں بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہیں نماز ادا کرتے ہیں۔کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو بھیڑ کے باوجود زبردستی مسجد میں گھس جاتے تاکہ مسجد کے اندر نماز پڑھیں۔

بے نیازی اور شوراشوری:

سارا دن قدرت یا تو مسجد کے باہر نماز پڑھتے اور یا مسجد کے عوامی حصے میں۔

سارا دن وہ نہ تو مزار مقدس کی طرف جاتے نہ ترکی دالان کی طرف۔"یا اللہ یہ کیا

اسرار ہے؟ صبح اتنی شوراشوری اور اب اتنی بے نیازی"۔ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

مدینہ منورہ میں پہنچ کر میری کیفیت ایسی تھی جیسے کوئی خالی ورق ہو، خالی برتن جیسے شہد ٹپک گیا ہو اور خالی کھگا رہ گیا ہو۔

شام کو مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد جب ہم ہوٹل میں واپس پہنچے تو قدرت اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ دل پر ایک عجیب سی اکتاہٹ طاری تھی۔

کمرے میں پہنچا تو وہاں ایک صاحب بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ "آپ مفتی صاحب ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی فرمایئے"۔

"میں مدینہ منورہ کی پاکستانی ڈسپنسری کا ڈاکٹر ہوں" وہ بولے۔

"جی" میں نے کہا۔

"میں شہاب صاحب کو ایک پیغام دینے آیا ہوں"۔

"آپ ان سے خود مل لیں"۔

"نہیں نہیں" وہ بولا "انہیں تکلیف نہ دیجیے۔ آپ میرا پیغام لے جایئے اور جواب میں جو وہ فرمائیں مجھے بتا دیجیے"۔

"بہت اچھا فرمایئے"۔

"ان سے کہیے کہ آج شب کو نماز عشاء کے بعد مسجد نبویؐ خصوصی طور پر شاہ مراکو کے لیے ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے کھلے گی۔ میں نے انتظام کر دیا ہے کہ اگر شہاب صاحب یا ان کے ساتھی مسجد نبویؐ میں جانا چاہیں تو بصد شوق چلیں، میں انہیں ساتھ لے چلوں گا"۔

سنہرا موقع:

''کیا کہا؟ مسجد نبوی خصوصی طور پر کھولی جائے گی؟''

''ہاں'' وہ کہنے لگا، آپ جہاں چاہیں نوافل ادا کر سکتے ہیں جہاں چاہیں بیٹھ کر تلاوت کر سکتے ہیں۔'' خوشی اور حیرت سے میری کنپٹیاں تھرکنے لگیں۔ ''تو کیا میں حجرہ مبارک میں نفل ادا کر سکوں گا؟'' اس عظیم خوش خبری پر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

میں بھاگا بھاگا قدرت کی طرف گیا۔ میں نے بڑے شوق سے انہیں یہ خوش خبری سنائی۔

جواب میں قدرت نے صرف اتنا کہا: ''اچھا تو ڈسپنسری والے ڈاکٹر صاحب آئے ہیں وہ میرے پرانے واقف ہیں۔ چلیے میں انہیں مل لوں''۔

قدرت! ڈاکٹر سے بڑے تپاک سے ملے۔ دیر تک ان کے مزاج پوچھتے رہے۔ آخر میں بڑی معذرت کے ساتھ کہنے لگے! ''ڈاکٹر صاحب! میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ افسوس کہ میں اس سنہری موقع کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔'' ساتھ انہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: ''مفتی صاحب! بے شک آپ ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ مسجد نبویؐ میں حاضری دے آئیں''۔ میرا ذوق و شوق ٹھنڈا پڑ گیا۔ قدرت کے جواب نے گویا مجھ پر برف کی سل رکھ دی۔

''شکریہ ڈاکٹر صاحب!'' میں نے کہا ''میرے وہاں اکیلے جانے سے کیا ہوتا ہے؟'' ڈاکٹر کے جانے کے بعد میرے دل میں غصے کا ایک طوفان چلنے لگا۔ جھوٹ کی بھی حد ہوتی ہے۔ یہ ناسازیِ طبیعت کا ڈھونگ کس لیے رچایا جا رہا ہے۔ یہ انجائینا کے دورے، یہ RESISTACNE کا ناٹک...... منافقت۔ منافقت۔ منافقت!

ساری رات مجھے غصے سے نیند نہ آئی۔ کروٹیں بدلتا رہا اور قدرت کو برا نہ کہنے کی شدید جدوجہد میں مصروف رہا۔

پھر پتہ نہیں میری آنکھ لگ گئی تھی یا ابھی نیم خوابی میں تھا کہ کسی نے میرا شانہ ہلایا۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔

''کون ہے؟'' میں چلایا۔

''میں ہوں'' قدرت نے جواب دیا۔

''آپ؟''

''ہاں چلیے، باب جبرئیل کھلنے کا وقت ہو گیا ہے''۔

اس وقت میرا جی چاہا کہ اٹھ کر دونوں شانوں سے انہیں اوپر اٹھاؤں اور ہوٹل کی کھڑکی سے باہر پھینک کر ہاتھ جھاڑوں اور پھر آرام سے لیٹ کر سو رہوں۔

اس اثنا میں قدرت نے بتی جلا دی، کمرہ منور ہو گیا۔ میں نے ان کی جانب دیکھا۔ ان کے چہرے پر اتنی معصومیت چھائی ہوئی تھی اور ان کا انداز اس قدر APPOLOGETIC تھا کہ میں سب کچھ بھول گیا۔ میں نے جلدی سے جوتا پہنا، ٹوپی سر پر رکھی اور ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

پھر حجرہ مبارک میں میں اپنے مخصوص کونے میں بیٹھا قدرت کے پٹنے کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس روز زائرین کے شوق کی کیفیت کچھ زیادہ ہی جارحانہ تھی۔ پہلی رکعت میں انہوں نے چھ مرتبہ قلابازیاں کھائیں، دو بار دیوار سے ٹکرائے اور پھر سے ہاتھ باندھے کھڑے ہو گئے۔ پہلے روز میں حیرت، ہمدردی اور تحسین سے قدرت کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ آج انہیں پٹتے اور دھکے کھاتے دیکھ کر مجھے ایک انجانی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

''اچھا ہوا...... اب تو جناب کی ناسازی طبع درست ہو گئی ہو گی...... بہت

اچھے۔ جیسے کو تیسا"۔

میں محسوس کر رہا تھا جیسے رات مسجد نبویؐ میں خصوصی حاضری سے انکار پر حجرۂ مبارک ان سے انتقام لے رہا ہو۔

اس روز نوافل سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ میرے پاس آئے تو ان کی حالت قابل ترس تھی۔ منہ سوچا ہوا تھا، چہرہ ڈھلکا ہوا۔

"آیئے مفتی صاحب چلیں" وہ بولے۔ پھر وہ سبز جنگلے کے پاس کھڑے دعا مانگ رہے تھے۔ اس روز حضوری اور تابناک تھی۔ حاضر کی آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں۔ وہ مجسم ادب اور عجز بنا کھڑا تھا۔

اس روز میں یہ بھول گیا کہ میں بھی سبز جنگلے کے پاس کھڑا ہوں۔ میں یہ بھول گیا کہ حضورؐ اعلیٰ کی خدمت اقدس میں پیش کرنے کو میرے پاس کوئی دعا تھی یا نہیں۔ قدرت وہاں کھڑے دعا پڑھتے رہے اور میں ان کو دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔

شی:

وہاں کھڑے کھڑے وہ ساٹھ سال کے ہو گئے۔ اسّی سال کے ہو گئے، سو سال کے ہو گئے، مجھے ایسا لگا جیسے رائیڈر ہیگرڈ کی "شی" کا طلسم ٹوٹ چکا ہو، اور وہ تیز رفتاری سے بوڑھی ہوئی جا رہی ہو۔ ساتھ ہی مجھے ایسے لگا جیسے قدرت کا مجھ پر جو طلسم تھا وہ ٹوٹ چکا ہے۔

"آیئے چلیں" انہوں نے میرا بازو پکڑ کر مجھے جھنجھوڑا۔ میں چونک پڑا۔ دو ایک ساعت کے لیے سمجھ میں نہ آیا کہ میں کہاں ہوں اور قدرت مجھے کیوں کھینچ رہے ہیں؟

پھر جب ہم مسجد نبویؐ کے عمومی حصے کے ایک کونے میں جا بیٹھے تو مجھے ہوش آیا۔ اور میں نے ایک بار پھر شدید غصے کا ریلا محسوس کیا۔

"کتنی ہڈیاں ٹوٹیں آپ کی؟" میری بات میں بلا کی طنز تھی۔

"ہڈیاں؟" وہ بولے "نہیں تو"۔

"کتنے زخم آئے؟" میں نے پوچھا۔

"زخم تو کوئی نہیں آیا"۔ انہوں نے جواب دیا۔

"گرے تو آپ کئی بار تھے۔"

"اچھا! میں گرا تھا کیا؟"

"آپ کو یاد نہیں کیا؟"

"مجھے خیال نہیں آتا کہ میں گرا تھا"۔

"آپ کی نیت نہیں ٹوٹتی ان حالات میں؟"

"کن حالات میں؟" انہوں نے پوچھا۔

"حجرۂ مبارک میں جو حالات ہوتے ہیں، ان حالات میں"۔

"حجرہ مبارک میں تو زائر عبادت کرتے ہیں"۔

"تو کیا اکھاڑے میں بھی لوگ عبادت کرتے ہیں؟"

آداب عالیہ:

وہ مسکرا دیئے۔ ان کی مسکراہٹ میں بڑی بے بسی تھی۔

"کل رات کو جب مسجد نبویؐ شاہ مراکو کے لیے خصوصی طور پر کھلی تھی اس وقت آپ نے مسجد نبویؐ میں آنے سے کیوں انکار کر دیا تھا؟"

ان کے چہرے کی سلوٹیں سرک سرک کر یوں ڈھیلی پڑ گئیں جیسے معذرت اور ندامت سے بھیگ گئی ہوں۔

"دیکھئے نا" وہ بولے "یہ کچھ اچھا نہیں لگتا"۔

"کیا اچھا نہیں لگتا؟"

''اس طرح مسجد نبویؐ میں آنا کچھ اچھا نہیں لگتا''۔

''کس طرح؟''

''کسی خصوصی حیثیت سے۔ جب...... جب مسجد نبویؐ خصوصی طور پر کھولی جائے۔ صاحب حیثیت لوگوں کے لیے کھولی جائے۔ میں۔ میں۔ میں''۔ وہ اٹک اٹک کر رک گئے۔ پھر سنبھل کر بولے: ''حضورؐ کی خدمت عالیہ میں حاضری دینے کے کچھ آداب ہونے چاہئیں''۔

''اللہ اکبر...... اللہ اکبر''۔ مسجد نبویؐ کے موذن کی اذان گونجی۔

مسجد نبویؐ

اس روز ۱۶ مارچ کا دن تھا۔ ۱۹۶۸ء واں سال تھا۔ مسجد نبویؐ میں ابھی فجر کی اذان نہیں ہوئی تھی۔

اس روز بھی قدرت نے مجھے صبح کاذب کے منہ اندھیرے میں جگا دیا تھا۔

پھر ہم دونوں باب جبرئیل سے داخل ہو کر حجرہ پاک میں پہنچے تھے جہاں قدرت نفل پڑھنے میں مصروف ہو گئے تھے اور میں ایک کونے میں بیٹھ کر ان کی کیفیت دیکھتا رہا تھا۔ اس وقت قدرت اس باکسنگ گیند کی طرح تھے تو رسے سے بندھی ہوئی ہوتی ہے اور جسے باکسنگ کی مشق کرنے والے گھونسے مارتے رہتے ہیں۔ وہ اچھلتی ہے، گھومتی ہے، پھدکتی ہے، جھولتی ہے لیکن رسے کے مرکز پر قائم رہتی ہے۔

حجرے میں لوگوں کا ہجوم قدرت کو چاروں سے دھکے دے رہا تھا لیکن وہ نماز کے رسے سے بندھے رہے...... دھکے، ٹھوکریں، قلابازیاں ان کی نیت نہیں توڑ سکتی تھیں۔

حجرے میں نفل ادا کرنے کے بعد وہ باہر سبز جنگلے کے پاس بڑے ادب، عجز اور انہماک سے دعا مانگتے رہے تھے۔ پھر ہم دونوں مسجد کے وسطی کے صحن میں جا بیٹھے تھے اور نماز فجر ادا کرنے کے لیے اذان کا انتظار کرنے لگے تھے۔

اس وقت مسجد نبویؐ میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ سو ڈیڑھ سو ہوں گے۔ وہ سب عبادت میں مصروف تھے اور اذان کا انتظار کر رہے تھے۔ دفعتاً سبز گنبد کی طرف سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔

باادب باملاحظہ ہوشیار:

مکہ معظمہ کی طرح مسجد نبویؐ کی اذان بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ وہ اٹھا کر بٹھا دیتی ہے۔ مسجد نبویؐ کے اکوسٹکس بھی ACCOUSTICS اس انداز سے قائم کئے گئے ہیں کہ آواز ربڑ کے گیند کی طرح اچھلتی ہے۔ گویا ایک سے زیادہ موذن اذان میں شریک ہوں۔ ایک آواز اللہ اکبر ختم کر نہیں پاتی کہ دوسری آواز اسے پھر سے اٹھا لیتی ہے۔ یوں ایک ڈرامائی ماحول پید ہو جاتا ہے۔ دلوں پر SUSPENSE کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ آپ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ کچھ ہونے والا ہے جیسے ابھی خطیبوں کے ہوشیار خبر دار کے آوازے ختم ہوتے ہی ظل الٰہی داخل ہو جائیں گے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اذان کے بعد اللہ تعالیٰ خود تشریف لا کر نمازیوں کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے تا کہ لوگوں کے سجدے صحیح معنوں میں سجدے بن جائیں۔

مرد قدیم:

ابھی موذن نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا ہی تھا اور مسجد میں بیٹھے ہوئے لوگ چونکنے کے عالم میں ہی تھے کہ میری نگاہ اوپر کو اٹھ گئی ...... اور وہ سامنے کھڑے تھے۔

وہ مجھ سے بہت دور تھے لیکن میں انہیں اس قدر قریب دیکھ رہا تھا جیسے میری آنکھوں پر ذوم لنز ZOOM LENSE فٹ کر دیا گیا ہو۔

مجھے ایسے لگا جیسے مسجد نبویؐ کی چھت کے برابر اونچی ایک کتاب کھڑی ہو گئی ہو اور تاریخ اسلام کی اس کرم خوردہ کتاب کے جہازی اوراق سے نیچے اتر کر وہ مسجد نبویؐ میں داخل ہو گئے ہوں۔ ان کے چہرے اور لباس کی ایک ایک تفصیل واضح تھی۔

میرے سامنے ایک عرب کھڑا تھا جو آج کے جدید عرب سے قطعی طور پر مختلف

تھا۔جس کے خدوخال، طریقے، چال ڈھال پر قدامت کی مہر ثبت تھی۔اس ماحول میں وہ یکسر منفرد تھا......منفرد ممتاز۔

ان کا رنگ سانولا تھا۔اس حد تک سانولا جیسے لوہے کے بنے ہوئے ہوں۔ بشرے پر وقار تھا، سنجیدگی تھی، مستعدی تھی، خردمندی تھی، ہوشیاری تھی، معاملہ فہمی تھی، خود آگاہی تھی، جنگجوئی تھی، عزم تھا، سپہ سالاری تھی۔

انہیں دیکھ کر محسوس ہو رہا تھا کہ وہ منتظم ہیں، سردار ہیں، حکم دینے کے عادی ہیں۔

ان چہرہ نورانی نہیں تھا۔جیسے کونے میں بیٹھ کر عبادت کرنا ان کا شعار نہ ہو۔ ان کے بشرے پر علم کی جھلک نہیں تھی۔خودستائی نہیں تھی۔جو عالم کے چہرے پر تنبو کی طرح تنی ہوئی ہوتی ہے۔وہ علم کے تخت پر جلوہ افروز نہیں تھے جیسے علماء ہوتے ہیں۔اس کے برعکس ان کے انداز سے عمل مترشح ہو رہا تھا۔یوں لگتا تھا جیسے کوئی سپاہی بازوؤں کے بل بوتے پر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو۔ان کے چہرے پر حوالگی یا سپردگی نہیں تھی۔

ان کے بشرے پر عجیب سی کرختگی پھیلی ہوئی تھی۔بے نام سا کڑا پن۔اس کڑے پن میں محافظین مسجد نبویؐ کی جھلک موجود تھی۔

محافظین حرم:

پہلے دن جب میں نے محافظین حرم کو دیکھا تو میں حیران رہ گیا۔

''ارے یہ کون ہیں؟'' میں نے قدرت سے پوچھا۔

''یہ مسجد نبویؐ کے محافظ ہیں''۔انہوں نے جواب دیا۔

''مسجد نبویؐ کے محافظ؟''

''ہاں''۔قدرت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"لیکن یہ کون سی مخلوق ہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"ان کے چہروں پر جذبات کی کوئی رمق نہیں، کوئی حرکت نہیں، جیسے منجمد ہوں، مقفل ہوں، سر بستہ ہوں۔"

"دیکھ لیجئے" قدرت نے کہا "ایسے ہی ہیں"۔

"دیکھ ہی تو رہا ہوں۔ آخر اس کی کوئی وجہ ہوگی؟"

"پتہ نہیں۔" وہ بولے۔

"کیا انوار کی بارش احساسات کو منجمد کر دیتی ہے؟ کیا قرب کا تسلسل انسان کو مرد آہن بنا دیتا ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہاں تو منجمد لوگ آ کر پگھل جاتے ہیں، مقفل دل اپنے پٹ کھول دیتے ہیں، آہنی قلب بہنے لگتے ہیں، خشک آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں تو کیا اس یہ مطلب ہے کہ انوار کی رم جھم سیال بنا دیتی ہے؟ لیکن انور کی موسلا دھار اور مسلسل بارش پھر سے منجمد کر دیتی ہے۔

دیر تک میں سوچ میں کھویا رہا۔ پھر میں نے سوچا۔

"آپ کو یقین ہے کہ یہ لوگ اِنس ہی ہیں؟"

"کیا مطلب؟" قدرت نے پوچھا۔

"شاید جن ہوں اور انسان کی شکل میں یہاں گھومتے پھرتے ہوں۔"

"آپ نے باب نسواں پر متعین پاپوش محافظ کو غور سے دیکھا ہے کیا؟" قدرت نے پوچھا۔

مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کو آتے ہوئے قدرت نے مجھ سے کہا تھا کہ مدینہ منورہ مکہ شریف سے مختلف ہے۔

"آپ کا مطلب ہے کہ دونوں مسجدوں کی تعمیر میں فرق ہے"۔

''نہیں''۔ وہ بولے ''تعمیر کی بات نہیں، تاثیر کی بات کر رہا ہوں''۔

''تاثیر؟'' بات میری سمجھ میں نہ آئی تھی۔

قانون اور رحمت:

''ماحول کے تاثرات مختلف ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ مکہ معظمہ قانون ہی قانون ہے اور مدینہ منورہ رحمت ہی رحمت ہے۔'' قدرت نے وضاحت کی۔

میں پھر بھی نہ سمجھا۔ اس پر قدرت نے مجھے یہ واقعہ سنایا:

''مکہ معظمہ میں بچوں کو حرم میں داخل ہونے کی اجازت نہیں، لیکن مسجد نبویؐ میں بچے کھیلیں یا شور مچائیں تو انہیں کوئی نہیں روکتا۔ پاکستان کا ایک فوجی افسر عمرہ کرنے کے لیے ایک مہینے کی چھٹی پر یہاں آیا تھا۔ مسجد نبویؐ میں اس نے دیکھا کہ بچے شور مچا رہے ہیں۔ اسے بے حد غصے آیا۔ کہنے لگا ''یہ سراسر بے ادبی ہے''۔ اس نے بچوں کو ڈانٹا۔ اس پر اس کے ساتھی نے جو مدینہ منورہ کی ڈسپنسری کا ڈاکٹر تھا اس کو منع کیا کہ بچوں کو نہ ڈانٹے۔ افسر نظم و نسق کا متوالا تھا، اس نے ڈاکٹر کی ان سنی کر دی۔ رات کو اس موضوع پر دونوں میں بحث چھڑ گئی۔ ڈاکٹر نے کہا ''حضور اعلیٰ یہ پسند نہیں کرتے کہ بچوں کو ڈانٹا جائے''۔

اسی رات افسر نے خواب میں دیکھا۔ حضور اعلیٰؐ خود تشریف لائے، خشمگیں لہجے میں فرمایا ''اگر آپ مسجد میں بچوں کی موجودگی پسند نہیں کرتے تو مدینہ چلے جائیں''۔

اگلے روز پاکستان کے فوجی ہیڈ کوارٹرز سے ایک تار موصول ہوا جس میں اس افسر کی چھٹی منسوخ کر دی گئی تھی اور اسے فوراً ڈیوٹی پر حاضر ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔

''آپ کو اس واقعے کا کیسے پتہ چلا؟'' میں نے قدرت سے پوچھا۔

''مجھے ڈسپنسری کے ڈاکٹر نے بتایا جس کے پاس وہ افسر ٹھہرا ہوا تھا۔''

"یہ بتائیے کیا مدینہ منورہ میں بزرگ ہوتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں بہت" وہ بولے۔

"مکہ معظمہ سے بھی زیادہ؟"

"ہاں، غالباً زیادہ، لیکن یہ لوگ ظاہر نہیں ہوتے۔"

"اگر آپ کو کسی بزرگ کا پتہ ہو تو ملوا دیجئے، میری بڑی خواہش ہے کہ مدینہ کے کسی بزرگ سے ملوں"۔

"ہاں" قدرت نے جواب دیا "ایک بزرگ کو جانتا ہوں"۔

"کون ہیں وہ؟"

پاپوش بابا:

"وہ مسجد نبویؐ کے دروازے پر جوتوں کی رکھوالی کرتے ہیں۔ پاکستان کے ہیں لیکن اب مدینہ منورہ میں ہی مقیم ہو گئے ہیں"۔

"آپ کو ان کی بزرگی کا کیسے علم ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پچھلی مرتبہ جب میں مدینہ منورہ حاضر ہوا تھا تو میں نے دیکھا کہ باب نسواں سے باہر دہلیز پر ایک آدمی بیٹھا سردی میں ٹھٹھر رہا ہے میں گھر جا کر ایک کوٹ اور ایک سوئیٹر اٹھا لایا اور آ کر اس آدمی کو پیش کیا۔ اس نے اسے قبول کیا۔ میں نے پوچھا۔ "آپ کا ٹھکانہ کون سا ہے؟"۔ بولا "صبح و شام یہیں پڑا رہتا ہوں۔ آج تک مسجد نبویؐ میں داخل ہونے کی ہمت نہیں پڑی۔ جب حضورؐ خود بلائیں گے تو حاضری دوں گا"۔ میں نے کہا "مسجد نبویؐ میں جاتے کیوں نہیں؟" وہ بولا "جانے لگتا ہوں تو احساس گناہ اس حد تک طاری ہو جاتا ہے کہ خود کو کتا دیکھنے لگتا ہوں۔ اس حالت میں داخل ہونے کی جرأت کیسے کر سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا "ٹھکانہ تو خیر ہو گیا۔ کھانے کا انتظام کیا ہے؟" بولا، "یہاں اس کا ذکر نہیں۔ ایک ولی یہاں

بلیوں کے لیے کھانا اکٹھا کرنے پر مامور ہے۔ سارا دن سر پر ٹوکری اٹھائے پھرتا ہے۔ جگہ جگہ سے کھانے کے ٹکڑے اکٹھے کرتا رہتا ہے اور پھر جب کھانے کے وقت وہ ٹوکری لے کر آتا ہے تو مدینہ کی ساری بلیاں میاؤں میاؤں کرتی ہوئی اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ جس شہر میں بلیوں کا اتنا انتظام ہے وہاں انسان کیسے بھوکا رہ سکتا ہے''۔
میں نے اس سے پوچھا ''کیا تو اس ولی کو جانتا ہے جو بلیوں کی خوراک جمع کرنے پر مامور ہے؟'' بولا ''میں نہیں جانتا۔ وہ سامنے باب نسواں میں جو شخص جوتوں کی رکھوالی کرتا ہے وہ اسے جانتا ہے۔'' ''تو جوتوں کے رکھوالے سے واقف ہے کیا؟'' میں نے پوچھا ''نہیں'' وہ بولا۔ ''میں یہاں دن رات جو پڑا رہتا ہوں، میں نے اسے اکثر احکامات جاری کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ شخص انتظامیہ کا رکن معلوم پڑتا ہے''۔

جب میں پہلے روز مدینہ منورہ میں پہنچا تھا۔ اس روز قدرت کی طبیعت ناساز تھی اور میں اکیلا مسجد نبویؐ کا باہر ہی سے طواف کرتا رہا تھا۔ اس روز میں نے پاپوش چوکیدار کو غور سے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گویا ایٹم پھوٹ رہے تھے۔ اس نے مجھ پر ایک نگاہ ڈالی تھی، اور میں نے محسوس کیا تھا جیسے میں ذبح کیا ہوا بکرا تھا جو قصائی کی دوکان پر تیخ سے ٹنگا ہوا تھا۔

میں نے قدرت کو اس ملاقات کی تفصیلات بتائیں تو ہنسنے لگے۔ بولے ''بزرگوں کو یوں دہقانوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نہیں دیکھا کرتے۔''

''تو پھر کس طرح دیکھا کرتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے آداب ہوتے ہیں۔''

''مجھے تو آداب نہیں آتے''۔ میں نے جواب دیا۔

''آپ یوں کریں کہ مدینہ منورہ کے قیام کے دوران جب بھی مسجد نبویؐ میں

داخل ہوں تو ہمیشہ باب نسواں سے داخل ہوں۔"

"وہ دروازہ تو عورتوں کے لیے مخصوص ہے۔اگر میں مسلسل اس دروازے سے داخل ہوتا رہا تو کسی روز پٹ جاؤں گا۔ممکن ہے پاپوش بابا خود اس بات پر ناراض ہو جائیں؟"

"نہیں نہیں"۔قدرت نے کہا "مناسب احترام اور عجز سے باب نسواں سے گزر یئے، پاپوش بابا کو سلام کیجئے لیکن ٹکٹکی باندھ کر ان کی طرف نہ دیکھئے۔اور جب آپ مسجد نبویؐ سے باہر آئیں تو ایک ریال پیش کیجئے۔"

اس روز سے میرا یہ معمول ہو گیا کہ باب نسواں سے مسجد نبویؐ میں داخل ہوتا۔آنکھیں جھکا کر پاپوش بابا کو سلام کرتا اور واپسی پر انہیں ایک ریال پیش کرتا۔ چونکہ میں دن میں کئی ایک بار مسجد نبویؐ میں جاتا تھا لہذا دوسرے دن ہی پاپوش بابا نے بات بھانپ لی۔انہوں نے غور سے مجھے دیکھا لیکن میں ان کی نگاہ سے اس قدر خائف تھا کہ میں نے اپنی نظریں ان کے قدموں پر مرکوز کیے رکھیں۔

"ہاں" میں نے کہا "میں نے باب نسواں کے پاپوش بابا کو ایک نظر دیکھا ہے۔دوسری نظر ڈالنے کی مجھ میں ہمت نہیں پڑی۔"قدرت ہنس پڑے۔

"کیا محافظانِ مسجد نبویؐ اور پاپوش بابا میں کوئی مناسبت نظر آئی؟"

"نہیں" میں نے کہا "پاپوش بابا کے چہرے پر کڑاپن ضرور ہے لیکن جمود نہیں، خشونت ہے لیکن بے حسی نہیں۔"

عرب سردار:

مردِ قدیم میں بھی کڑاپن ضرور تھا لیکن جمود کی جگہ ہوشمندی تھی، وقار تھا اس وقار میں سرداری کا عنصر بہت نمایا تھا۔ان کے مقابلے میں پاپوش بابا ایک کارکن نظر آتے تھے۔

حالانکہ مردم قدیم اور ہم میں بڑا فاصلہ تھا۔ وہ بیٹھے ہوئے نمازیوں کی صفوں کو چیرتے ہوئے آ رہے تھے۔ پتہ نہیں کیوں میں محسوس کر رہا تھا کہ ان کی نگاہیں ہم دونوں پر مرکوز تھیں۔

وہ بڑے دبدبے اور وقار سے چلتے ہوئے آ رہے تھے۔ زائرین انہیں دیکھ کر آپ ہی آپ آگے ہٹتے جا رہے تھے۔ ان کے راستے میں کئی ایک جگہیں خالی پڑی تھیں۔ کئی ایک صفوں میں نمازی یوں پھیل کر بیٹھے ہوئے تھے کہ دو دو، چار چار نشستوں کی جگہ بن سکتی تھی۔ لیکن مرد قدیم کہیں بھی نہ رکے۔

میں نے قدرت کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں جھکائے بیٹھے تھے۔ لیکن جھکی جھکی آنکھوں کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بن دیکھے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

''آپ اس شخص کو دیکھ رہے ہیں کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''کون شخص؟'' انہوں نے کھوکھلی آواز میں سوال کیا۔

''وہ جو سامنے صفیں چیرتا ہوا آ رہا ہے''۔ قدرت نے آنکھیں یوں اوپر اٹھائیں جیسے کچھ جانتے ہی نہ تھے۔

''دیکھا نا آپ نے، عرب دکھتے ہیں۔''

''ہاں'' وہ بولے ''بے شک عرب دکھتے ہیں''۔

''لیکن آج کے عرب سے کتنے مختلف ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے تاریخ اسلام کے بوسیدہ صفحات سے نکل کر آ رہے ہوں۔''

''ہاں'' ۔ وہ بولے ''یوں لگتا ہے جیسے وہ سیدھے ہماری طرف آ رہے ہوں''۔

''نہیں'' قدرت نے کہا ''غالباً کوئی جگہ تلاش کر رہے ہیں''۔

اس دوران میں موذن اذان کے اختتام تک پہنچ گئے تھے اور آخری اللہ اکبر

پر ڈرامائی کیفیت کا نقطہ عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اس پر مسجد میں بیٹھے ہوئے سب لوگ نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

مسجد کے صدر دروازے سے جو ہمارے عقب میں تھا، نمازیوں کا ایک تازہ ریلا داخل ہوا، ان کے لیے جگہ بنانے کی غرض سے پچھلی صفوں کے لیے نمازی اگلی صفوں میں داخل ہونے لگے۔ بہت سے لوگ پچھلی صف سے نکل کر ہماری صف میں آنے لگے۔

پیچھے سے ایک ہاتھ میرے کندھے پر آ پڑا۔ میں نے کنکھیوں سے بائیں جانب دیکھا۔ کوئی شخص میرے اور قدرت کے درمیان زبردستی گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے قدرت کو دائیں طرف دھکیل رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے مجھے بائیں طرف۔

آزردگی:

حالانکہ حج کے دوران قدرت نے بار بار مجھے تاکید کی تھی کہ حرمین میں دل کو آزردگی سے آلودہ ہونے سے حتیٰ الوسیع بچاؤ۔ مسجد میں جگہ ہو یا نہ ہو دل میں ضرور جگہ ہو۔ سجدہ کرنے میں کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو، نماز میں توجہ قائم رہے یا نہ رہے، چاہے کچھ بھی ہو جائے دل میں غصہ یا خفگی یا آزردگی پیدا نہ ہو کیونکہ یہاں مثبت رویئے سے بڑھ کر کوئی اور تفصیل اہم نہیں۔

اس وقت میں قدرت کی اس تلقین کو قطعاً بھول گیا۔ "یہ کون بدتمیز ہے"۔ میں نے سوچا۔ "جو زبردستی ہم دونوں میں حائل ہو رہا ہے۔ میں نے اسے حائل ہونے نہیں دوں گا، بالکل نہیں"۔

میں نے قدرت کی طرف اپنا دباؤ اور بڑھا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے غصے میں مزید اضافہ ہو گیا۔

"بھلے مانس اول تو اس صف میں اب گنجائش ہی نہیں ہے، اور اگر آنا ہی ہے تو بے شک آجا۔ قدرت کے دائیں ہاتھ آجا یا میرے بائیں ہاتھ آجا۔ یہ کیا تک ہے کہ تو ہم زبردستی ہم دونوں کے درمیان گھسنے پر مصر ہے۔ کوئی بات ہے بھلا۔ نہیں نہیں، میں تجھے ادھر گھسنے نہیں دوں گا۔" میں نے قدرت کی طرف اپنا دباؤ اور بڑھا دیا۔

اگر امام کچھ دیر اور توقف کرتا تو میں اپنا دباؤ قائم رکھتا لیکن امام نے نیت باندھ کر تکبیر پڑھ دی۔ میرے ہاتھ اوپر کو اٹھے اور وہ شخص ہم دونوں کے درمیان گھس کر کھڑا ہو گیا۔

اس پر مجھے اتنا غصہ آیا کہ میں بھول گیا کہ کہاں ہوں، کون ہوں، کیا کر رہا ہوں۔

مسجد میری نگاہوں سے روپوش ہو گئی۔ نماز مکینکل اٹھک بیٹھک ہو کر رہ گئی۔ لاؤڈ سپیکر شور ضرور مچا رہے تھے لیکن ان کی آواز میں کوئی مفہوم باقی نہ رہا تھا۔ میرے دل میں غصے کی کھچڑی پکتی رہی۔ ابال آتے رہے، جھاگ اٹھتی رہی، نماز کا چھکڑا گاڑی بان کے بغیر ہی چلتا رہا، حتیٰ کہ امام نے سلام پھیر دیا۔

جب میں داہنے ہاتھ دیکھتے ہوئے سلام پھیرا تو حیرت سے میں بت بن کر رہ گیا۔ میرے دائیں ہاتھ قدرت اور میرے درمیان وہ خود بیٹھے تھے...... مرد قدیم انہوں نے سلام کرنے کے لیے بائیں ہاتھ منہ موڑا مگر میں انہیں کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ ان کی آنکھوں سے شفقت بھری نگاہ مجھ پر پڑی، کرم فرمائی کی ایک پھوار سی مجھ پر گری اور میں بھیگ گیا اور اس قدر بھیگ گیا کہ نہ وہ غصہ رہا نہ خفگی، نہ کھچڑی، نہ ابال۔

کرم ہی کرم:

چاہیے تو یہ تھا کہ ردعمل کے طور پر میں احساس ندامت سے بھیگ جاتا لیکن ان کی توجہ کا اثر اس قدر شدید تھا کہ ندامت کو بھی ساتھ ہی بہا کر لے گیا۔

جب میں نے دور سے انہیں دیکھا تھا تو وہ مجھے مرد آہن نظر آئے تھے۔ ان کے چہرے پر وقار بھری خشونت تھی، لیکن اب؟ اب جبکہ قریب بیٹھ کر میں نے انہیں محسوس کیا تو وہ سراسر شفقت تھے۔ ان کے وجود سے شفقت کی شعاعیں یوں نکل رہی تھیں جیسے زمین سے کشش ثقل کی لہریں نکلتی ہیں۔ ان کے ہاتھوں، بازوؤں اور آنکھوں سے جذبۂ ہمدردی کے بھبھاکے اٹھ رہے تھے۔

"یا اللہ! یہ کیا اسرار ہے۔ اس پروقار، خود آگاہ سپہ سالار کو قریب آ کر کیا ہو گیا ہے؟ کیا یہ ان کی شخصیت کی چوتھی سمت ہے؟ لیکن یہ تو باقی سمتوں کی نفی کر رہی ہے۔ ظاہری سمت تو ہٹ کر رہنے کا احساس دلا رہی تھی لیکن یہ سمت قریب بلا رہی ہے۔ قریب اور قریب اور قریب۔"

اس قرب میں ایک عجیب سی لذت تھی۔ میں نے اپنا آپ اس لذت کے حوالے کر دیا اور پھر مجھے یوں لگا جیسے میں کسی شفقت کے سمندر کے ساحل پر لیٹا ہوا ہوں اور لہروں کا بہاؤ بڑے پیار سے مجھے چھوتا ہے اور پھر وہ لہریں مجھے اپنی گود میں کھینچ لیتی ہیں۔ سارا سمندر سمٹ کر ماں کی گود بن گیا تھا۔

دعا پڑھنے سے پہلے مرد قدیم نے جیب سے ایک لکڑی نکالی۔ اسے بصد احترام آنکھوں سے لگایا، چوما اور پھر ہاتھ دعا کے لیے پھیلا دیئے۔ دعا کے بعد کرم فرمائی کے اس سمندر میں گویا جوار بھاٹا اٹھنے لگا۔ انہوں نے بایاں بازو پھیلا کر مجھے آغوش میں لے لیا اور قریب تر کھینچ لیا۔ پھر انہوں نے دایاں بازو پھیلایا اور قدرت کو کھینچ کر قریب تر کر لیا۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہو گئے۔ اپنے بائیں ہاتھ سے مجھے تھپکنے لگے۔

نچڑتا رس گلا:

ان کے بازوؤں اور ہاتھوں سے گویا مسمریزم کی لہریں نکل رہی تھیں۔ ان کے لمس سے ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی، ایک بے نام سا سکون۔ ایک بے نام سی فرحت، جیسے انڈے کو انکیوبیٹر میں رکھ دیا گیا ہو۔

نماز کے بعد وہ دس پندرہ منٹ ہمارے پاس بیٹھے رہے۔ اس عرصے میں ان کے بازوؤں، ہاتھوں، انگلیوں اور نگاہوں نے ایک طوفان برپا کئے رکھا۔ کبھی وہ میرے لیے جگہ بناتے، کبھی میرے حاجی بیگ کو یہاں سے اٹھا کر وہاں رکھ دیتے، کبھی میری کمر کو تھپکتے، کبھی میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیتے۔

ان کی توجہ تلے میں یوں محسوس کرنے لگا جیسے خشک رس گلے کو شیرے میں ڈال دیا گیا ہو اور اس کا ذرہ ذرہ مٹھاس سے بھر کر نچڑنے لگا ہو۔ ان کی توجہ ہم دونوں پر ایک سی تھی اور اس وقت ہم دونوں مٹھاس سے نچڑ رہے تھے۔ میں نے قدرت کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے عجز سے سرشار یوں بیٹھے تھے جیسے دلہن لباس عروسی میں سر جھکائے بڑے معصوم انداز میں بیٹھی ہوتی ہے لیکن اس کی آنکھوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسے علم ہے، وہ جانتی ہے، سمجھتی ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔

میں آج تک قدرت کی زبان سے کچھ نہیں جان سکا۔ جب بھی جانا ان کی آنکھ سے جانا، نگاہ سے سمجھا۔ یہ درست ہے کہ نگاہ ساری بات نہیں بتاتی، تفصیلات سے نہیں نوازتی لیکن بنیادی طور پر نفی اثبات کی جھلک کو ضرور واضح کر دیتی ہے۔

عورت کے متعلق عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ اگر وہ "نہ" کہہ دے تو مطلب ہوتا ہے "شاید" اگر وہ "شاید" کہے تو مطلب ہوتا ہے "ہاں"۔ اور اگر وہ "ہاں" کہہ دے تو سمجھ لو وہ عورت ہی نہیں۔

اسی حساب سے میں نے قدرت کے متعلق بھی چند اصول وضع کر رکھے

ہیں۔ اگر وہ زبان سے کہیں ''پتہ نہیں'' تو مطلب ہے کچھ کچھ پتہ ہے۔ اگر وہ کہیں شاید ایسا ہی ہو تو مطلب ہے ایسا ہی ہے اور اگر وہ کہیں ہاں مجھے پتہ ہے تو یقین جانو وہ قدرت نہیں، کوئی اور شخص ہے۔ یہ تو قدرت کی زبان کی بات ہوئی۔

ویسے عام طور پر زبان انسان کا واحد عضو ہے جو جھوٹ بول سکتا ہے، جو بات پر پردہ ڈالنے کی قدرت رکھتا ہے۔

مردِ قدم کی موجودگی میں قدرت سے بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا لیکن میں کانی آنکھ سے ان کے تاثرات کو دیکھ رہا تھا۔

ردِ عمل:

مرد قدیم کے متعلق ہم دونوں کے ردِ عمل ایک سے بھی تھے اور مختلف بھی۔ میرے ردِ عمل میں حیرت کا عنصر تھا لیکن قدرت کے ردِ عمل میں حیرت کا عنصر نام کو نہ تھا۔ خوشی اور انبساط ہم دنوں میں یکساں تھی لیکن اس کی نوعیت بالکل مختلف تھی۔ میری خوشی والہانہ تھی، والہانہ خوشی مقابلتاً سطحی ہوتی ہے۔ قدرت کی خوشی میں عمق تھا، گہرائی تھی...... ان کے اظہار میں ضبط تھا۔ ہم دونوں کے رویئے میں بنیادی فرق یہ تھا کہ قدرت جانتے تھے کہ جانتے ہیں اور میں جانتا تھا کہ نہیں جانتا۔

قدرت کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ لیکن ان کے عجز کی گہرائی سے پتہ چلتا تھا کہ مرد قدیم کا مرتبہ کتنا بلند ہے۔ قدرت کی گہری خاموش ملفوف خوشی سے ظاہر تھا کہ اے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما۔

نماز کے بعد مرد قدیم نے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھا دیئے۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر پرجوش مصافحہ کیا۔ پھر وہ قدرت سے مصافحہ کر رہے تھے۔ اس کے بعد وہ اٹھ بیٹھے اور بڑے وقار سے مسجد نبویؐ کے ترکی برآمدے کی طرف چل پڑے۔ ان کی چال میں وہی وقار تھا وہی ٹھہراؤ تھا۔ وہی خود اعتمادی تھی۔

چونکہ اس وقت نمازی بیٹھے ہوئے تھے لہذا انہیں جاتے ہوئے دور تک میں دیکھتا رہا۔ میری آنکھوں میں پھر سے وہی "لگ" گیا تھا۔ مسجد میں بیٹھے ہوئے باقی لوگ سب کے سب فوکس سے باہر نکل کر دھندلا گئے تھے۔ صرف ایک شخص پیش پیش تھا۔

برآمدے کے قریب جا کر انہوں نے مڑ کر ہماری جانب دیکھا۔ وہی مرد آہن، مستعد، خردمند، معاملہ فہم، جنگجو، خود آگاہ، قدیم سردار۔

انہیں دور کھڑے دیکھ کر مجھے شک پڑنے لگا کہ یہ وہ شخص نہیں جو دو کچھ دیر پہلے ہمارے درمیان بیٹھا تھا اور جن کی شفقت بھری مٹھاس میں ہم ابھی تک لت پت تھے۔

پھر وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور…… غالباً تاریخ اسلام کے اوراق میں پھر سے جا داخل ہوئے۔

اس روز سارا دن ہم دونوں خاموش رہے۔ پتہ نہیں قدرت کیوں خاموش تھے۔ میری یہ کیفیت تھی کہ میں ان جانے میں اس پراسرار ملاقات کی جگالی کر رہا تھا۔ ذہن پھر پھر کر مرد قدیم پر جا مرکوز ہوتا اور میرا رس گلا پھر سے اس مٹھاس کے ڈونگے میں ڈوب جاتا۔

اس رات دیر تک مجھے نیند نہ آئی۔ ذہن میں مرد قدیم اس قدر رچے بسے ہوئے تھے کہ سونے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بہت دیر تک میں پڑا سوچتا رہا۔ پھر پتہ نہیں کس وقت آنکھ لگ گئی۔

مناسب۔ نامناسب:

پہلے پہر میری آنکھ کھل گئی۔ کچھ دیر میں انتظار کرتا رہا کہ ابھی قدرت آئیں گے اور کہیں گے چلئے باب جبرئیل کھلنے کا وقت ہو گیا۔

قدرت نے آئے تو مجھے خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ خود انہیں جگا لوں، کیونکہ دیر ہوگئی تو وہ حجرے میں نفل ادا کرنے کی سعادت سے محروم رہ جائیں گے اور پھر سارا دن احساسِ محرومی میں ڈوبے رہیں گے۔

میں اٹھ بیٹھا، جلدی جلدی تیاری کی اور قدرت کے کمرے کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔

قدرت نے دروازہ کھولا۔

''سو رہے تھے آپ؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں تو'' وہ بولے۔

''تو پھر جانے کی تیاری نہیں کی۔ جلدی چلئے ناباب جبرئیل تو کھل بھی گیا ہو گا۔ ہم تو پہلے ہی لیٹ ہیں''۔

''نہیں آج نہیں'' وہ بولے۔

''کیوں؟ آج کوئی خصوصی بات ہے کیا''۔

''نہیں خصوصی بات تو نہیں''۔

''تو چلتے کیوں نہیں؟''

''نہیں'' وہ مسکرا دیئے۔

''آپ کا مطلب ہے کہ آج آپ باب جبرئیل نہیں جائیں گے؟''

''آج ہم براہ راست مسجد نبویؐ میں جائیں گے جب اذان ہو گی'' قدرت نے جواب دیا۔

''لیکن حجرے میں نفل کیوں نہیں پڑھیں گے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہمارا کام ہو چکا ہے''۔ قدرت بولے۔

"کون سا کام؟" میں نے پوچھا۔

"مطلب یہ ہے کہ جو ہم کو کرنا تھا کر لیا ہے۔"

"پھر بھی وہاں جانے میں کیا حرج ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" ۔وہ بولے "مناسب نہیں"۔

"مناسب کیوں نہیں؟"

"خواہ مخواہ وہاں جا کر بھیڑ کرنا مناسب نہیں۔ یہ تو دوسروں کے راستے میں حارج ہونے کے برابر ہوگا"۔

"تو کیا سبز جنگلے کے پاس دعا بھی نہیں کریں گے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" ۔وہ بولے "مناسب نہیں"۔

دو ایک ساعت تو میں مناسب اور نا مناسب کے اس نئے زاویئے پر حیران رہا، پھر مجھے وہ دن یاد آ گیا۔

آدابِ حاضری:

اس دن اتفاقاً قدرت مجھے لاہور میں مل گئے تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ داتاؒ صاحب کو سلام کرنے کے لیے حاضری دوں۔ میں نے قدرت سے پوچھا:

"آپ کو کوئی مصروفیت تو نہیں؟"

بولے "نہیں"۔

میں نے کہا "تو چلئے داتاؒ صاحب چلیں"۔

بولے "آپ اکیلے ہو آئیں"۔

میں نے پوچھا "کیوں؟ جب آپ کو کوئی مصروفیت نہیں تو پھر جانے میں کیا حرج ہے؟" قدرت کہنے لگے "اتنے بڑے درباروں میں ایسے تو نہیں جا سکتے نا کہ سر پر ٹوپی رکھی پاؤں میں جوتا پہنا اور چل پڑے"۔

"ساری دنیا جاتی ہے"۔ میں نے کہا۔

انہوں نے میری بات کو ان سنا کر دیا۔ کہنے لگے۔"بزرگوں کے روبرو جانے کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ حاضری دینے کے آداب ہوتے ہیں۔ عرض کرنے کے آداب ہوتے ہیں۔"پھر مجھے محترمہ عطیہ کی بات یاد آ گئی۔

محترمہ عطیہ صاحب پہلی مرتبہ عمرہ کر کے آئیں تو میں نے انہیں یہ سعادت حاصل کرنے پر مبارکباد پیش کی۔ برسبیل تذکرہ کہنے لگیں۔

"مدینہ منورہ میں حاضری دینے کا مزا نہیں آیا"۔

میں نے پوچھا"جی وہ کیوں؟"

کہنے لگیں:"حضور کی خدمت میں حاضری کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ انہیں ملحوظ خاطر رکھے بغیر حاضر ہونے میں وہ مزا تو نہیں۔ اب کی بار تو مجبوری تھی اس لیے میں نے مسجد نبوی میں بیٹھ کر عہد کیا تھا کہ انشاء اللہ ایک بار پھر حاضری دوں گی۔ باقاعدہ طور پر حاضری دوں گی"۔

ضرور قدرت اسی باقاعدگی اور انہیں آداب کو پیش نظر رکھ کر کہہ رہے تھے۔

قدرت اور میں ہم دونوں فرد تھے، ایک ساتھ حج کرنے آئے تھے، ایک جگہ رہتے تھے، ایک ساتھ حاضری دیتے تھے لیکن ان کی حاضری اور میری حاضری میں کتنا فرق تھا۔

پھر دفعتاً مجھے خیال آیا کہ شاید ان کے اس ارادے کو مرد قدیم کی آمد سے تعلق ہو۔

خوشبو:

میں نے سوچا اگر صاف بات کروں تو قدرت پہلو بچا جائیں گے لہذا کیوں نہ برسبیل تذکرہ بات کروں۔

میں نے کہا "مجھے تو رات بھر نیند نہیں آئی"۔

"کیوں؟" وہ بولے۔

"مرد قدیم آنکھوں کے سامنے کھڑے رہے"۔

"اچھا" وہ بولے۔

"آپ کو ان کا خیال نہیں آیا کیا؟"

"آیا تھا" وہ بولے۔

"کیسے آیا؟" میں نے انہیں چھیڑا۔ "عجیب بات ہے وہ بزرگ نہیں دکھتے تھے۔ پھر کیا تھے وہ؟"

"اچھے لوگ تھے"۔ قدرت نے جواب دیا۔

"کتنے اچھے تھے بھلا؟"

اس پر قدرت چھلک گئے۔ بولے "انہیں رخصت ہوئے ۲۴ گھنٹے ہو چکے ہیں لیکن ان کی خوشبو ابھی تک جوں کی توں باقی ہے"۔

اس کے ایک سال بعد جب ہم اسلام آباد میں بیٹھے تھے، قدرت، عفت، محترمہ عطیہ اور میں، تو مجھے قدرت کا یہی جملہ یاد آ گیا۔

میں نے عطیہ صاحبہ سے کہا کہ مسجد نبویؐ میں ہمیں ایک ایسے بزرگ سے ملنے کی سعادت حاصل ہوئی جن کی خوشبو قدرت کے لیے کئی ایک دن قائم رہی۔

"سچ؟" عطیہ نے شدت اشتیاق سے پوچھا۔

"سچ" میں نے کہا "چاہے پوچھ لیجئے ان سے"۔ عطیہ نے قدرت کی طرف دیکھا۔ قدرت نے کچھ کہے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کون تھے وہ؟" عطیہ نے پوچھا۔

قدرت نے کچھ منہ کہے بغیر ہاتھ ہلا کر، اللہ جانے، کا اشارہ کیا۔

مراقبہ:

"یہی تو میں آپ سے پوچھنے کے لیے بےقرار تھا"۔ میں نے عطیہ سے کہا۔ "اب آپ جو ذرا یہاں تشریف لائی ہیں تو ذرا پوچھ کر بتائیے تو سہی کہ وہ کون بزرگ تھے"۔

عطیہ نے قدرت کی طرف دیکھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھے تھے۔ یہ بھانپ کر قدرت کو کوئی اعتراض نہیں، عطیہ باادب بیٹھ گئیں۔ سر جھکا لیا اور مراقبے میں چلی گئیں۔

کچھ دیر کے بعد عطیہ نے سر اٹھایا۔ ان کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔ آنکھوں میں انبساط کی بھیڑ تھی۔ بولیں "وہ بزرگ جو مسجد نبویؐ میں آپ کے پاس تشریف فرما تھے، شہدائے بدر میں سے تھے۔ آپ بڑے خوش نصیب ہیں"۔

قدرت نے سر جھکا لیا۔

پتہ نہیں مجھے اس وقت کیا ہوا، میں نے بےسوچے سمجھے کہا "میں تو سمجھا تھا شاید وہ شہدائے بدر سے بھی بڑے تھے"۔

میری بات سن کر قدرت پر شدید گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ رنگ زرد ہو گیا۔ چہرہ یوں ٹوٹ گیا جیسے ٹھوکر لگنے پر شیشے کا گلاس چور چور ہو جاتا ہے۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" انہوں نے التجا بھری آواز میں کہا "ان سے بڑے تو خود حضورؐ اعلیٰ ہیں"۔

مینارِ عظیم

چلنے دی بُوٹی:

اس روز سارا دن میرا وجود مردِ قدیم سے یوں بھرا رہا جیسے انار، دانوں سے بھرا ہوتا ہے۔ جدھر بھی نگاہ اٹھاتا انہیں روبرو پاتا۔ سارا دن میں بازار کی خاک چھانتا رہا۔ ہر بازار میں دور سامنے سے مردِ قدیم آتے ہوئے دکھائی دیتے۔ ہر دکان پر وہ دکاندار کی پشت پر کھڑے نظر آتے۔

مردِ قدیم سے میرا وجود اس قدر بھرا ہوا تھا کہ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کسی سے ان کی بات کروں۔ کسی کو بتاؤں کہ حضورؐ نے مجھ پر کتنا کرم فرمایا تھا۔ کسی سے ان کا تذکرہ کروں۔ لیکن کس سے بات کرتا، وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

اس روز میں مدینہ منورہ میں گویا اکیلا تھا، تن تنہا، وہ بھیڑ، وہ شوروشغب میری نگاہ میں دھندلا چکے تھے۔ گردوپیش مدھم پڑ چکے تھے۔

قدرت اور ڈاکٹر دونوں ہی فجر کی نماز کے بعد کالی موٹر میں بیٹھ کر نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ جاتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ ہم ایک ضروری کام کے لیے جدہ جا رہے ہیں۔ شام تک واپس لوٹ آئیں گے۔ پتہ نہیں انہیں جدہ میں کیا کام تھا۔ میں نے بہتیرا پوچھنے کی کوشش کی تھی لیکن قدرت کی گم سم شخصیت سے بات اخذ کر لینا ممکن نہیں۔ پوچھو تو جواب تو وہ دے دیتے ہیں لیکن اس جواب سے بات کھلتی نہیں بلکہ الجھ جاتی ہے۔

شام کے وقت جب قدرت واپس آئے تو بہت خوش خوش نظر آتے تھے۔

آتے ہی پوچھنے لگا ”کہیے مفتی صاحب دن کیسے گزرا؟“

”بہت برا“ میں نے جواب دیا۔

"کیوں؟" وہ چونکے۔

"سارا دن مرد قدیم کی نذر ہو گیا۔ سارا دن نہ انہوں نے کچھ دیکھنے دیا، نہ سوچنے دیا، نہ محسوس کرنے دیا"۔

ابھی ہم مرد قدیم کے متعلق باتیں کر رہے تھے کہ مدینے کی پاکستانی ڈسپنسری ڈاکٹر کہنے آ گئے۔ کہنے لگے: "آج پھر مسجد نبویؐ رات کو خصوصی طور پر کھلے گی۔ اگر آپ چاہیں تو زیارت اور عبادت کے لیے تشریف لے چلیں"۔

"آج کس کے لیے کھلے گی؟" ڈاکٹر عفت نے پوچھا۔

"کل تو مراکو کے شاہ کے لیے کھلی تھی ناں، آج پاکستانی علماء کے وفد کے لیے کھلے گی"۔ انہوں نے جواب دیا۔

سفارت پاکستان:

۱۹۶۸ء میں پاکستانی علماء کے ایک وفد کو حج پر مدعو کیا گیا تھا۔ اس وفد میں ہمارے چند علمائے دین شامل تھے۔

جب میں پہلی مرتبہ جدہ کے سفارت پاکستان میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سفارت کے عملے کی نگاہیں صدر دروازے کی طرف مرکوز ہیں۔

سفارت کی عمارت پاکستانی زائرین سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ وہ سب التجا بھری نگاہوں سے عملے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کاغذات تھے جو وہ عملے کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر آہ زاری سے بھیگی ہوئی معروضات تھیں، ان کے چہرے حزن و ملال کی تصویر تھے۔

ایک کہہ رہا تھا میری عرض سن لیجئے جناب والا! دوسرا کہہ رہا تھا، حضور مجھے یہاں کھڑے تین دن ہو چکے ہیں۔

تیسرا زار و قطار روئے جا رہا تھا! غالباً وہ کہہ کہہ کر تھک گیا تھا۔ زبان سے

عرض حال کرتے کرتے ہار گیا تھا، اور اب الفاظ نے آنسوؤں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

ایک صاحب بڑے جلال میں یوں اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر ٹہل رہے تھے۔ جیسے چڑیا گھر میں شیر غصے اور بے بسی کے عالم میں جنگلے کے پیچھے چکر کاٹتا ہے۔

چند ایک لوگ ہیسٹرک ہو رہے تھے۔ کبھی رونے لگتے، کبھی اپنی لاچاری اور بے بسی پر ہنسنے لگتے۔ پاکستانی سفارت کا ملحقہ میدان حاجت مندوں اور پریشان حال زائرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لیکن سفارت کا عملہ دور اپنے اپنے کمروں میں بند چھپا بیٹھا تھا۔ عملے کا کوئی اہلکار اگر کسی خاص ضرورت کے تحت باہر نکلتا تو حاجت مند دوڑ کر اس کے گرد حلقہ بنا لیتے۔ پھر منتوں، آہ زاری اور ہچکیوں سے فضا بھر جاتی اور پھر اہلکار کی کرخت آواز گونجتی: "ہٹ جاؤ، پیچھے ہٹ جاؤ"

اہل کاروں کی نگاہیں صدر دروازے پر مرکوز تھیں۔ کہ کب علماء کا وفد آئے اور وہ وفد کے روبرو دست بستہ حاضر ہو کر احکامات بجا لائیں۔

سفارت پاکستان کے عملے کو حکم موصول ہوا تھا کہ علمائے پاکستان کے وفد کے لیے چشم براہ ہیں، ان کی خاطر و مدارت میں کوتاہی نہ ہو۔ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو، شکایت نہ ہو۔

سفارت پاکستان کا عملہ فرض شناس تھا۔ اپنے فرض کو پورا کرنے کے لیے وہ بے تاب تھے۔ وفد کے لیے اس حد تک چشم براہ تھے کہ اراکین وفد کے علاوہ انہوں نے ہر کسی کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

سفارت کے میدان میں کھڑے عام زائرین ان کی نگاہ میں رکاوٹیں تھیں۔ ان خواہ مخواہ کی رکاوٹوں کو دیکھ کر انہیں غصہ آتا تھا۔ جس کا وہ دل کھول کر اظہار کرتے

تھے، زائرین کو ڈانٹتے تھے، ان کا تمسخر اڑاتے تھے۔ انہیں حقارت سے دیکھتے تھے۔

ایک کہتا تھا "ہٹائیے جی، یہ تماشہ تو روز لگا رہتا ہے"

دوسرا کہتا "میاں دس بیس ہوں تو کوئی ان کی بات سنے، یہاں تو ہزاروں ہیں۔ اور جو ان کے کام کر بھی دو تو مزید ہزاروں آ پہنچیں گے۔ یہ سلسلہ تو لامتناہی ہے"۔

علماء کا وفد:

ادھر وفد کے علمائے کرام تھے۔ یہ احساس ان کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا کہ وہ عام زائر نہیں بلکہ خصوصی مہمان ہیں۔ اور پاکستانی سفارت اور سعودی حکومت صرف اس واسطے چشم براہ کھڑے ہیں کہ ان کے آرام و آسائشوں کا خیال رکھیں کیونکہ وہ خصوصی ہیں۔

اگر آپ کو یہ احساس ہو جائے کہ آپ خصوصی ہیں اور دو ملکوں کے اہل کاروں کا واحد کام آپ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے تو لازماً ذاتی آرام اور آسائش کے متعلق آپ کے خیالات میں ایک عظیم الشان وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور آپ کی خوشنودی آسانی سے حاصل ہونی ممکن نہیں رہتی۔

بہر حال وفد کی شکایات لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھیں۔ انہیں شکایت تھی کہ سفر کرنے کے لیے انہیں جو کار مہیا کی گئی ہے وہ کالے رنگ کی نہیں تھی۔ اس پر جھنڈا نہیں لگا ہوا، اس کا انجن رولز رائس کا نہیں، انہیں یہ شکایت تھی کہ مکہ شریف کی سڑک پر سفر کرتے ہوئے گرد اڑتا ہے۔ وضو فسق ہو جاتا ہے، پاکیزگی میں فرق آ جاتا ہے۔

ایک کہتا "ہم تو کھیر، آرد، خرما سے ناشتہ کرنے کے عادی ہیں۔ اور یہ انڈا ٹوسٹ لاحول ولاقوۃ"۔

دوسرا کہتا "ہمیں قیمہ پسند نہیں۔ اس کے کوفتے بنا دیئے جائیں تو البتہ"۔

تیسرا کہتا ''یہ چائے وائے اپنے کام کی نہیں۔ ہاں دودھ کا گلاس ہو تو بہتر رہے گا اور اس میں بالائی ڈال دی جائے تو مضائقہ نہیں''۔

یہ خصوصی مہمان اپنے آپ کو سعودی عرب کے قانون سے مستثنیٰ سمجھتے تھے۔ جب سعودی عرب کی چوکیاں انہیں روک کر ان سے کوائف پوچھتیں تو وہ غصے میں آ جاتے۔ کتنے بے خبر ہیں یہ لوگ جو اتنا بھی نہیں جانتے کہ ہم مہمان خصوصی ہیں اور ملک کا قانون ہم پر لاگو نہیں ہوتا ہے۔

مدینہ منورہ کی حدود میں داخل ہوتے وقت میں نے دیکھا کہ وفد کی ایک گاڑی رکی کھڑی ہے اور چوکی کے کارندے منتیں کر رہے ہیں کہ حضور قانون کے مطابق داخلہ پر مقررہ رقم کی ادائیگی ضروری ہے۔ چونکہ آپ خصوصی مہمان ہیں، آپ اس سے مستثنیٰ ہیں لیکن یہ صاحب جنہیں آپ مہمان بنا کر ساتھ لائے ہیں ان کی ادائیگی ضروری ہے۔

دو ایک ارکان تو کارندوں کی منت سماجت کو اپنی توہین سمجھ رہے تھے۔ ایک رکن قرآنی زبانی میں اپنے غصے کا اظہار کر رہے تھے۔ دوسرے کہہ رہے تھے ''تم نے ہماری گاڑی کو روکنے کی جسارت کیوں کی؟''

وفد کے اس رویئے کو دیکھ کر چوکی کے کارکنوں نے ایک طرف جا کر باہمی مشورہ کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ قابل ادا محصول وہ سب اپنی ذاتی جیبوں سے ادا کر دیں اور مہمان وفد سے کچھ نہ کہیں۔ جب ہماری گاڑی چلی تو وہ سب آپس میں چندہ جمع کرنے میں مصروف تھے۔

اس رات مسجد نبوی تخصوصی طور پر علماء کے اس وفد کے لیے کھولی جا رہی تھی۔

عام حاضری خاص حاضری:

ڈسپنسری کے ڈاکٹر نے بڑے احترام سے قدرت کو مخاطب کیا۔ کہنے لگے

''کل تو آپ کی طبیعت خراب تھی اس لیے موقع سے فائدہ حاصل نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے آج پھر موقع دیا ہے۔ اگر آپ کی طبیعت ٹھیک ہو تو آج حرم میں تشریف لے چلیے۔ آج پھر مسجد نبوی خصوصی طور پر علمائے پاکستان کے وفد کے اعزاز میں کھل رہی ہے۔''

قدرت نے بڑی لجاجت سے ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا ''جدہ کے طویل سفر کے بعد مجھ میں اتنی ہمت نہیں رہی کہ مسجد نبویؐ میں حاضری دے سکوں''۔

ڈاکٹر عفت اور میں حیرت سے قدرت کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ قدرت اتنی بڑی نعمت کو کیوں ٹھکرا رہے ہیں۔ آخر وہ مسجد نبویؐ میں خصوصی حاضری کے اس موقع پر ہچکچا رہے تھے۔ کیوں پہلو تہی کر رہے تھے؟

جب ڈاکٹر صاحب مایوس ہو کر چلے گئے تو عفت اور میں دونوں ہی قدرت پر برس پڑے۔ ''آخر وفد کے ساتھ مسجد میں حاضری دینے میں کیا حرج ہے آپ جانے پر رضامند کیوں نہیں ہوتے؟''

عفت بولیں ''کل جو آپ نے ناسازی طبع کی بات کی تھی وہ تو محض بہانہ تھا۔ آج بھی آپ سفر کی کوفت کا بہانہ لے بیٹھے ہیں۔''

ہم دونوں کا جارحانہ رویہ دیکھ کر قدرت کے چہرے پر مجبوری اور بے بسی کی گھٹائیں امڈ آئیں۔ ''نہیں'' وہ بڑی منت سے بولے ''میں ان حالات میں حاضری نہیں دے سکتا۔''

''کن حالات میں؟'' ڈاکٹر عفت نے پوچھا۔

''ان حالات میں''۔ انہوں نے ملتجیانہ انداز سے کہا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' عفت نے پوچھا۔

"میں مسجد نبویؐ میں ایک عام فرد کی حیثیت سے حاضری دے سکتا ہوں، خصوصی فرد کی حیثیت سے نہیں۔" انہوں نے اٹک اٹک کر کہا اور کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس وقت ان کا بند بند آبدیدہ تھا۔

"آپ خود نہیں جاتے تو ہم پر بندش کیوں ڈال رہے ہیں آپ؟" عفت بولیں۔

نال میرے کوئی چلے:

قدرت تڑپ کر مڑے "نہیں نہیں" بولے "میں آپ پر بندش ڈالنے والا کون ہوں، آپ شوق سے جائیں۔ مفتی صاحب! آپ بھی ساتھ جائیں، ضرور جائیں"۔ یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں داخل ہو گئے۔

"ہاں، میں ضرور جاؤں گا، ضرور جاؤں گا۔ میں حجرہ مبارک میں سجدہ کروں گا۔ میں مقدس جالی کو تھام کر کھڑا رہوں گا۔ میں اس مقام کو بوسہ دوں گا جہاں حضورؐ پاک کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا کرتے تھے۔ میں اس دہلیز کو آنکھوں سے لگاؤں گا جس پر پاؤں رکھ کر حضورؐ داخل ہوا کرتے تھے"۔

ڈاکٹر عفت کی اس دعوت پر میرے جسم کا بند بند ناچنے لگا، والہانہ خوشی سے ناچنے لگا۔ انہوں نے میری کیفیت کو دیکھا اور مطمئن ہو کر چلی گئیں۔ فرط انبساط میں میں اپنے بستر پر لیٹ گیا اور مسجد نبوی کے کھلنے کے وقت کا انتظار کرنے لگا۔

پھر کسی نے چپکے سے میرے کان میں کچھ کہا۔ میں چونک پڑا۔ اٹھ بیٹھا۔ لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ میں پھر لیٹ گیا۔ چند ساعت کے بعد پھر وہی آواز آئی۔

"نال مرے کوئی چلے"۔

"ارے!" میں پھر چونکا۔ پھر شاہ حسین کا وہ شعر میری آنکھوں کے سامنے گویا رقص کرنے لگا۔

میں وی جانا ڈھوک رانجھن دی　　　نال مرے کوئی چلے!

وہی آواز جو میں حج کے دوران کئی بار سن چکا تھا۔ جب مکہ شریف میں قدرت کی طبیعت خراب ہوگئی تھی تو بارہا میرے دل میں آیا تھا کہ میں اکیلا حرم شریف میں حاضری دے آؤں لیکن مجھ میں ہمت نہ پڑی تھی۔ مجھے وہاں کون جانتا ہے؟ اتنی عظیم بارگاہ میں داخل ہو جاؤں؟ نہ نہ میری کوئی حیثیت بھی ہو۔ اس وقت شاہ حسین نے میری رہنمائی کی تھی۔

نال مرے کوئی چلے

پھر جب ہم مدینہ شریف میں پہنچے تھے، قدرت نے کہا تھا "آپ مسجد نبویؐ ہو آئیں۔ میں اس حالت میں نہیں ہوں کہ حاضری دے سکوں" اور میں خوشی خوشی مسجد تک پہنچا تھا لیکن اندر داخل ہونے کی ہمت نہ پڑی تھی۔ اور میں مسجد کے گرد طواف کرتا رہا تھا۔

پھر اسی روز جب قدرت جدہ گئے ہوئے تھے تو مجھ میں اتنی ہمت نہ پڑی تھی کہ از خود اکیلا مسجد نبویؐ کے عمومی حصے میں داخل ہوتا۔ میرے جسم اور روح کا بند بند شاہ حسین کے اس مصرعے کا ورد کرتا رہا تھا۔

میں انہی سوچوں میں پڑا تھا کہ ڈاکٹر عفت تیار ہو کر آ گئیں۔ بولیں "چلئے مفتی صاحب! مسجد نبویؐ کے خصوصی طور پر کھلنے کا وقت ہو گیا۔"

پتہ نہیں اس وقت مجھے کیا ہوا، مجھ پر رقت طاری ہوگئی اور انجانے میں میں رونے لگا۔

نال مرے کوئی چلے

اس پر عفت قہقہہ مار کر ہنس پڑیں، پھر بولیں "تم دونوں ہی سر پھرے ہو" اور اکیلی مسجد کی طرف چل پڑیں۔

رات کو جب وہ مسجد سے واپس آئیں۔ تو میں بڑے اشتیاق سے ان کے پاس جا بیٹھا۔

"کہیے کیسا رہا؟" میں نے پوچھا۔

بولیں "سبحان اللہ! طبیعت خوش ہوگئی۔ جہاں جی چاہا کھڑے ہو کر نفل پڑھے جہاں دل چاہا بیٹھ کر تلاوت کی۔ سبحان اللہ! کیا شان ہے مسجد پاک کی"۔

"وفد بھی وہیں تھا کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں"۔ بولیں۔

"انہوں نے بھی نوافل ادا کیے؟"

ڈاکٹر ہنس پڑیں۔ کہنے لگیں "وہ تو بات بات پر بحث کرتے رہے، بات بات پر جھگڑتے رہے"۔

"کس بات پر؟" میں نے پوچھا۔

"ایک نے کہا "آئیے با جماعت نفل ادا کریں"، دوسرا بولا "میں امامت کروں گا" تیسرا بولا "نہیں میں امامت کروں گا"۔ ایک نے کہا، "میں تیرے پیچھے نماز نہیں پڑھوں گا"۔ دوسرے نے کہا "تجھے امامت کرنے کا کوئی حق نہیں اس لیے کہ تیرا عقیدہ فاسخ ہے۔ اس پر ان کی چیخ چیخ ہونے لگی اور میں ایک طرف ہو کر عبادت میں مصروف ہوگئی"۔

قدرت کی واپسی:

اسی رات قدرت بولے "کل عفت اور میں واپس پاکستان جا رہے ہیں۔ آج ہم جدہ اس غرض سے گئے تھے کہ واپسی کے لیے سیٹوں کا انتظام کر لیں۔ اتفاقاً دو سیٹیں مل گئی ہیں سعودی حکومت کی مدد سے۔ کل ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے، رات جدہ میں قیام کریں گے۔ پرسوں صبح پاکستان کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔

انشاء اللہ۔"

"اور میں؟" میں نے پوچھا۔

"آپ یہاں قیام کریں۔ چار ایک دن کے بعد جب یہاں سے دوسرے مہمان رخصت ہوں گے تو آپ ان کے ہمراہ جدہ پہنچ جایئے، میں نے رابطہ افسر غنی صاحب کو کہہ دیا ہے، وہ آپ کی ضروریات کا خیال رکھیں گے۔ واپسی پر سیٹ ملنی بہت مشکل ہوتی ہے۔ کوشش کیجئے کہ جلدی مل جائے۔ یہ سب لوگ آپ کی مدد کریں گے۔ ہاں ایک تکلیف کیجئے کہ آتے ہوئے ایک محترمہ کو اپنے ساتھ لیتے آیئے"۔

"کون محترمہ؟" میں نے پوچھا۔

"ڈاکٹر عفت کی ایک دوست ہیں۔ پڑھی لکھی عمر رسیدہ خاتون ہیں"۔

"وہ مجھے کہاں ملیں گی؟"

"وہ جدہ میں مقیم پاکستانی سفیر کے گھر ٹھہری ہوئی ہیں۔ جدہ پہنچ کر آپ سفیر صاحب سے مل کر تفصیلات طے کرلیں"۔

اگلے روز سارا دن قدرت اور میں مسجد نبویؐ میں داخل نہ ہوئے۔ ہم نے تمام نمازیں مسجد نبویؐ کے مقابل کے میدان میں ادا کیں۔

مسجد میں نماز کے وقت اتنی بھیڑ ہو جاتیہ ے کہ نمازیوں کے لیے جگہ نہیں رہتی اس لیے وہ مسجد سے باہر ملحقہ میدان میں مصلے بچھا کر قطاریں بنا لیتے ہیں اور وہیں باجماعت نماز ادا کرتے ہیں۔

ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد جب ہم گھر کی طرف روانہ ہوئے تو بھیڑ سے نکل کر ایک آدمی نے مجھے سلام کیا۔ وہ درمیانی عمر کا تھا۔ میلے لباس پر جا بجا پیوند لگے ہوئے تھے۔ چہرے سے عسرت ٹپک رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ اسے کچھ دوں، کیونکہ

میرا خیال تھا کہ وہ بھکاری ہے۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

قدرت نے میرا بازو پکڑ لیا۔ کہنے لگے "جلد بازی نہ کیجئے"۔

"کچھ دینے میں حرج کیا ہے؟" میں نے کہا۔

قدرت مسکرا دیئے۔ بولے "آپ اسے بھکاری سمجھتے ہیں کیا؟"

"تو اور کون ہو سکتا ہے بھلا؟" میں نے پوچھا۔

"آپ مدینہ منورہ سے واقف نہیں"۔

"کیا مطلب؟"

درویشوں کا شہر:

"یہ بھکاریوں کا شہر نہیں، درویشوں کا شہر ہے۔ ممکن ہے یہ شخص جسے آپ بھکاری سمجھ رہے ہیں، درویش ہو، ایسا درویش جو آپ کو ہفت اقلیم کی بادشاہت بخش سکتا ہو"۔

اس وقت مجھے خیال آیا کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں میں نے کوئی بھکاری نہیں دیکھا تھا۔

"یہاں بھکاری نہیں ہوتے کیا؟ میں نے پوچھا"

"نہیں"۔ وہ بولے۔

"حاجت مند نہیں ہوتے؟"

"ہوتے ہیں"۔ وہ بولے "فرق صرف یہ ہے کہ ہمارے ہاں حاجت مند غنی کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ یہاں غنی حاجت مند کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ ہمارے ہاں حاجت مند ہاتھ پھیلاتے ہیں، یہاں دینے والے حاجت مند کی منت سماجت کرتے ہیں کہ میری پیشکش قبول فرما کر مجھ پہ احسان کریں"۔

وہ درویش جسے میں بھکاری سمجھا تھا، میرے قریب آ گیا۔ اس نے میرے کندھے پر اپنا ہاتھ دکھ دیا اور بڑے پیار سے تھپکنے لگا۔ اس کی مسکراہٹ میں "بخشم سمرقند و بخارارا" کی واضح جھلک تھی۔

"یہاں بڑے بڑے اولیا، قطب اپنے میں اتنی ہمت نہیں پاتے کہ وہ سر اٹھا کر دیکھیں"۔

قدرت مسکرانے لگے "وہ درویش سچ کہتے تھے۔ مدینہ منورہ کو آج تک کسی نے نہیں سمجھا، کسی نے نہیں جانا۔ یہاں جو بھی آتا ہے اس کی توجہ حضورؐ کی طرف لگی ہوتی ہے۔ سب کی نگاہیں حضورؐ کی اٹھی ہوتی ہیں، سب کے دل حضورؐ کے لیے دھڑکتے ہیں۔ سب دلوں کا فوکس حضورؐ ہیں سب کے دل حضورؐ پر مرکوز ہیں۔ صرف حضورؐ فوکس میں ہیں، باقی سب کچھ دھندلا ہے، آؤٹ آف فوکس۔ حضورؐ ایک عظیم مینار ہیں۔ اور یہ شہر اس مینار کا سیاہ ہے"۔

مانگنا اور قبول کرنا:

صرف یہ ایک شہر ہے جہاں سچا "دینا" عملی طور پر رائج ہے۔ دوسرے شہروں میں حاجت مند مانگتے ہیں، انہیں مل بھی جائے تو دینے کا فعل عمل میں نہیں آتا۔ یہاں دینے کے متوالے ڈھونڈ ڈھونڈ کر دیتے ہیں، منتیں کر کے دیتے ہیں کہ قبول کرو تو کرم ہوگا۔

"اس شہر میں کوئی گنہگار نہیں۔ معصیت کا احساس اس شہر میں خوش قسمتی کا نشان ہے، کیونکہ معصیت نہ ہو تو رحمت کیسے جوش میں آئے؟"

اس روز قدرت بڑی ترنگ میں تھے۔ وہ بولے جا رہے تھے، غیر از معمول بولے جا رہے تھے۔

قدرت بہت کم گو شخص ہیں۔ ان کا یوں بولے جانا میرے لیے حیرت کا

باعث تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے آپ میں نہ ہوں یا جیسے انہوں نے پی رکھی ہو۔

وہ بولے جا رہے تھے۔ وہ مدینہ منورہ کی خصوصی عظمت کے احساس سے بھرے ہوئے تھے۔ رطب اللسان تھے۔

وہ بولے جا رہے تھے اور مدینہ منورہ میری نگاہ میں سمٹتا جا رہا تھا۔ سمٹتا جا رہا تھا اور عظیم مینار ابھرتا آ رہا تھا، ابھرتا آ رہا تھا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ عظیم مینار ساری کائنات کا احاطہ کر لے گا اور اس مینار کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا۔

اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔

مسجد نبویؐ سے عصر کی اذان گونجی۔

واپسی

اگلے دن قدرت اور ڈاکٹر عفت کالی موٹر میں بیٹھ کر رخصت ہونے لگے تو میرا دل بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے جب قدرت نے پہلی بار مجھ سے کہا تھا کہ وہ واپس پاکستان جا رہے ہیں اور مجھے مدینہ منورہ میں چار ایک دن اکیلا رہنا ہوگا اور پھر سعودی حکومت کے دیگر مہمان زائروں کے ساتھ جدہ جانا ہوگا تو میں گھبرانے کی بجائے الٹا خوش ہوا تھا کہ مجھے حضورؐ اعلیٰ کے قدموں میں رہنے کے لیے کچھ دن اور مل جائیں گے۔

اکیلا:

لیکن قدرت کے رخصت ہو جانے کے بعد دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔

لیکن اکیلا رہنے کی تو میری عادت ہے۔ اگر دن میں میں چند ایک گھنٹے اکیلے نہ گزاروں تو مجھے وحشت سی ہونے لگتی ہے، گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ زندگی بھر میں اکیلا رہا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے ساتھی میسر نہیں آئے، اس لیے نہیں کہ منفرد خیالات کا حامل ہوا اور لوگ مجھے سمجھ نہیں پاتے، بلکہ اس لیے اکیلا پن میرے لیے یوں ہے جیسے بچے کے لیے چوسنے والی مٹھائی کی ٹکیہ ہوتی ہے۔ مجھے اکیلے پن میں ایسا اطمینان حاصل ہوتا ہے جو محفل میں حاصل نہیں ہوتا۔ چاہے وہ محفل ان ساتھیوں کی ہی کیوں نہ ہو جن کے دم کرم سے میری زندگی پر بہار ہے۔

پھر مدینہ منورہ میں تنہائی کو تو ایک عظیم نعمت ہونا چاہیے تھا۔

کوئی جاننے والا نہ ہو، کوئی پوچھنے والا نہ ہو، کوئی انتظار کرنے والا نہ ہو۔ مسجد نبویؐ میں بھیڑ کے باوجود ایک فرد واحد بیٹھا ہو، سامنے سبز گنبد ہو، نیچے جالی کے پیچھے

حضورؐ خود جلوہ افروز ہوں، اس سے بڑھ کر کون سی جنت ہو سکتی ہے بھلا۔

پھر مجھے یہ احساس کیوں ہوا کہ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ اس قوت کے انخلاء کے بعد جس کے قرب سے ان جانے میں میں مقناطیس بنا ہوا تھا، میں پھر سے زنگ آلود پتھر میں بدل گیا تھا۔

دراصل جب سے قدرت نے کہا تھا کہ میں حجرۂ مبارک میں نہیں جاؤں گا، جب سے قدرت نے سبز جنگلے پر حاضری دینی چھوڑی دی تھی، میں نے محسوس کیا تھا کہ انہیں رخصت کر دیا گیا ہے اور میرا اسلام منظور کر لیا گیا ہے۔ تب سے ہمارا کوئی مرکز نہ رہا تھا۔

طلب اور منزل:

منزل کو پالینا کتنی بڑی قیامت ہے۔ سب کچھ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ خود منزل بھی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے طلب سے عظیم تر کوئی منزل نہیں۔ طلب اور جدوجہد شاید بشریت کا تقاضا ہو۔

جتنی دیر ہماری توجہ باب جبرئیل پر مرکوز رہی، جتنی دیر ہمیں حجرہ مبارک میں حاضری دینے کی لگن رہی، جتنی دیر سبز جنگلے کے قریب کھڑے ہو کر حضورؐ کو سلام کرنے کا جنون قائم رہا، مدینے کا شہر تو کیا ساری کائنات سبز گنبد کی اوٹ میں دبکی بیٹھی رہی۔

پھر جب قدرت کو رخصت کر دیا گیا تو ان کے لیے حجرہ مبارک میں جانا نامناسب ہو گیا۔ جب سے مجھے احساس ہوا کہ میرا اسلام قبول کر لیا گیا ہے تو میرے لیے حاضری بے معنی ہو کر رہ گئی کیونکہ میری حاضری کا مقصد صرف ایک تھا کہ میں حضورِ اعلیٰؐ کی خدمت میں سلام عرض کروں۔ دل کا سلام، روح کا سلام، سارے وجود کا سلام۔

کاش کہ حضور اعلیٰؐ قدر کو رخصت کی اجازت نہ دیتے۔ کاش کہ حضور اعلیٰؐ میرا سلام قبول نہ فرماتے اور ہم دونوں ہر صبح باب جبریل پر دروازہ کھلنے کا انتظار کرتے، حجرۂ مبارک میں دھکے کھاتے اور پھر سبز جنگلے کو پکڑ کر میں اپنے سارے وجود سے اس عظیم ترین انسان اور اللہ کے رسولؐ کی خدمت میں سلام عرض کرتا رہتا۔ یونہی ہفتے گزر جاتے، مہینے گزر جاتے، صدیاں گزر جاتیں۔

قدرت سچ کہتے ہیں۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ لوگوں کو اس کا شعور نہیں کہ اللہ سے کیا مانگیں۔ وہ بن سوچے سمجھے مانگتے ہیں۔ انہیں شعور نہیں کہ کس مقام کو اپنی منزل قرار دیں۔ ذہن میں کس چیز کو مقصد تصور کریں۔

میں خود بہت بڑا احمق ہوں۔ سرزمین حجاز کو روانہ ہونے سے پہلے اگرچہ میں قطارِ حج میں شمولیت کے لیے حاضری دینے آیا تھا لیکن میرے دل میں حج کی آرزو نہ تھی۔ میرے دل میں صرف ایک آرزو تھی، ایک مقصد تھا کہ خانۂ خدا میں پہنچ کر اپنے اللہ کے حضور سیس نواؤں، مدینہ منورہ میں سبز جنگلہ پکڑ کر حضور اعلیٰ کو سلام عرض کروں۔

اس سے عظیم تر مقصد کیا ہو سکتا ہے، میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا۔

خوشنودی:

میری دانست میں خوشنودی سے بڑی مانگ اور کوئی نہیں۔ اللہ کی خوشنودی، رسول اللہؐ کی خوشنودی۔ بزرگوں کی خوشنودی۔

اور میری سمجھ کے مطابق حصول خوشنودی کا واحد طریقہ عجز، احترام، خلوص اور محبت بھرا سلام ہے۔ اگر سلام قبول ہو جائے تو حصول خوشنودی مکمل ہو جاتی ہے۔

پتہ نہیں کیوں؟ میرے دل میں جنت کی آرزو کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ اگر اللہ

جنت دے دے تو نہیں لیکن اس کی آرزو کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ دوزخ کا ڈر میں شدت سے محسوس کرتا ہوں لیکن دوزخ سے بچنے کے لیے ثواب کمانے کی آرزو نہیں رکھتا۔ مجھے اس آرزو سے دکانداری کی بو آتی ہے۔ میرے ذہن میں نیکی، خواہش حصول ثواب سے بے تعلق چیز ہے، بے مقصد بے نیاز۔

مجھے یہ آرزو بھی نہیں کہ اللہ والا بن جاؤں یا بزرگی مل جائے یا مست ہو جاؤں۔ مجھے مراتب کی طلب نہیں۔ میری دانست میں عام انسان بذات خود ایک عظیم مرتبہ ہے۔ مجھے صرف ایک آرزو ہے کہ میرا رخ مثبت رہے۔ انسانوں کی طرف اللہ کی طرف۔

اسی لیے حاضری سے میرا مقصد صرف سلام عرض کرنا تھا، حصول خوشنودی تھا۔ اگر آپ کسی بادشاہ کو سلام کرنے کے لیے حاضری دیں، اور بادشاہ کہے جا ہم نے تیرا اسلام قبول کیا تو باقی کیا رہ گیا،، کچھ بھی نہیں۔ اب آپ کس منہ سے شاہ کے حضور استادہ رہیں گے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مزید حاضری کا کوئی بہانہ نہ رہا، جواز نہ رہا۔ لہذا مدینہ منورہ کا شہر جو پہلے سبز گنبد کی اوٹ میں دبکا بیٹھا تھا، باہر نکل کر میرے گردو پیش پھیل گیا۔ مدینہ منورہ خالی مدینہ رہ گیا۔ مسجد نبویؐ خالی مسجد رہ گئی اور نماز احساس حضوری کی جگہ ادائیگی کا فرض رہ گئی۔ تکمیل کا اعتبار کس قدر خوف ناک چیز ہے۔

وہ مدینہ منورہ جس کا نام سن کر میرا دل دھک سے رہ جاتا تھا اب میرے سامنے ایک عام شہر کی طرح تھا۔ ایک تجارتی شہر، بدیشی مال سے لدی ہوئی دکانیں، جھمل کرتی ہوئی اشیاء، نگاہ میں ہوس کے دیئے روشن کرنے والے کمیاب تحفے، خریداروں کا انبوہ، تاجروں کی کھجلی زدہ ہتھیلیاں۔

قدرت کے رخصت ہونے کے بعد پورا ایک تو میں ہوٹل کے پلنگ پر یوں

پڑا رہا جیسے پلاسٹک کے غبارے سے پھونک نکل جائے تو وہ چھیچھڑا بن جاتا ہے۔

چالیس نمازیں:

دن بھر سوچتا رہا کہاں جاؤں، کیا کروں۔ میرے وہ نئے ساتھی جن کے ساتھ میں نے مدینے سے جدہ جانا تھا میری طرح بستروں پر پڑے ہوئے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ بھی مدینہ منورہ سے رخصت ہو چکے تھے۔ انہیں بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جائیں؟ کیا کریں۔

وہ دونوں پڑھے لکھے دانشور تھے لہذا وہ حالات حاضرہ پر تبصرہ کرنے میں وقت گزارتے تھے۔ وہ مدینہ منورہ میں صرف اس لیے مقیم تھے کہ ابھی ان کی چالیس نمازیں پوری نہیں ہوئی تھیں۔

پتہ نہیں اس کا ماخذ کیا ہے لیکن زائرین میں یہ خیال عام ہے کہ مدینہ منورہ کے قیام میں چالیس نمازیں ادا کرنا ضروری ہے۔

میرے دونوں نئے ساتھی اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ کب ان کی چالیس نمازیں پوری ہوں اور وہ جدہ کو عازم سفر ہوں۔

وہ دونوں بیشتر وقت نمازوں کی گنتی میں صرف کرتے تھے۔ ایک کا خیال تھا کہ وہ مسجد نبویؐ میں تیس نمازیں ادا کر چکے ہیں۔ دوسرا کہتا تھا نہیں، ہم تو بتیس نمازیں ادا کر چکے ہیں۔ آپ میں روز بلاناغہ جھگڑا ہوتا، بحث ہوتی، پھر سے گنتی کی جاتی۔

ایک کہتا ہم پرسوں عصر کی نماز پڑھ کر رخصت ہو سکتے ہیں۔

دوسرا کہتا نہیں، عشاء پڑھنے کے بعد چالیس نمازیں ہوں گی۔

اجازت رخصت:

ان دونوں اصحاب کے ساتھ ایک معمر خاتون بھی تھی جو فجر سے پہلے مسجد نبویؐ میں جا بیٹھتی تھی اور عشاء پڑھنے کے بعد واپس آتی۔ اس خاتون نے کبھی نہ سوچا تھا کہ کتنی نمازیں پڑھنی باقی ہیں۔ نہ ہی اس نے اپنے ساتھیوں کی بحث میں کبھی حصہ لیا تھا۔

جب بھی وہ بحث چھیڑتے تو خاتون تسبیح اٹھا لیتی اور ذکر میں مصروف ہو جاتی۔ اسے چالیس نمازیں پوری کرنے کی فکر نہ تھی۔ اس کے برعکس اسے ایک اور ہی لگن لگی تھی جس میں وہ سرشار رہتی تھی۔ دو ایک بار اس نے ٹھنڈی آہ بھر کر اس کا اظہار بھی کیا تھا۔

''یہ حاضری بھی کوئی حاضری ہے۔ حاضری تو وہ ہوتی ہے جب حضورؐ کے قدموں میں آ کر بیٹھ جاؤ اور جب تک حضور خود رخصت کی اجازت نہ دیں بیٹھے ہی رہو۔ تین ماہ کے بعد اجازت ملے چاہے، ایک سال لگ جائے''۔

پھر محترمہ پر رقت طاری ہو جاتی اور اس کی تسبیح کے منکے بھیگ جاتے۔

معمر محترمہ کی باتیں سن کر میرے دل میں بیسیوں سوال ابھرتے: ''ہم دونوں زائر تھے۔ مدینہ منورہ کے ایک ہی ہوٹل میں مقیم تھے۔ ہمارے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی۔ اس کے باوجود ہم ایک دوسرے سے کس قدر دور تھے۔ وہ مدینہ منورہ میں مقیم تھی، میں مدینہ شہر میں آوارہ تھا۔ وہ مسجد نبویؐ میں وقت گزارتی تھی، میں بازار میں اشیا بینی کرتا تھا۔ وہ رخصت کے لیے اجازت کی طالب تھی۔ میں حاضری کے احساس ہی سے بیگانہ تھا۔ پھر رخصت کی اجازت کا سوال کیسے پیدا ہوتا؟ وہ از خود آئی تھی۔ میں لاٹھی کے سہارے پہنچا تھا۔ اور اب اس لاٹھی سے بھی محروم ہو چکا تھا''۔

پھر قدرت کے متعلق دل میں کئی سوال اٹھتے: ''کیا قدرت کو علم تھا کہ چالیس

نمازیں ادا کرنے سے پہلے مدینہ منورہ سے رخصت نہیں ہونا چاہیے۔ پھر وہ بیس نمازیں ادا کرنے کے بعد کیوں چلے گئے تھے۔ کیا انہیں رخصت ہونے کی اجازت مل گئی تھی؟ کیا مرد قدیم اجازت کے سلسلے میں تشریف لائے تھے؟"

اس روز لیٹے لیٹے، ہمراہیوں کی گنتی سنتے سنتے میرا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ اس حد تک ماؤف کہ میں محسوس کرنے لگا تھا کہ مرد قدیم کا واقعہ میرے ذہن کا تخیل ہے اور بس۔ شاید قدرت نے مجھے ہپناٹائز کر رکھا ہو، شاید قدرت کی حیثیت تماشہ گر کی ہو اور میرے تمام تر گذشتہ محسوسات کی حیثیت رکھتے ہوں۔

ریورس گیئر:

قدرت نے کہا تھا کہ حج کے اثرات واپسی پر مرتب ہوتے ہیں اور حج کے دوران یا بعد میں رجعت کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ کئی ایک بزرگ صرف اس ڈر کے مارے حج پر نہیں جاتے کہ رجعت کی زد میں نہ آ جائیں۔ کہیں مجھے بھی ریورس گیئر تو نہیں لگ گیا تھا۔

چارپائی پر لیٹے لیٹے سینکڑوں خیالات میرے ذہن میں آتے۔ پھر اندر سے آواز آتی کہ یہ شک وشبہات جو تمہیں دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ تمہیں ریورس گیئر لگ چکا ہے۔

پھر اور آواز آتی: اگر ریورس گیئر لگ گیا ہے تو پھر کیا ہوا۔ یہ احسان کیا کم ہے کہ مجھے حاضری دینے کا موقعہ عطا کیا گیا ہے۔ مجھے کالے کوٹھے کے گرد والہانہ چکر لگا کر اللہ کو منانے کی خوشی نصیب کی گئی۔ اس عظیم ترین انسان کے حضور اس دروازے سے حاضری دینے کا اعزاز حاصل ہوا جہاں سے حضرت جبرئیل تشریف لایا کرتے تھے۔

رجعت ہو گئی ہے تو کیا ہے۔ رجعت ماتھے پر لکھی ہوئی تو نہیں ہوتی۔

رجعت ہو بھی جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ اب میں حاجی ممتاز مفتی ہوں اور حاجی صرف وہی فرد نہیں ہوتا جس کا حج قبول ہو جائے۔ حاجی وہ ہوتا ہے جو مقدس مقامات سے گھوم پھر آئے۔ ان خیالات نے میری ہمت بندھائی۔

پھر دفعتاً مجھے خیال آیا کہ رجعت کا خوف بالکل بے معنی ہے۔ رجعت تو جب ہوتی ہے جب کوئی متحرک ہو، آگے کی جانب بڑھ رہا ہو۔ اگر کوئی پہلے ہی زمین میں کھمبے کی طرح گڑا ہو تو رجعت کیسی۔ رجعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تو خواہ مخواہ ڈر رہا ہوں۔

اس درویش نے کہا تھا جہاں سونا ہے وہیں چور ہے۔ میرے پاس سونا چھوٹ پیتل بھی نہیں۔ پھر چور کا خطرہ کیسا؟ راہزن کا ڈر کیوں؟

اشیاء کا ناچ:

اگلے روز یہ سوچ کر میں اٹھ بیٹھا اور مدینے کے شہر میں گھومنے پھرنے لگا۔ مدینے کی مارکیٹ کی دوکانوں نے مجھے دیکھا تو آپس میں خوشی بھری کھسر پھسر کرنے لگیں۔ پھر انہوں نے زیر لب تبسم سے ایک دوسری کے ہاتھ پکڑ لیے اور وہ میرے اردگرد دائرہ بنا کر راک اینڈ رول ناچنے لگیں۔ چیزیں شیلفوں سے باہر نکل آئیں اور مجھ سے گویا آنکھ مچولی کھیلنے لگیں اور میں بھول گیا کہ میں زائر ہوں۔ میں حاضری دینے کے لیے وہاں مقیم ہوں۔ میری آمد کا مقصد کیا ہے اور میری منزل کیا ہے۔

آہا کتنی اچھی ہے یہ کیتلی۔ اتنی ہلکی اتنی خوبصورت اتنی سستی۔ ارے یہ کپڑا! بالکل وہی کپڑا جسے پہننے کی آرزو میری بیوی عرصہ دراز سے دل میں رچائے بیٹھی ہے اور یہ رنگ رنگ کے منکے۔ میری بیٹی انہیں دیکھ کر کھل اٹھے گی۔ "تھینک یو ڈیڈی"۔ اور یہ...... یہ فرانس کے بنے ہوئے جا نماز ہیں ان میں سے اشفاق اور

بانو کو ٹرخا سکوں گا۔ بشیر کا کیا ہے وہ تو سادھو آدمی ہے۔ البتہ مودی۔ ہاں مودی کے لیے کچھ ہونا چاہیے۔

میرے قریبی عزیز اور دوست سب میرے اردگرد آ جمع ہوئے اور پھر ہم ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر بازوؤں کو جھلاتے ہوئے اس زرق برق بازار میں یوں گھومنے لگے جیسے جاٹ مویشی میلے میں گھومتے ہیں۔

لذت خریداری:

قدرت کے جانے کے بعد میں دو دن مدینے میں مقیم رہا۔ سارا دن بازاروں میں دیوانہ وار گھومتا، چیزوں کی قیمتیں پوچھتا، پھر ہوٹل کی طرف بھاگتا۔ "بوائے ایک ہاف سیٹ چائے" اور پھر ڈائیننگ روم کی میز پر بیٹھ کر اپنی نقدی گنتا۔ ممکن ضروری اخراجات کو جوڑتا۔ کتنے پیسے بچیں گے جو میں خرچ کر سکتا ہوں۔ پھر چیزوں کی قیمتیں جوڑتا۔ پھر دفعتاً خیال آتا، کہیں جدے پہنچ کر کوئی ہنگامی خرچ نہ پڑ جائے۔ کوئی ٹیکس، کوئی فیس، کوئی ٹول۔ پھر ایک اضطراب مجھے چاروں طرف سے آ گھیرتا۔ اگر رقم کم ہو گئی تو...... تو میں کس سے مانگوں گا؟

لیکن اگر کوئی ہنگامی خرچ نہ پڑا اور رقم بچ گئی تو...... تو وہ ضائع ہو جائے گی۔ شاید ایسا کپڑا، ایسی کیتلی، ایسی قمیض جدے میں نہ ملے۔

پھر میں ازسرنو بازار کی طرف بھاگتا اور چیزوں کے انباروں کی طرف حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھتا۔ شاید کوئی اور کپڑا مل جائے۔ ایسا ہی مگر سستا۔ شاید کیتلی کی جگہ کوئی اور چیز مل جائے۔ دیوانہ وار بازار میں گھومتا اور نئی چیزوں کی قیمتیں پوچھتا۔ پھر وہی ہوٹل بوائے، ہاف سیٹ چائے۔ پھر سے نقدی گنتا، چیزوں کی قیمتیں جوڑتا۔ ٹھہرو۔ لیکن اگر...... اور پھر بازار کی طرف اٹھ دوڑتا۔

بازار میں بھاؤ پوچھنے اور قیمتیں جوڑنے کے دوران میں مسجد نبویؐ میں سے

اذان گونجتی۔ ایک ساعت کے لیے میں چونک اٹھتا جیسے مجرم جرم کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو اور کچہری کا پیادہ حاضری کے سمن پکار رہا ہو۔

نماز:

بازار سے میں مسجد نبویؐ کی بیرونی گراونڈ میں پہنچ کر جائے نماز بچھاتا اور پھر اللہ اکبر کہہ کر وہیں نماز داغ دیتا۔

یہ میری پرانی عادت ہے۔ نماز کے دوران میرے ذہن میں دور کی باتیں سوچنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بھولے ہوئے نام یاد آ جاتے ہیں، بھولی بسری چیزیں یاد آ جاتی ہیں۔ بڑے بڑے نکتے ذہن میں آتے ہیں، بڑی بڑی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔

لیکن وہاں تو صرف ایک مسئلہ درپیش تھا...... کم نقدی سے زیادہ سے زیادہ چیزیں خریدنا اور اس مسئلے کو حل کرنے کا موزوں ترین وقت نماز تھا۔

نماز کے دوران میں از سر نو حساب جوڑنا شروع کر دیتا۔ اگر دکاندار پلاسٹک سیٹ کی قیمت میں سے پانچ ریال کم کر دے اور اللہ اکبر۔ پھر میں دوسری چیزیں بھی خرید سکوں گا۔ پلاسٹک کا سیٹ میں اپنی محبوبہ کو تحفہ دوں گا۔ اللہ اکبر۔ یہاں کے واقف کار کہتے ہیں۔ یہ دکاندار بیس مانگتے ہیں اور سات پر سودا طے ہو جاتا ہے۔ سمع اللہ لمن حمدہ۔

نماز کا جھٹکا کرنے کے بعد میں پھر بازار میں جا پہنچا۔ اور پھر وہی بھاؤ پوچھنا ،نقدی گننا اور حساب جوڑنا۔

ارے! دوکان پر بیٹھے ہوئے ایک پاکستانی حاجی کو علانیہ حساب جوڑتے ہوئے دیکھ کر دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ میں اکیلا نہ تھا۔ اس شغل میں دوسرے لوگ بھی میرے ساتھی تھے۔

دراصل میری نگاہ حرص سے اس قدر چپ چاپ کررہی تھی کہ میری توجہ صرف چیزوں پر محدود تھی۔ میں نے لوگوں کی طرف غور سے دیکھا ہی نہ تھا۔ الٹا میں تو لوگوں سے ڈر رہا تھا کہ کہیں ان کو علم نہ ہو جائے کہ مسجد نبویؐ سے ملحقہ بازار میں ایک زائر ایسا بھی ہے جو یہ بھول چکا ہے کہ وہ مدینہ منورہ میں مقیم ہے، کہ وہ مسجد نبویؐ سے اس قدر قریب ہونے کے باوجود اس قدر دور رہے کہ اس کا مطمح نظر چیزوں کی خرید و فروخت ہے۔ میں وہاں سبز گنبد کے سائے میں چھپ کر جرم کررہا تھا اور ڈرتا تھا کہ کہیں لوگوں کو علم نہ ہو جائے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔

لیکن پاکستانی حاجی کو سرِ عام اپنی نقدی کو جوڑتے اور مطلوبہ اشیاء کی قیمتیں جمع کرتے ہوئے دیکھ کر میرے دل سے بوجھ اٹھ گیا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو بازار میں سبھی لوگ اس شغل میں مصروف ہیں۔

میرے دونوں نئے ساتھی جو صرف نمازیں پوری کرنے کی خاطر مدینے میں رکے ہوئے تھے، عرصہ دراز سے خرید و فروخت سے فارغ ہو چکے تھے۔

مدینہ منورہ میں پہنچتے ہی انہوں نے اس فریضے کو سرانجام دینے کا کام شروع کر دیا تھا۔ اب ان کے پاس مزید نقدی نہ تھی۔ اس لیے وہ حریصانہ نگاہوں سے بازار میں گھوما پھرا کرتے تھے۔

آوارگی:

جب بھی وہ مجھے بازار میں مل جاتے تو مجھے دیکھ کر ان کی باچھیں کھل جاتیں۔ "نہ نہ، یہ ٹی سیٹ نہ خریدنا" وہ چلاتے "یہ تو بڑا مہنگا ہے۔ اس نکڑ والی دکان پر ایک سستا سیٹ بک رہا ہے اور ڈیزائن میں وہ اس سے زیادہ خوبصورت ہے۔ یہ تو ایران کا بنا ہوا ہے اور وہ...... وہ تو خالص پیرس کا ہے۔ چلو ہم تمہیں ساتھ لے چلتے ہیں"۔

پھر وہ مجھے ساتھ ساتھ لیے پھرتے، نئی نئی چیزیں دکھاتے۔ میرے لیے دکانداروں سے جھگڑتے، بھاؤ کم کراتے۔ اپنی نگرانی میں پیکنگ کراتے۔

جب میری شاپنگ ختم ہو جاتی تو ہم تینوں دوسرے خریداروں کو مشورے دیتے۔ انہیں ساتھ ساتھ لیے پھرتے، چیزیں دکھاتے، ان کی بناوٹ پر بحث کرتے اور آخر کار دکاندار سے بھاؤ پر جھگڑا کرتے۔

چیزیں خریدنے میں کتنی لذت ہوتی ہے، چاہے وہ پرائی ہو۔

دو روز کے بعد ہم مدینہ منورہ سے رخصت ہو رہے تھے۔ معمر محترمہ کی آنکھوں سے خوشی کے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی کیونکہ اسے رخصت کی اجازت مل گئی تھی۔ میرے دونوں ساتھی خوش تھے کہ انہوں نے چالیس نمازیں پوری کر لیں تھیں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خوشی کے آنسو بہاؤں یا غم کے۔ نہ تو میں نے چالیس نمازیں پوری کی تھیں، نہ ہی مجھے اجازت ملی تھی۔

سفارت پاکستان

اگلے روز ہم مدینہ منورہ سے رخصت ہو رہے تھے۔

وداع:

یہ وداع مکہ معظمہ سے کتنا مختلف تھا۔ مکہ معظمہ سے تمام زائرین ایک ہی دن وداع ہوتے ہیں اس لیے اس کی حیثیت وداع انبوہ کی ہوتی ہے۔ مدینہ منورہ میں زائرین کے ٹولے آتے رہتے ہیں، جاتے رہتے ہیں اس لیے مکہ معظمہ سا عظیم الشان وداع کا منظر پیدا نہیں ہوتا۔

جہاں تک اللہ والوں کا تعلق ہے ان کے وداع میں خوشی کا عنصر ہوتا ہے کیونکہ وہ اجازت کے بغیر رخصت نہیں ہوتے اور اجازت کا مل جانا خوشنودی کا پیغام ہوتا ہے۔

ہمارا قافلہ صرف افراد پر مشتمل تھا۔ وہ سبھی خوش تھے اور چاہتے تھے کہ پر لگ جائیں اور اڑ کر وطن پہنچ جائیں۔

سفارش خروج:

جدہ کے سفر کے دوران میرے ہمراہی زیادہ تر سیٹ کی بکنگ کی باتیں کرتے رہے۔ انہیں فکر دامن گیر تھی کہ شاید جلد سیٹ نہ ملے۔ انہیں اس مقدس سرزمین پر زیادہ دیر رکنا نہ پڑے۔ ان کی خواہش تھی کہ جدہ پہنچتے ہی بکنگ ہو جائے۔ اگر نہ ہوئی؟ تو کس کی سفارش کام آسکتی ہے؟

''کیا واپسی کی سیٹ سفارش سے ملتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''سفارش سے بھی مل جائے تو اسے خوش قسمتی سمجھئے۔ لوگ مہینوں پڑے رہتے ہیں، کوئی پوچھتا نہیں''۔ ایک نے جواب دیا۔

دوسرا ہمراہی بولا "آپ کے پاس کوئی سفارش ہے کیا؟"

"نہیں تو" میں نے جواب دیا "مجھے یہاں کون جانتا ہے"۔

دفعتاً پہلا ہمراہی چلایا "آپ کی بات بن جائے گی"۔

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ نے اپنے ساتھ ایک خاتون کو لے جانا ہے نا۔" اس نے جواب دیا۔

"ہاں ہاں مجھے یاد آیا۔ قدرت اللہ جاتے ہوئے تاکید کر گئے تھے کہ خاتون کو ہمراہ لائیے"۔ دوسرا بولا "میرے سامنے انہوں نے کہا تھا"۔

"کون خاتون؟" خاتون کی بات میں بالکل بھول چکا تھا۔

"وہ خاتون جو پاکستان کے سفیر کے گھر ٹھہری ہوئی ہیں"۔ پہلے ہمراہی نے جواب دیا۔

"ہاں ہاں مجھے یاد آ گیا۔ قدرت نے کہا تھا، اس خاتون کو ساتھ لے کر آنا۔ لیکن اسے سفارش سے کیا تعلق ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ دونوں قہقہہ مار کر ہنسے، بولے "وہ خاتون جو سفیر کی مہمان ہے خود آپ کی سفارش بن جائے گی"۔

بھگوڑا:

جدہ میں رابطہ افسر غنی نے مجھے جدہ پیلس میں ٹھہرا دیا اور خود رخصت ہو گیا۔ دو ایک گھنٹے تن تنہا اس چھوٹے سے "کیوبیکل" میں پڑا رہا۔ پھر دفعتاً مجھے خیال آیا کہ اگر ہوٹل کے منیجر نے مجھ سے پوچھا کہ تم کون ہو تو میں اسے کیا جواب دوں گا۔ میں حکومت سعودیہ کا مہمان تو نہیں تھا۔ وہ مہمان جس سے میں منسلک تھا رخصت ہو چکا تھا۔ فہرست میں میرا نام تو نہیں تھا۔ اگر منیجر نے آ کر کہا کہ تو مہمان نہیں، بہروپیا ہے تو میں کیا جواب دوں گا۔ اگر انہوں نے بل مانگا تو میں کہاں سے ادا کروں گا۔

لیٹے لیٹے میں گھبرا گیا۔

علاوہ ازیں وہ کمرہ بہت نیچا تھا کیونکہ سارا ہوٹل ائیر کنڈیشن تھا۔

ائیر کنڈیشننگ کی وجہ سے میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ پھر میرے دل میں بسے ہوئے اندرونی ڈر اور خوف نے کمرے کو اور بھی تنگ کر دیا تھا۔ اس گھٹن کی وجہ سے میرا وہاں رات بسر کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔

ویسے بھی میری شدید خواہش تھی کہ آٹھ دس دن ایک عام زائر کی طرح بسر کروں۔ میں نے اس کا اظہار رابطہ افسر سے بھی کیا تھا لیکن رابطہ افسر مہمانداری کے فرائض کی تکمیل کے خیال سے مصر تھا کہ میں آرام و آسائش سے جدہ پیلس میں قیام کروں۔ مہمانداری کے جذبے کی شدت کی وجہ سے اس نے اس قدر اصرار کیا تھا اور اس کے اصرار میں اتنا خلوص تھا کہ میں انکار نہ کر سکا تھا۔

رابطہ افسر کے رخصت ہونے کے بعد جدہ پیلس کی دیواریں مجھ پر تنگ ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ ائیر کنڈیشنر کے شور نے میرا گلا دبانا شروع کر دیا۔ ہوٹل کی ادائیگی کے ڈر سے میرا دل بیٹھنے لگا۔ ماحول کی گھٹن نے مجھے زچ کر دیا، حتیٰ کہ میں مجبور ہو گیا۔

آدھی رات کے وقت میں نے اپنا بستر سر پر اٹھایا، ہاتھ میں سوٹ کیس پکڑا اور چوروں کی طرح ڈرتا ڈرتا کاریڈار میں داخل ہو گیا۔ خوش قسمتی سے اس وقت تمام بیرے ڈائننگ ہال میں مصروف تھے اس لیے کسی نے مجھے روکا نہیں۔

ہوٹل سے باہر نکل کر جب میں ایک راہ گیر سے مسافر خانے کا راستہ پوچھا تو اس کا جواب سن کر دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک غیر ملک میں ہوں۔

ساری رات میں نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا گھومتا رہا اور پھر رات کے پچھلے پہر نہ جانے کیسے خود بخود مسافر خانے پہنچ گیا۔

مسافر خانہ چار سہ منزلہ بیرک نما عمارتوں پر مشتمل تھا جن میں نہ جانے کتنے وسیع وعریض کمرے تھے۔ رات کے اندھیرے میں میں ایک کشادہ کمرے میں زمین پر بستر بچھا کر پڑ رہا۔

میرا خیال تھا کہ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ میں اپنی بکنگ کرا لوں۔ اور بکنگ کرانا کیا مشکل بات ہے۔ بس سفیر صاحب کے گھر سے رابطہ پیدا کرنا ہو گا اور محترمہ سے کہنا کہ سفیر صاحب سے کہہ کر سیٹ ریزو کرا لیں۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

یہ صرف ایک دن کا کام ہے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد آرام سے مسافر خانے کے زائرین کا جائزہ لوں گا۔ اسی لیے اگلے روز صبح سویرے اٹھتے ہی میں پاکستانی سفارت خانے میں جا پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ سفارت کا عملہ یہ جان کر کہ مجھے سفیر صاحب کو ذاتی پیغام دینا ہے کہ میں آ گیا ہوں، اور محترمہ سے کہہ دیجئے کہ بکنگ کا انتظام کر لیں تا کہ ہم پاکستان پہنچ سکیں، مجھے فوراً سفیر صاحب سے ملوا دیں گے اور پھر ان کی سفارش سے بکنگ ہو جائے گی اور ہم دو ایک دن کے اندر اندر کراچی پہنچ جائیں گے۔

جناب عالی۔ اے جناب عالی:

پاکستانی سفارت میں پہنچ کر میں نے بڑی شان سے بلڈنگ کا جائزہ لیا۔ بلڈنگ کے بیرونی احاطہ نما صحن میں پچاس ساٹھ پاکستانی کھڑے تھے۔ وہ بڑی حسرت سے سفارت کی بلڈنگ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دفتر کی عمارت کے سامنے دو تین چپڑاسی سٹولوں پر بیٹھے تھے تا کہ کوئی سائل دفتر میں داخل نہ ہو سکے۔ میں نے سائلوں پر سرسری نگاہ ڈالی اور پھر سیدھا دفتر کی طرف ایک امتیازی شان سے بڑھا۔

میں سائل تو نہیں ہوں۔ میں کوئی عرضی لے کر تو نہیں آیا، مجھے کوئی سرکاری

کام نہیں۔ مجھے یہ لوگ کیوں روکنے لگے۔ جونہی میں چپڑاسیوں کے قریب پہنچا تو وہ سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں سمجھا کہ وہ میری تعظیم کے لیے کھڑے ہوئے ہیں لیکن جب وہ میرے رستے میں دیوار بن کر کھڑے ہو گئے تو میں گھبرا گیا۔

"دیکھیئے مجھے سفیر صاحب سے ملنا ہے"۔ میں نے تحکمانہ انداز سے کہا "ادھر جا کر بیٹھ جایئے" ایک احاطہ نما صحن کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "ابھی چھوٹے صاحب آ کر بات کریں گے۔" میں نے اپنی آمد کے متعلق مزید تفصیلات بیان کرنے کی کوشش کرنا چاہی۔ لیکن ان کارکنوں کے تیور دیکھ کر ہمت نہ پڑی۔

دو ایک گھنٹے میں بیرونی احاطے میں چھوٹے صاحب کا انتظار کرتا رہا۔ کوئی نہ آیا تو میں نے پھر کسی سے بات کرنے کا ارادہ کیا۔ ان چپڑاسیوں سے بات کرنا بے کار تھا۔ یہ ان پڑھ لوگ بھلا بات کو کیا سمجھیں گے۔ ہاں اگر دفتر کا کوئی آدمی ہو تو ۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ دفتر سے ایک بابو نکل کر باہر آ رہا ہے۔ میں نے دوڑ کر اسے جا لیا۔ "جناب والا! مجھے سفیر صاحب سے ملنا ہے"۔

بابو نے رک کر بڑے غور سے میرا جائزہ لیا اور پھر مسکرا کر آگے چل پڑا۔

ارے جواب بھی نہیں دیا۔ کمال ہے! کچھ تو کہتا۔ اوہو غلطی میری ہے۔ میں نے اس نکتے کی وضاحت نہیں کی کہ مجھے سفی صاحب سے کوئی سرکاری کام نہیں ہے۔

اتنے میں ایک صاحب گیٹ سے داخل ہوئے اور سفارت کی طرف بڑھے۔

میں نے بھاگ کر اسے السلام علیکم کہا اور پھر اپنا مقصد بیان کرنے کی کوشش کی لیکن پیشتر اس کے کہ میں اپنی بات ختم کر سکتا اس نے بیرونی احاطے کی اشارہ کیا اور آگے چل پڑا۔

صحرا نوردی:

دو روز میں سفارت کے احاطے میں صحرا نوردی کرتا رہا اور ہر آتے جاتے ہو کہتا رہا کہ مجھے سفیر صاحب سے ملنا ہے۔ میں سائل نہیں ہوں، میرا کوئی ذاتی کام نہیں ہے۔

پھر سفارت کے تمام اہل کار مجھ سے واقف ہو گئے۔ پہلے تو وہ میری بات سن کر مسکرا دیتے تھے۔ پھر جونہی میں قریب پہنچتا وہ خود کہتے "آپ نے سفیر صاحب کو ملنا ہے نا ذاتی کام سے نہیں"۔ آپ احاطے میں انتظار کریں، چھوٹے صاحب ابھی آ کر بات کریں گے۔"

دو روز کے بعد مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ سفیر صاحب سے ملنا مہم جوئی کے مترادف ہے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے محسوس ہوا کہ کسی سے ملنا اس قدر مشکل ہو سکتا ہے۔

پاکستان میں بڑے بڑے اہل کاروں سے ملا تھا۔ مجھے علم تھا کہ بڑے لوگوں سے ملنا ایک دشوار کام ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ لوگ جو ملاقات کا انتظام کراتے ہیں ملنے والے کی بات تو سنتے ہیں۔ بات کا معقول جواب دیتے ہیں۔ چلو معقول نہ سہی لیکن جواب تو دیتے ہیں، بات تو سنتے ہیں۔ مجھے خود "صدر گھر" میں ایک چھوٹا اہل کار ہونے کی حیثیت حاصل رہی ہے، سائلوں سے ملنے کے مواقع ملے ہیں لیکن ایسی کیفیت تو میں نے کہیں نہیں دیکھی تھی۔

فون نمبر:

تیسرے روز دفعتاً مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ فون کو آزماؤں۔ شاید فون سے بات بن جائے۔

لیکن سفارت کا فون نمبر کیسے حاصل ہو؟ سفارت کا فون نمبر حاصل کرنے کے لیے تیسرے روز پھر سفارت جا پہنچا۔ وہاں جس صاحب سے فون نمبر پوچھتا وہ مسکرا کر کہتا "ہاں مجھے علم ہے، آپ سفیر صاحب سے ملیں گے"۔ اور پھر آگے بڑھ جاتا۔ سارا دن میں سفارت میں گھومتا پھرتا رہا۔ شام کو نا کام مسافر خانے میں لوٹ آیا۔

مسافر خانے میں آوارہ پھرتے ہوئے دفعتاً میری نگاہ بڑے بڑے بورڈوں پر جا پڑی جو بارکوں پر لگے ہوئے تھے۔ "وزارتِ معلومات"۔ "وزارتِ حج"۔ "وزارت خوراک"۔ "وزارت رسل و رسائل"۔ ارے مسافر خانے کے اردگرد سعودی عرب کی تمام تر وزارتوں کے دفتر موجود تھے اور سعودی کارندے مسافروں کی سہولت اور آسانی کے لیے سرگرم کار تھے۔ میں دفتر معلومات کی طرف لپکا۔ "جناب والا! مجھے سفارت پاکستان کا فون نمبر چاہیے۔" کاؤنٹر پر کھڑے عرب نے فون ڈائریکٹری نکالی اور سفارت کا نمبر دیا۔

چوتھے روز میں نے سفیر صاحب کو فون کیا۔ ان کے پرائیوٹ سیکرٹری بولے کہ سفیر صاحب بے حد مصروف ہیں۔ اس روز میں سارا دن ہر گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد فون کرتا رہا اور جواب ملتا رہا کہ سفیر صاحب بے حد مصروف ہیں۔ اس روز سارا دن میں ٹیلیفون بوتھ میں کھڑا رہا۔

پانچویں دن میں فون پر سیکرٹری صاحب کو اپنی پوری کہانی سنانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ بولے "آپ یہاں آ جائیں، میں کوشش کروں گا کہ آپ کو ان سے ملا دوں۔ ویسے مشکل ہے چونکہ وہ بے حد مصروف ہیں"۔

چھٹے روز میں سارا دن سیکرٹری کے کمرے میں بیٹھا رہا کب سفیر صاحب کی مصروفیت ختم ہو اور سیکرٹری صاحب میرا تذکرہ کر سکیں۔

پھر دفعتاً مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ سفیر صاحب کے گھر ٹیلیفون کروں، وہ محترمہ تو ہوں گی۔

سفیر صاحب:

سیکرٹری صاحب نے فون گھر لگا دیا۔ وہ خاتون فون پر آ گئیں۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ مجھ پر برس پڑیں۔ بولیں "ارے صاحب! آپ نے تو حد کر دی۔ چھ دروز سے ہم آپ کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ جدہ پیلس والوں نے کہا وہ یہاں سے روپوش ہو گئے ہیں۔ رابطہ افسر غنی صاحب کو مکہ سے بلوایا گیا۔ چار روز وہ آپ کی تلاش کرتے رہے، جگہ جگہ ڈھونڈی لیکن آپ نہ ملے"۔

اس وقت میرا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑوں اور اسے بتاؤں کہ میں کہاں تھا۔ لیکن سیکرٹری کے تیور دیکھ کر ہمت نہ پڑی۔

میں نے کہا، "محترمہ! اس وقت میں پی ایس صاحب کے پاس بیٹھا ہوں۔ آپ سفیر صاحب کو فون کریں کہ وہ مجھ سے مل لیں"۔

چند ایک منٹ کے بعد سفیر صاحب کا چپڑاسی بھاگا بھاگا آیا، بولا "بڑے صاحب آپ کو بلا رہے ہیں"۔

وہ ایک مختصر سا کمرہ تھا جس میں ایک میز اور چار ایک کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ میز پر کوئی فائل نہ تھی۔ ویسٹ باسکٹ میں کاغذ کا کوئی ٹکڑا نہ تھا۔ سارے کمرے میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے ظاہر ہوتا کہ بڑے صاحب کو کسی کام سے دور کا تعلق ہے۔

بڑے صاحب کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہو گئے۔ بڑے اخلاق سے مجھے بٹھایا اور اتنی محبت سے میری روپوشی کا گلہ کرنے لگے کہ میں گھبرا گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ

یہ وہی صاحب تھے جن کو ملنے کے لیے میں چار روز سفارت میں جوتے چٹخاتا پھرا تھا۔ دو روز ٹیلی فون بوتھ میں ایستادہ رہا تھا اور ایک دن پی۔ ایس کی حضوری میں بیٹھا رہا تھا۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی صاحب تھے جو بے مصروف تھے، جنہیں بات سننے کی فرصت نہ تھی، بات کرنے کی فرصت نہ تھی۔

بڑے صاحب کو ملنے سے پہلے میں نے بار بار سوچا تھا کہ جب میں ان سے ملوں گا تو یہ کہوں گا، وہ کہوں گا، لیکن جب میں ان سے ملا تو مجھ میں ایک عجیب سا احساس جاگا۔ میں وہ ہوں جو سفیر صاحب سے مل رہا ہوں۔ ان سفیر صاحب سے مل رہا ہوں جنہیں ملنے کے متمنی ہفتوں سے باہر کے احاطے میں کھڑے چھوٹے صاحب کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور پھر صرف مل ہی نہیں رہا بلکہ میری آمد پر وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے مصافحہ کیا ہے، میرے ہاتھ پر ان کے ہاتھ کا لمس ابھی تک گرم ہے۔

"آپ پی آئی اے میں حسینی صاحب کو ملیں۔ میں انہیں فون کر دوں گا، جلد بکنگ ہو جائے گی انشاءاللہ"۔ سفیر صاحب نے کہا۔

میری طرف دیکھو:

سفارت سے باہر نکلتے ہوئے میں نے اہل کاروں اور سائلوں پر حقارت بھری نگاہ ڈالی۔ "اے لوگو! میری طرف دیکھو۔ میں وہ ہوں جو سفیر صاحب سے مل کر آیا ہے۔ میں وہ جس سے سفیر صاحب نے مصافحہ کیا ہے۔ بے شک میرا ہاتھ سونگھ کر دیکھ لو، اس میں ابھی تک سفیر صاحب کے دست مبارک کی بو ہے۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ باادب باملاحظہ ہوشیار۔"

مسافر خانہ

مسافر خانے کی زندگی عجیب زندگی تھی۔ مسافر خانے کے فراخ کمروں، برآمدوں، سیڑھیوں اور چھجوں پر ہزاروں مسافر پڑے ہوئے تھے۔ زمین پر بستر لگائے، سرہانے مصلے بچھائے، ہاتھوں میں تسبیحیں لٹکائے ہزاروں مسافر مقیم تھے۔ عرب، مصری، افریقی، ایرانی، پاکستانی، انڈونیشی اور بھارتی، ہر ملک کا آدمی وہاں موجود تھا۔

کارواں سرائے:

اگرچہ دیکھنے میں وہ مسافر خانہ معلوم نہیں ہوتا تھا کیوں کہ وہاں کسمپرسی کی کیفیت نہ تھی۔ اتنی بھیڑ کے باوجود وہاں انتظامات کے انبار لگے ہوئے تھے۔ لاکھوں مسافر دھڑا دھڑ بے دریغ گندگی پھیلا رہے تھے، لیکن کارکن اس قدر سرگرم تھے کہ منٹوں میں پھر سے جگہیں صاف کر کے رکھ دیتے اور حیران کن بات یہ تھی کسی کارکن نے کبھی کسی مسافر سے نہیں کہا تھا کہ گندگی مت پھیلاؤ۔ وہ خاموشی سے آتے اور بات کیے بغیر صفائی کر دیتے۔ ان کی اس سرگرمی کارکو دیکھ کر کسی مسافر کو یہ احساس نہ ہوتا تھا کہ اسے چھلکے، لفافے اور لٹر پڑیوں ادھر ادھر نہیں پھینکنا چاہیے۔ جب کہ جگہ جگہ ڈسٹ بن دھرے ہوئے تھے۔

تاہم وہ مسافر خانہ صحیح معنوں میں کارواں سرائے تھا۔ کتابوں میں تذکرے ضرور پڑھے تھے لیکن اسے دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ اس سے پہلے میں نے زندگی بھر کبھی کارواں سرائے کا مفہوم نہیں سمجھا تھا۔

ہر دس بیس منٹ کے بعد سینکڑوں لوگوں کا قافلہ بستر اٹھائے، سوٹ کیس لٹکائے مسافر خانے سے نکل کر نیچے میدان نما صحن میں بیٹھتا اور پھر بسوں میں لد کر نہ

جانے کہاں چلا جاتا۔

ہر دس بیس منٹ کے بعد مسافر خانے کے صدر دروازے سے سینکڑوں آدمیوں کا قافلہ داخل ہوتا اور میدان نما صحن میں آ بیٹھتا۔ پھر وہ اپنا سامان اٹھائے سیڑھیاں چڑھ کران کمروں اور برآمدوں میں سما جاتے۔

آنے جانے والوں کا یہ تانتا ایک عجیب سماں پیدا کر رہا تھا۔

جس کمرے میں میں مقیم تھا اس کا جغرافیہ صبح کچھ اور رہتا، دوپہر کچھ اور شام کو کچھ اور۔ کبھی وہ ایرانیوں سے بھرا ہوتا، کبھی بھوروں سے، کبھی افریقیوں سے اور کبھی مصریوں سے۔

اکثر بار ایسا بھی ہوتا کہ جب میں باتھ روم سے واپس آتا تو اپنا کمرہ پہچاننا مشکل ہو جاتا۔

وہاں میرے سوا شاید کوئی اور فرد اکیلا نہ تھا۔ لوگ ٹولیوں میں آتے تھے، ٹولیوں میں گھومتے تھے، ٹولیوں میں کھاتے تھے۔

کھانا:

کھانے کے اوقات پر عجیب سماں ہوتا تھا۔ کوئی بیٹھا بھنے چنے چبا رہا ہے، کوئی سوکھی ڈبل روٹی توڑ رہا ہے، کوئی روٹی پر چٹنی یا اچار رکھے ہوئے ہے۔ بیشتر لوگ تربوز سے روٹی کھاتے تھے۔ ایسے اہتمامی بندوبستی قافلے بھی مسافر خانے میں آکر قیام کرتے تھے جو اپنا مطبخ ساتھ لیے پھرتے تھے۔ ایسا قافلہ آ جاتا تو مسافر خانے کے اس کمرے کا نقشہ ہی بدل جاتا جس میں اسے قیام کے لیے جگہ ملتی۔ ان کے آتے ہی پلیٹیں چل پڑتیں۔ مرغ سے بھرے قاب پلاؤ کی طشتریاں حرکت میں آ جاتیں۔ اس وقت مجھے ایسا لگتا جیسے وہ مسافر خانہ نہ ہو بلکہ کوئی عالی شان ہوٹل ہو، جیسے ہم زائر نہ ہوں بلکہ پلنکر ز ہوں۔

کھانے کے وقت میں مسافر خانے کے باہر لگے ہوئے کھوکھے پر جا کھڑا ہوتا۔ مجھے دیکھ کر کھوکھے والا ایک چھوٹی ڈبل روٹی نکالتا، اس کا پیٹ چاک کرتا اور اس میں ایک ابلا ہوا انڈا اور ایک ٹماٹر کاٹ کر بھر دیتا۔ پھر وہ اس پر نمک مرچ چھڑکتا اور اسے میرے ہاتھ میں تھما دیتا۔ یہی میرا ناشتہ تھا یہی لنچ تھا، اور یہی ڈنر۔

پاکستانی زائرین:

کہتے ہیں پردیس میں کوئی فرد واحد نہ ہو لیکن پتہ نہیں کیسے مجھے فرد واحد ہونے میں ایسی لذت آ رہی تھی کہ جواب نہیں۔ کوئی مجھے پوچھتا نہ تھا، کوئی میری طرف متوجہ نہ ہوتا تھا، کوئی مجھ سے بات نہ کرتا تھا، ٹوکتا نہ تھا، دیکھتا نہ تھا، گنتا نہ تھا...... کتنی آزادی تھی۔ کسے با ما کارے نباشد

پہلے پہل میں نے سوچا تھا کہ کسی ایسے کمرے میں جا رہو جہاں پاکستانی مقیم ہوں۔ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے میں نے سارے مسافر خانے کا جائزہ لیا تھا۔ کمرا کمرا گھوما تھا۔

آخر ایک کمرا ایسا مل گیا جس میں پاکستانی مسافر بیٹھے تھے۔ پرلے کونے میں چند خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ دروازے کے عین درمیان میں چند مرد بیٹھے تھے۔ باقی کمرا خالی پڑا تھا یعنی جہاں پچاس زائرین کے سونے کی جگہ تھی وہاں صرف دس زائر بیٹھے تھے۔ میں کمرے میں داخل ہونے لگا تو انہوں نے مجھے روک لیا۔

''کون ہو تم؟ کہاں جانا ہے؟ کس ملک کے ہو؟ ساتھ کوئی ہے یا اکیلے ہو؟ کیا یہاں ٹھہرو گے؟''

چاروں طرف سے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ ہونے لگی۔

فرد واحد:

پھر ایک صاحب بولے "میاں کسی اور کمرے میں جگہ ڈھونڈو، یہ ریزرو کمرا ہے۔ ایک ساعت کے لیے میری پاکستانیت جوش میں آ گئی۔ جی چاہا کہ سینہ تان کر کھڑا ہو جاؤں اور گرج کر کہوں "تم مجھے روکنے والے کون ہو۔ دیکھ لوں گا میں تمہیں۔"

پھر پتہ نہیں کیا ہوا، فردواحد میرے اندر سے ابھرا۔ میرے کان میں بولا۔ "بیوقوف کسمپرسی کی جنت چھوڑ کر "اس کیوں" "کس لیے" اور "کون" کے دوزخ میں کیوں آتا ہے؟ پاگل ہے کیا؟"

پاکستانی زائروں کے کمرے کو دیکھنے کے جب میں واپس اپنے کمرے میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس جنت میں تازہ پھول کھل گئے ہیں، تازہ نہریں بہنے لگی ہیں اور چاروں طرف سے آوازیں آ رہی ہیں: "باادب باملاحظہ! فردواحد تشریف لا رہے ہیں"۔

لوٹ کا مال:

مسافر خانے کی زندگی اس قدر رنگارنگ دلچسپیوں سے بھری ہوئی تھی کہ عام حالات میں کسی زائر کا جی نہ چاہتا کہ وہ اسے چھوڑ کر جائے۔ دقت یہ تھی کہ اس وقت ہر زائر جلد از جلد وطن پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔ عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں سے گھرے لگاؤ جو حج کی مقدس مصروفیت کی وجہ سے دب گئے تھے پھر سے پھن اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ ادھ چھوڑی مصروفیات ذہنوں میں بھڑوں کی طرح بھوں بھوں کرنے لگیں۔ سلیم کے ابا کے سر پر یہ دھن سوار ہو گئی کہ کب گھر پہنچیں اور سلیم کی امی کو ان مقدس مصروفیتوں کا تذکرہ سنائیں جو سرزمین حجاز پر انہوں نے بتائی تھی۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ اڑ کر سلیم کی امی کے پاس پہنچیں اور اسے بتائیں کہ اس مقدس سرزمین کو چھوڑنے کو ان کا جی نہیں چاہتا تھا۔ بہرحال سارے زائرین

وطن پہنچنے کے لیے یوں بے قرار تھے جیسے ڈاکو ڈاکہ ڈالنے کے بعد چاہتے ہیں کہ جلد از جلد اپنی گٹھڑیاں لے جائیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ زائر مال کی جگہ ثواب کی گٹھڑیاں اٹھائے ہوئے جو وہ حرمین سے لوٹ کر لائے تھے۔

ایک روز حرم شریف میں بیٹھے ہوئے میں نے ایک معمر میر صاحب سے پوچھا۔ میں نے کہا۔ "میر صاحب! آپ سارا دن نفل ہی پڑھتے رہتے ہیں؟"

ستر لاکھ نمازیں:

میر صاحب نے حیرت سے میری طرف دیکھا، بولے "میاں آپ کو نہیں پتہ؟ ایک رکعت نماز جو حرم شریف میں ادا کی جاتی ہے، ستر لاکھ رکعتوں کے برابر ہوتی ہے۔ ستر لاکھ رکعتیں پڑھنے کا ثواب ملتا ہے۔ میاں یہاں تو ثواب کی لوٹ مچی ہوئی ہے، پھر ہم کیوں محروم رہیں"۔

میر صاحب کی بات سن کر چاہیے تو یہ تھا کہ میرے دل میں نفل پڑھنے کی خواہش پیدا ہوتی مگر ہوا یہ کہ مجھے خیال آیا کہ ایک آدمی باقاعدہ بلاناغہ نمازیں پڑھے تو وہ سال میں ۱۸۲۵ نمازیں پڑھے گا اور ساٹھ سال میں ایک لاکھ نو ہزار پانچ سو نمازیں پڑھے گا۔ حرم شریف میں ایک رکعت نماز پڑھ لینے کے بعد مزید نمازیں پڑھنے کی حاجت نہیں رہتی۔ خواہ مخواہ ثواب کی بوجھل گٹھڑیاں اٹھائے پھرنے سے فائدہ؟ اس خیال کے آتے ہی میں اللہ کے کوٹھے کی طرف بھاگا تھا اور اس کے پھیرے لینے لگا تھا۔

مسافر خانے میں مقیم زائرین اپنا بیشتر وقت نمازیں پڑھنے، نفل ادا کرنے، تسبیح چلانے اور جلد از جلد وطن پہنچنے کے ذہنی فکر اور عملی تگ و دو میں گزارتے تھے۔

سارا دن وہ بحری اور ہوائی جہازوں کے دفتروں کے سامنے شیطان کی آنت سے لمبے کیوؤں میں معلومات حاصل کرنے کے لیے کھڑے تسبیحیں چلاتے

رہتے۔ ''سبحان اللہ، سبحان اللہ، سبحان اللہ! یا اللہ اس مصیبت سے نجات دلا۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ''۔

پھر شام کو مسافر خانے میں پہنچ کر وہ نفل ادا کرنے میں وقت گزارتے۔ ''اللہ اکبر، یا اللہ نکال مجھے اس اندھیری کوٹھڑی سے، یا اللہ جہاز جلدی چلے، یا اللہ اس جہاز میں مجھے سیٹ مل جائے۔ اللہ اکبر۔ سبحان ربی......''

پھر ہم سب پر ایک اور قیامت ٹوٹی تھی۔ وہ یہ کہ ہم سب حاجی بن گئے تھے۔

یا حاجی یا حاجی:

گیارہ ذوالحجہ کو قربانی دینے کے بعد دفعتاً منیٰ کی ساری فضا یا حاجی یا حاجی کی آوازوں سے گونجنے لگی تھی۔

یہ آوازے سب سے پہلے ان مقامی لوگوں نے لگانے شروع کیے تھے۔ جو قینچیاں اور استرے اٹھا کر گھروں سے باہر نکل آئے تھے اور بازاروں، سڑکوں، راستوں پر بیٹھ گئے تھے ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے مکہ معظمہ اور منیٰ کے تمام باسی حجام بن کر بیٹھ گئے ہوں۔ آٹھ دس لاکھ زائرین کے بال کاٹنے ایک عظیم کاروبار تھا۔ یعنی ایک دن میں ایک کروڑ ریال کمانے کا موقعہ تھا۔

ان حجاموں نے زائرین کو متوجہ کرنے کے لیے یا حاجی یا حاجی کے آوازے لگانے شروع کئے تھے۔ پہلے تو میں حیران ہوا کہ یہ لوگ کسے پکار رہے ہیں کیونکہ میرے ذہن میں یہ خیال ہی نہ آیا تھا کہ میں حاجی بن چکا ہوں۔

اس روز سے جدہ سے خروج تک جب بھی کوئی ''یا حاجی'' کہہ کر مجھے بلاتا تو میں ادھر اُدھر دیکھنے لگتا کہ یا اللہ یہ شخص کسے پکار رہا ہے۔ پھر جب وہ قریب آ کر میرا بازو پکڑ لیتا تو میں سمجھتا بے چارے کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

جدہ کے مسافر خانے میں قیام کے دوران میں نے بڑی کوشش کی کہ اپنے

آپ کو یقین دلاؤں کہ میں نے حج کر لیا ہے اور اب میں حاجی ہوں۔

حج پر جانے سے پہلے میں اکثر دیکھا کرتا تھا کہ لوگ کس طرح عزیز و اقربا کو حج پر روانہ ہوتے وقت الوداع کہنے آتے ہیں۔ ایک زائر کو رخصت کرنے کے لیے بیسیوں جمگھٹا بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دل تقدیس بھرے جذبات سے دھڑکتے ہیں۔ پلیٹ فارم پر پاکیزگی کے انبار لگ جاتے ہیں۔ زائر خشوع و خضوع اور سبحان اللہ، سب تعریف اللہ کے واسطے ہے کا سا انداز طاری کرنے میں شدت سے مصروف رہتے ہیں۔

پھر جب وہ حاجی بن کر لوٹے ہیں تو ان آنکھوں میں ایک فاتحانہ چمک ہوتی ہے جسے شکر الحمد اللہ اور ہذا من فضل ربی کا ورد بھی دھندلا نہیں سکتا۔ پھر گردنوں میں پھولوں کے ہار ڈالے جاتے ہیں، بغل گیریاں ہوتی ہیں، سینے سے سینے ملائے جاتے ہیں۔ تقدیس بھری نگاہوں سے حاجی صاحب کا طواف کیا جاتا ہے۔ قدموں پر نچھاور ہونے والی نظریں انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں۔

اس منظر کو دیکھ کر بارہا میرا جی چاہا تھا کہ میں بھی کسی روز حاجی بن کر آؤں۔

حج پر جانے کی خواہش میں نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ لیکن حاجی بن کر آنے کی خواہش میرے دل میں ہمیشہ سے دبی ہوئی تھی۔

یقین جانئے جدہ کے مسافر خانے میں میں نے بڑی کوشش کی کہ انداز میں وقار، پاکیزگی، تشکر اور آنکھ میں فاتحانہ چمک پیدا کروں۔ کئی ایک دن مشق کرتا رہا تا کہ واپسی پر مستند حاجی بن سکوں۔

مستند حاجی:

مسافر خانے میں دس روز کا قیام میرے لیے مستند حاجی بننے کا زریں موقع تھا، کیونکہ قدرت جا چکے تھے اور میں اکیلا رہ گیا تھا۔ قدرت کے ساتھ واپس آتا تو

یقیناً مجھے مستند حاجی بننے کا موقع نصیب نہ ہوتا۔

میں نے کئی ایک بار قدرت کی واپسی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ دو بار وہ عمرہ ادا کر کے آئے تھے اور ہم سب پھولوں اور کیمروں سے لیس ان کے خیر مقدم کے لیے ایئر پورٹ پہنچے تھے۔ جہاز ہمارے سامنے اترا۔ مسافر باری باری باہر نکلے لیکن ان میں قدرت نہ تھے۔

آدھ گھنٹہ ہم ان کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے۔ پھر ان کے پی ایس سے معلوم ہوا کہ وہ جہاز کے عقب سے گھوم کر وی آئی پی روم کے گرد لمبا چکر لگا کر انجنیئرنگ شیڈ سے باہر نکل کر اپنی کار میں یوں چوروں کی طرح آ بیٹھے تھے جیسے عمرہ کر کے نہیں بلکہ سونا اسمگل کر کے آئے ہیں۔

بہرحال میں نے بڑی کوشش کی، دن رات مشق کرتا رہا لیکن نہ تو مجھ میں مستند حاجی صاحب کا سا انداز پیدا ہوا، نہ میں دل میں یہ یقین پیدا کر سکا کہ واقعی حج کر چکا ہوں۔

جب بھی میں اپنے دل میں یہ ایمان پیدا کرنے کی کوشش کرتا کہ میں حاجی ہوں تو مطاف میرے روبرو آ کھڑا ہوتا۔ ''تو؟ تو جو طواف کا ایک چکر بھی نہ لگا سکا؟ تو حاجی کیسے ہو سکتا ہے؟'' ساتھ ہی حطیم سے تحقیر بھر قہقہوں کی آواز آتی۔ پھر نورانی چہرے ابھرتے۔ انہوں نے ناک انگلیوں سے بند کیے ہوتے: ''لاحول ولاقوۃ۔ لاحول ولاقوۃ''۔

پھر جمرۃ العقبہ دانت نکالتا: ''مجھ سے پتھر کھا کے گیا ہے اور اب حاجی بننا چاہتا ہے؟'' پھر میری نگاہوں تلے خانہ خدا ابھرتا اور میں دیوانہ وار اس بھدے بے ڈھبے کوٹھے کی طرف بڑھتا: ''تو بتا، تو کیوں نہیں بولتا؟ تو دلوں کا حال جانتا ہے۔ تو میرا واحد گواہ ہے''۔ کوٹھے کے والی کے چہرے پر DIVINE

UNCONCERN کی ایک دبیز تہہ چڑھ جاتی اور سنجیدگی سے وہ کہتا "ہم اس معاملے میں دخل نہیں دیں گے۔ یہ شریعت کا معاملہ ہے"۔

جدہ کے مسافر خانے میں کئی تو پیدائشی حاجی تھے۔ وہ حج نہ بھی کرتے تو بھی حاجی نظر آتے۔ کئی حاجی برتاؤ کی تکمیل کے لیے اپنے انداز میں آخری کلیاں ٹانک رہے تھے۔ ابھی سے بہتوں کی صورت حال اس امر کی شاہد تھی کہ وہ اپنے کو THE HOSEN سمجھنے لگے ہیں۔

جس طرح ۱۶ سال کی ایک الھڑ کنواری سہاگ کی رات بسر کرنے کے بعد جب جاگتی ہے تو ساری دنیا کی طرف "ہم جانتے ہیں" کی سی نگاہ اٹھا کر دیکھنے لگتی ہے، اسی طرح مسافر خانے کے بیشتر حاجی "ہم جانتے ہیں" کی سی نگاہوں سے گرد و پیش کو دیکھ رہے تھے۔

خروج:

سفیر صاحب کے کہنے کے مطابق جب میں حسینی صاحب سے ملنے کے لیے پی آئی اے کے دفتر میں گیا تو وہاں کے رنگ ہی اور تھے۔

اس سڑک پر تمام ایئر لائینز کے دفاتر تھے۔ان دفتروں کے سامنے مسافروں کی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔یہ لوگ کئی دنوں سے ایئر لائینز کے دفتر کے سامنے مارے مارے پھر رہے تھے۔گھنٹوں قطار میں کھڑے ہونے کے بعد لاؤڈ سپیکر پر اعلان ہوتا: بکنگ کے متعلق شام کو چار بجے اعلان کیا جائے گا۔" شام کو چار بجے پھر بھیڑ لگ جاتی اور ایک گھنٹے کے بعد اعلان ہوتا کہ "پلین کی روانگی کل پر ملتوی ہو گئی ہے، صبح نو بجے معلومات حاصل کریں"۔

ایئر سروسوں کے دفتر میں، سمندری جہازوں کے بکنگ آفسوں میں، ہوائی اڈوں اور بندرگاہ پر لوگوں کے ٹھٹھ لگے تھے۔وہ سب حسرت زدہ نگاہوں سے ہر جاتے ہوئے شپ اور پلین کی طرف دیکھتے اور آہیں بھرتے اور پھر آسمان کی طرف دیکھتے "یا اللہ! تو رحیم ہے، کارساز ہے، ہماری مشکل آسان کر!"

بیس دن پہلے جب یہی لوگ اس سرزمین پر اترے تھے تو وہ دعائیں مانگ رہے تھے "یا اللہ! اس مقدس سرزمین سے ہمیں واپس نہ لے جانا بلکہ اسی پاک مٹی میں سما جانا ہمارے نصیب کرنا"!

مسافر خانوں میں، معلم خانوں میں، ہوٹلوں میں، راہ گزاروں پر بیٹھے ہوئے لوگ دعائیں مانگ رہے تھے "یا اللہ! ہماری مشکل آسان کر! وہ انتظار کرتے کرتے اکتا چکے تھے۔انہیں صرف ایک دھن لگی تھی کہ پر لگ جائیں اور وہ اڑ کر وطن پہنچ جائیں۔"

ہٹ جاؤ:

۲۶ مارچ کو جب ایئر پورٹ کے لاؤڈ سپیکر پر اعلان ہوا کہ لونج میں بیٹھے ہوئے مسافر رن وے پر کھڑے جہاز میں اپنی اپنی نشستوں پر جا بیٹھیں، اس وقت لونج میں سینکڑوں لوگ حسرت زدہ نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔

میری چھاتی تن گئی، گردن اکڑ گئی، ''ہٹ جاؤ، با ادب با ملاحظہ! میں ان میں سے ہوں جن کی سیٹ بک ہو چکی ہے، جن کا ایروپلین منتظر ہے۔ میں وہ خوش قسمت فرد ہوں جو اس ''مصیبت'' سے چھٹکارا پا چکا ہے اور اپنے وطن کو عازم ہے''۔

پھر جہاز میں بیٹھے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ ''جب میں پنڈی پہنچوں گا تو ایک جم غفیر میرے استقبال کے لیے منتظر ہوگا۔ لوگ میری بلائیں لیں گے، میرے ہاتھ چومیں گے، میرے پلو کو آنکھوں سے لگائیں گے، مجھ پر پھول پتیوں کی بارش کریں گے۔ میری گردن ہاروں سے لد جائے گی۔ یا حاجی، یا حاجی!''

پھر زندگی بھر لوگ ''یا حاجی'' کی زیارت کو آیا کریں گے اور محفل میں بیٹھ کر میں کھنکار کر کہوں گا ''سبحان اللہ، سبحان اللہ! کیا سماں تھا۔ نور ہی نور، نور ہی نور، اور جب ہم اس پاک سرزمین سے واپس آنے لگے تو ہماری آنکھوں سے اشک رواں تھے اور دل جدائی کے غم سے نڈھال تھے''۔

خروج

جونہی طیارہ فضا میں ابھرا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے وہ کھڑی ہے۔ اسے دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ پہلے تو میں حیران ہوا، یا اللہ یہ کون سی مخلوق ہے۔ گذشتہ اٹھارہ بیس دنوں میں کوئی عورت میری نگاہ سے نہیں گزری تھی۔

سنڈیاں ہی سنڈیاں:

ویسے زائرین میں لاکھوں کی تعداد میں عورتیں تھیں۔ حرمین میں، منیٰ میں، عرفات میں، بازاروں میں، سڑکوں پر ہزاروں عورتیں تھیں لیکن انہیں دیکھ کر یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ عورتیں ہیں۔ وہ بذات خود بھولی بیٹھی تھیں کہ وہ عورتیں ہیں۔ انہوں نے اپنا ازلی مشن 'میری طرف دیکھو، میں عورت ہوں" تیاگ رکھا تھا۔ سرزمین حجاز پر قدم رکھتے ہی نہ جانے انہیں کیا ہوا تھا، گویا بھڑوں میں نہ تو ڈنک رہا تھا اور نہ بھوں بھوں کرنے کی صلاحیت۔ پتہ نہیں کس قانون کے تحت بھڑ پھر سے سنڈیوں میں بدل گئے تھے۔ لاکھوں سنڈیاں سرزمین حجاز پر رینگ رہی تھیں۔

گلیور اور بالشتیہ:

بھوں بھوں کی آواز سن کر میں چونکا۔ یا اللہ یہ کیسی آواز ہے۔ سارا جہاز اس کی بھوں بھوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا، ڈنکوں کی ایک بوچھاڑ پڑی۔

اس وقت میری کیفیت گلیور کی سی تھی۔ گلیور پاکیزگی کے رسوں سے بندھا ہوا تھا، اور وہ بالشتنی تھی جو اپنی کمان سے ننھے تیر برسا رہی تھی۔ پھر ایک عجیب کایا پلٹ عمل میں آئی۔ پاکیزگی کے وہ رسے جن سے میرا بند بند بندھا ہوا تھا، ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے۔ ان کے ٹوٹتے ہی گلیور سکڑنے لگا، سکڑتا ہی چلا گیا اور بالشتنی پھیلنے لگی، پھیلتی ہی چلی گئی۔ حتیٰ کہ میں بالشتیہ میں بدل کر رہ گیا اور وہ گلیور بن کر سارے جہاز پر چھا گئی۔

وہ بھرے بھرے جسم کی ٹین ایجر لڑکی تھی۔ چہرے پر بلا کی شگفتہ شوخی تھی، تازگی تھی، چستی تھی۔ آنکھوں میں لگاوٹ تھی۔ وہ لڑکی ایئر ہوسٹس تھی۔ اس نے سکرٹ پہن رکھی تھی۔ سکرٹ کے اوپر کی قمیض مردانہ تھی اور بہت ہی مختصر تھی۔

گوریاں:

ظاہر تھا کہ وہ میم ہے۔لباس اور انداز میں میم ہی میم رچی بسی تھی۔ بلا کی گوری تھی لیکن اس کا گوراپن میموں سے ہٹ کر تھا۔ مجھے میم کا گوراپن بالکل پسند نہیں۔ پتہ نہیں کیوں؟ خاتون سراسر گوری ہو تو جتنی گوری ہو گی اتنے ہی جسم کے مسامات ڈھیلے ہوں گے۔ پنڈے کو کس کر رکھنے والی طنابوں میں پکڑ نہیں ہو گی۔اسی وجہ سے میموں کے جسم پھسپھسے ہوتے ہیں۔ وہ گوری ہونے کے باوجود پھسپھسی نہیں تھی۔

میں اس کی جانب دیکھتا رہا دیکھتا رہا۔ میں بھول گیا کہ کہاں سے آیا ہوں، کہاں جا رہا ہوں۔ دفعتاً میں چونکا، مجھے یاد آیا کہ میں تو حج کرنے کے بعد وطن لوٹ رہا ہوں۔

عرب میم:

ارے میں گھبرا گیا۔ یہ پی ائی اے کا جہاز تو نہیں۔ ائیر ہوسٹس، سٹیورڈز، سب کے سب غیر ملکی تھے۔صاحب اور میمیں۔ میری بکنگ تو پی ائی اے میں ہوئی تھی، شاید میں غلطی سے کسی اور جہاز میں بیٹھ گیا ہوں۔

پھر میری نگاہ اپنے ہمراہیوں پر پڑی۔ ہائیں! یہ تو سب کے سب حاجی ہیں۔ میرے اللہ کیا ہم اتنے سارے لوگ غلط جہاز پر بیٹھ گئے ہیں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔

"کیا یہ پی ائی اے کا جہاز ہے؟" میں نے پہلو میں بیٹھے ہوئے ہمراہی سے پوچھا۔

وہ مسکرایا، بولا "نہیں"۔

''تو پھر؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

اس نے سرسری انداز میں جواب دیا ''یہ طیارہ سعودی ایئرویز کا ہے۔ پی آئی اے کے پاس کوئی اپنا طیارہ نہ تھا، رش زیادہ تھا اس لیے انہوں نے سعودی ایئر لائینز کے چار ایک طیارے چارٹر کر رکھے ہیں''۔

''اوہ!'' میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''لیکن طیارے کا سٹاف تو یورپین دکھتا ہے''۔

''اونہوں'' وہ تسبیح چلاتے ہوئے بولے ''عرب۔ عرب''۔

''عرب؟'' میں نے حیرت سے دہرایا اور پھر ان جانے میں سوچے سمجھے بنا میرے منہ سے وہ بات نکل گئی جو میں بڑی کوشش سے دبائے بیٹھا تھا ''مگر یہ ائیر ہوسٹس''۔

ہمراہی نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا ''لاحول ولا قوۃ'' کہہ کہ وہ مجھ سے پرے ہٹ گیا۔

دیر تک میں کھسیانا اور شرمندہ ہو کر چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا رہا۔

دل ہی دل میں اپنے آپ پر نفرین بھیجتا رہا کہ میں ایسے فاسد خیالات میں کیوں الجھ گیا۔ دیر تک میں توبہ کرتا رہا لیکن توبہ کرتے ہوئے بھی میں محسوس کر رہا تھا کہ سارا جہاز اس عرب ائیر ہوسٹس سے بھرا ہوا ہے۔

خیر اور شر:

پھر مجھے خیال آیا کہ میں اسے کسی فاسد خیال سے تو نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں صرف مشاہدہ کر رہا تھا کہ اس میں ہوس کا عنصر نہ تھا۔

ایک روز میں نے قدرت اللہ سے پوچھا، ''یہ جو اللہ والے لوگ ہوتے ہیں، یہ عورت سے کیوں گھبراتے ہیں؟''

"گھبرانے سے آپ کا مطلب؟" وہ بولے۔

"زیادہ تر بزرگ تو عورتوں سے ملتے ہی نہیں۔ ان کے دربار میں عورتوں کا داخلہ ممنوع ہوتا ہے۔"

"یہ تو ہے" وہ بولے۔

"سرِ راہ چلتے ہوئے کوئی عورت نظر آ جائے تو گھبرا کر سر جھکا لیتے ہیں۔ ان کی اس گھبراہٹ میں خوف کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ وہ عورت سے کیوں ڈرتے ہیں؟"

"شاید اپنے آپ سے ڈرتے ہوں" قدرت نے کہا۔

"لیکن وہ تو اپنے آپ پر قابو پا چکے ہوتے ہیں۔ اپنی میں کو فنا کر چکے ہوتے ہیں۔"

"اپنے آپ پر جتنا زیادہ قابو پا لو اتنا ہی بے قابو ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے شر کا عنصر کبھی پورے طور پر فنا نہیں ہوتا؟"

"شر کا عنصر پورے طور پر فنا ہو جائے تو نیکی کا وجود ہی نہ رہے۔ چراغ کے جلنے کے لیے پس منظر میں اندھیرا ضروری ہے"۔

"میں نہیں سمجھا۔ مجھے ان جملوں سے کتاب اور دانشوری کی بو آتی ہے"۔

"انسان میں جوں جوں نیکی کی صلاحیت بڑھتی ہے توں توں ساتھ ساتھ شر کی ترغیب بڑھتی ہے۔ شر کی ترغیب نہ بڑھے تو نیکی کی صلاحیت بڑھ نہیں سکتی"۔

"سیدھی بات کیوں نہیں کرتے آپ؟"

قدرت میری طرف دیکھنے لگے۔

"کہ تمام قوت کا منبع شر ہے۔ نیکی میں قوت کا عنصر نہیں۔ اللہ کے بندوں کا کام ٹرانسفارمر جیسا ہے۔ شر کی قوت کا رخ نیکی کی طرف موڑ دو"۔

"شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں"۔قدرت نے جواب دیا۔

"آپ اپنے بیان میں "شاید" کی کلی کیوں ٹانک دیتے ہیں۔"

وہ مسکرائے"اس لیے کہ علم کل صرف اللہ کی ذات ہے"۔

"وہ تو ہے"میں نے کہا"لیکن ان اللہ والوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔کچھ ایسے بھی ہیں جو عورت کے چیلنج کو قبول کرتے ہیں، اس کے ساتھ میل جول سے نہیں گھبراتے۔عورت سے قوت مستعار لیتے ہیں اور پھر اسے اللہ کی طرف لگا دیتے ہیں"۔

"کیا مطلب؟"وہ بولے

"کتنی ہیرا پھیری ہے کہ کوئلے جنس سے مستعار لو اور ان پر روٹی پکاؤ اللہ کی"۔

قدرت سے قہقہہ مار کر ہنسے۔

"آپ کا بھی تو یہی وطیرہ ہے"۔

"میں؟"وہ چونکے"میں نہ تین میں نہ تیرہ میں، میری بات چھوڑیے"۔

"میں ایک ایسے درویش کو جانتا ہوں جنہوں نے زندگی بھر شادی نہ کی۔ان کا یہ دستور تھا کہ ہر تیسرے چوتھے مہینے ہیرا منڈی جاتے، کسی کو بک کرتے، عالم برہنگی میں ایک دوسرے کے روبرو بیٹھ جاتے، جب خواہش اپنی شدت کی انتہا پر جا پہنچتی تو وہ اللہ کی طرف دھیان موڑ لیتے۔جسمانی خواہش ختم ہو کر قلب میں ڈھل جاتی۔پھر وہ الحمد اللہ کا ورد کرتے ہوئے چوبارے سے اتر آتے"۔

"یہ تیرے پر اسرار بندے"۔قدرت مسکرائے۔

وہ خاموشی یہ خاموشی:

میں نے طیارے میں بیٹھے ہوئے زائرین کی طرف دیکھا۔وہ سب خاموش

تھے۔

اس روز جب ہم طیارے میں بیٹھ کر کراچی سے جدہ جا رہے تھے، اس روز بھی طیارے پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

وہ خاموشی اس خاموشی سے کسی قدر مختلف تھی۔ اس خاموشی میں امید تھی، تقدس تھا۔ اس خاموشی میں اضطراب تھا، ہوس تھی۔ وہ خاموشی اللہ کے حضور میں حاضری دینے کے شوق سے بھری ہوئی تھی۔ اس خاموشی میں کچھ پانے کی تمنا تھی، اس خاموشی میں پا لینے کا زعم تھا۔

ان کے چہروں پر خوشی کی سرخی تھی کہ کب کراچی پہنچیں، حاجیوں کی گاڑی میں بیٹھیں۔ گاڑی ہر سٹیشن پر رکے، پلیٹ فارم پر ہجوم ہو، لوگ ان کی زیارت کے لیے بے تاب ہوں۔ عوام ان کی طرف مسرت سے دیکھیں، ان کے ہاتھ چومیں، بلائیں لیں، تقدس بھری نگاہیں انہیں گھیرے رکھیں۔ گردنیں پھولوں سے لد جائیں، منہ زبانی اظہار عجز کے باوجود وہ تقدس کے تخت پر بیٹھ جائیں، مورچھلیں حرکت میں آ جائیں۔

جہاز چلتا رہا چلتا رہا۔

ہوسٹس چھائی رہی چھائی رہی۔

زائروں کے دل دھڑکتے رہے حتیٰ کہ کپتان کی انگریز نما آواز گونجی پیٹیاں باندھ لو، سگریٹ بجھا دو، ہم کراچی ائیرپورٹ پر اترنے والے ہیں۔

زائرین کی باچھیں کھل گئیں۔

بیگ، لوٹے، کمبل، ٹوکریاں بازوؤں تلے لٹکنے لگے۔ الحمدللہ کی سرگوشیاں گونجیں۔

جہاز رک گیا۔ جہاز سے اتر کر ہمیں قناطوں سے بنے ہوئے ایک وسیع

احاطے میں لے جایا گیا۔ لاؤڈ سپیکر سے اعلان ہو رہا تھا: "یہاں اپنے سامان کا انتظار فرمائیں۔"

منو جی مہاراج:

جوں ہی زائرین نے کراچی ائیر پورٹ کے اس احاطے میں قدم رکھا، دفعتاً ایک کایا پلٹ عمل میں آئی۔

حج پر روانہ ہونے کے وقت جب ہم نے کراچی کو خیر باد کہا تھا تو زائرین نے اپنے اپنے عہدے، سماجی مقام۔ اپنی اپنی حیثیت، ذات پات سب امتیازات، تمغے، طرے اور سندیں اتار پھینکے تھے اور سب نے زائر کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

پندرہ بیس دن سرزمین حجاز پر کوئی صاحب نہ تھا، کوئی سرمایہ دار نہ تھا، کوئی سید نہ تھا، کوئی آقا نہ تھا۔ وہاں صرف اللہ تھا، اس کا رسولؐ تھا اور باقی بندے ہی بندے۔ وہ مفلس محتاج و غنی سب ایک تھے۔

واپسی پر کراچی ائیر پورٹ پر قدم رکھتے ہی گویا منو جی مہاراج نے اپنا منتر پھونکا اور حاجیوں کی کایا پلٹ ہو گئی۔

کسی نے چھاتی پر اتنا بڑا تمغہ لگا لیا اور چھاتی تن گئی۔ کسی نے گردن پر وہی پرانا کلف لگا لیا اور گردن اکڑ گئی۔ کوئی صاحب بن کر انگریزی ایکسنٹ (ACCENT) میں سبحان اللہ، سبحان اللہ کرنے لگا۔ کوئی سید بن کر داڑھی میں خلال کرنے لگا۔ کسی کو دفعتاً یاد آ گیا کہ ارے میں تو کلرک ہوں اور اس کی گردن ڈھلک گئی، کوئی تن کر وی آئی پی بن گیا۔

اس کایا پلٹ کے بعد احاطے میں گلیور اور باشتیے تھے، برہمن تھے، شودر تھے، حاکم تھے، محکوم تھے۔ نہ کوئی زائر تھا نہ حاجی۔

دھندلکا:

احاطے میں پہنچ کر میں یوں ڈھیر ہو کر گر پڑا جیسے غبارے سے پھونک نکل جائے تو وہ چیچھڑا بن کر رہ جاتا ہے۔

گذشتہ بیس دن سرزمین حجاز پر اپنے نمائشی عجز کے باوجود میں ایڑیاں اٹھا کر چلتا پھرتا رہا تھا۔ کیوں نہ ایڑیاں اٹھا کر چلتا؟ میں سعودی حکومت کے خصوصی مہمان کا ساتھی تھا۔ میرے لیے پاش ہوٹلوں میں کمرہ ریزرو تھا۔ وردی میں ملبوس بیرے میرے اردگرد یس سر یس سر کرتے پھرتے تھے۔

پھر مسجد نبویؐ میں میں حضور اعلیٰ کے ادنیٰ غلام کی معیت میں داخل ہوتا تھا۔ یہ حیثیت بھی کوئی معمولی حیثیت نہ تھی۔ پھر جدہ میں مجھے سفیر صاحب سے ہاتھ ملانے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔

کراچی پہنچ کر دفعتاً مجھے اپنی اوقات یاد آ گئی۔ گرد و پیش پر ایک دھندلکا چھا گیا۔

روشنی کی کرن:

پھر اس دھندلکے میں ایک کرن سی چمکی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا، کرن نے ایک متبسم دل کش شکل اختیار کر لی اور وہ میرے روبرو کھڑی ہو گئی۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ!" وہ بڑے خلوص سے مسکرائی۔ "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں"۔ وہ بولی "کہیے تو میں آپ کو گھر پہنچا دوں؟" "نہیں نہیں تکلیف کی بات نہیں، مجھے دلی راحت ہو گی۔"

مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ذہن میں دھند کے انبار لگے ہوئے تھے۔

زبان کسی سٹلائیٹ کی طرح خلاء میں ٹنگی ہوئی تھی ۔احساسات شل ہو رہے تھے ۔

پھر ایک گلابی ہاتھ میرے طرف بڑھا۔اچھا اچھا خدا حافظ! اس دوستانہ مگر رنگین ہاتھ نے میرا ہاتھ تھام لیا ۔ایک تبسم چمکا اور وہ چلی گئی ۔

آپ سے کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ گو زندگی بھر میری تمنا رہی کہ کوئی خوبصورت خاتون مجھ سے بات کرے، ہاتھ ملائے لیکن اگر کبھی یہ واقعہ عمل میں آ جائے تو میرے پسینے چھوٹ جایا کرتے ہیں۔

سوتا جاگتا:

پھر ایک اتنی لمبی کالی سیاہ کار احاطے کے دروازے میں آ کھڑی ہوئی ۔دو باوردی افراد لپکے ۔ایک نے دروازہ کھولا، دوسرے نے فرشی سلام کیا اور وہی خاتون کار میں سوار ہو گئیں اور کار آواز پیدا کئے بغیر روانہ ہو گئی ۔

''ارے! میں چونک کر بیدار ہو گیا''۔

اس وقت میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں سوت جاگتا ابوالحسن تھا جو ایک ساعت ظل الٰہی بنا ہوتا، دوسری ساعت ابوالحسن۔

''ارے!'' میں نے سوچا ''اتنی لمبی کالی سیاہ کار والی نے مجھ سے ہاتھ ملایا تھا،میرا شکریہ ادا کیا۔میں نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا،وہ لمس پھر سے جاگنے لگا۔ ''یا اللہ میں کون ہوں ۔ضرور میں کوئی بڑا آدمی ہوں ورنہ وہ محترمہ میرا شکریہ ادا کیوں کرتی، مجھ سے ہاتھ کیوں ملاتی ۔ہاں ہاں میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں''۔

''ارے!''، دفعتاً مجھے خیال آیا ''یہ محترمہ وہ خاتون تو نہیں تھی جسے میں جدہ کے سفیر کے گھر سے کراچی ساتھ لایا تھا؟''

سفر کے دوران میں نے اس خاتون کی طرف کوئی توجہ نہ دی تھی ۔اگر وہ ایئر ہوسٹس سفر کے دوران میں مجھے بالشتیہ نہ بنا دیتی اور خود SPHINX بن کر میری

نسوں پر نہ چھا جاتی تو یقیناً میں اس خاتون کے وجود سے بے نیاز نہ ہوتا۔

"کھو دیا کھو دیا" میں نے سوچا "اور کچھ نہیں تو اسے کہہ کر اپنا سامان ہی چھڑا لیتا۔ کنیو میں بیٹھنے کے عذاب سے بچ جاتا۔ کسٹم کے افسروں کی رعونت سے جان چھوٹ جاتی کھو دیا کھو دیا!"

سونا ہی سونا:

پھر میں اپنی باری کے انتظار میں سامان سامنے رکھے زمین پر بیٹھا تھا۔ بیٹھا رہا، بیٹھا رہا۔

پھر کسٹم کا ایک افسر مجھ سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔

"یہ آپ کا سامان ہے؟"

"جی!"

"کیا کیا ہے اس میں؟"

"سامان ہے"۔

"سونا لائے ہو؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں"۔ میں نے سوچے سمجھے بنا کہہ دیا۔

وہ مسکرایا "کتنا ہے؟"

"ارے یہ میں نے کیا کہہ دیا۔" میں گھبرا گیا۔

افسر رازدارانہ انداز سے بولا۔ "مجھ سے کہہ دیجئے، آپس کی بات ہے"۔

"جی!" میں نے کہا۔

"کتنا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"بہت ہے" میں نے کہا۔

"کتنے تولے؟"

"تولوں ماشوں میں نہیں۔"

"تو پھر؟"

"اتنا سونا لایا ہوں کہ حدوحساب نہیں۔"

"سامان میں ہے؟"

"اونہوں......"میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کہاں ہے؟"

میں نے سینے پر ہاتھ رکھ دیا "یہاں"۔سونا وونا کوئی نہ تھا لیکن اب بات کو نبھانا جو تھا۔

ہیلشٹ :

عین اس وقت لاؤڈ سپیکر سے اعلان ہوا "ممتاز مفتی اگر آ گئے ہوں تو معلومات کے خیمے میں آ جائیں"۔

ایک ساعت کے لیے مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا مجھے بھلا کون جانتا ہے یہاں۔کسی کو میرے آنے کی اطلاع بھی تو نہیں۔

کوئی پھر سے اعلان دہرا رہا تھا۔

ارے واقعی میرا نام پکار جا رہا تھا۔میری گردن اکڑ گئی۔کسٹم کا افسر سکڑ کر بالشتیہ بن گیا۔گلیور نے اس کی طرف تمسخر بھری نگاہ سے دیکھا۔"دیکھا ہم وہ سونا لانے والے ہیں جن کے مددگار باہر موجود ہیں،جن سے لمبی کاروں والی محترمہ ہاتھ ملاتی ہیں۔ہیشٹ ہٹ جاؤ،ہٹ جاؤ،راستہ چھوڑ دو"۔افسر سر کھجانے لگا۔

معلومات کے خیمے میں پہنچا تو شاہ صاحب،قیصر،جے اور ارم سب موجود تھے۔

شاہ صاحب بولے "میں سامان لے آتا ہوں،آپ یہیں ٹھہریئے۔"

جتھوں دی کھوتی

کراچی پہنچتے ہی وہ طلسم ٹوٹ گیا۔ وہ بجلی کا کرنٹ جس نے مجھے بلب کی طرح روشن کر رکھا تھا، کٹ گیا۔ بیس دن اس جذبے سے سرشار ماحول نے میری جبلت کی کڑوی گولی پر شکر کا جو کوٹنگ کر رکھا تھا وہ اتر گیا۔ ملمع اترنے کے نیچے کا پیتل اتر آیا۔ پھر وہی کراچی تھا وہی میں تھا۔ مور کے پر اترنے کے بعد کالا کوا کائیں کائیں کر رہا تھا۔

کوّے اور ہنس راج:

اس روز پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ میرا وطن کالے کوؤں کی آماجگاہ ہے۔ سب کائیں کائیں کر رہے تھے، سب مَیں مَیں کی رٹ لگا رہے تھے۔ اگر آپ یک دم ''تو'' سے ''میں'' پر گر جائیں تو ذہن کو ایک دھچکا ضرور لگتا ہے۔ اس دھچکے سے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے میں نے وہی طریقہ اپنا لیا جو چوہا بلی کی آمد پر اپناتا ہے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ بے شک گرد و پیش کوؤں سے بھرا ہے، بے شک سبھی ''مَیں مَیں'' کی تسبیح کر رہے ہیں لیکن میں کوا نہیں ہوا، میں تو حاجی ہوں جو نوازا گیا ہے، جس کی تمام آلائشیں دھل چکی ہیں، جو قابل تعظیم ہے۔

''لوگو! آؤ، دیکھو یہ تمہارے سامنے کون کھڑا ہے۔ اس کی عظمت کو تسلیم کرو، اس کے مرتبے کو پہچانو، اس کے ہاتھ چومو۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جنہیں سبز جنگلے کو تھامنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ان میں خانہ خدا کی دیواروں کے لمس کی خوشبو باقی ہے۔ یہ ہاتھ آنکھوں سے لگاؤ۔''

پھر جو میں نے گرد و پیش پر نظر ڈالی تو وہاں کوے نہیں تھے بلکہ کیڑے مکوڑے رینگ رہے تھے اور ان کے درمیان میں یوں کھڑا تھا جیسے راج ہنس ہو۔

منکر:

قیصر جس کے پاس میں ٹھہرا تھا میری عظمت کو تسلیم کرنے سے قطعی منکر تھا۔ اسے احساس ہی نہ تھا کہ میں کون تھا کہاں سے آیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں وہی ممتاز مفتی ہوں جو بیس روز پہلے بازار میں کھڑا اس کے ساتھ چاٹ کھا رہا تھا۔ اسے یہ شعور ہی نہ تھا کہ میں مکہ مدینہ سے آیا ہوں۔ وہ میرے ساتھ ایسا سلوک کر رہا تھا جیسے میں سرزمین حجاز سے نہیں بلکہ پنچوں کی ملیاں سے ہو کر آیا تھا۔ البتہ اس کی بیگم جے کی نگاہوں میں عقیدت اور احترام کی جھلک ضرور تھی اور ان کی بیٹی ارم تو جذبے کی شدت سے بے حال ہو رہی تھی۔

''اچھا تو انکل آپ نے خانہ خدا کے پھیرے لیے تھے؟''

''آپ نے سنگ اسود کو چوما تھا؟''

''آپ نے مسجد نبویؐ میں سبز جنگلے کو بوسہ دیا تھا؟''

وہ سوال پر سوال کیے جا رہی تھی اور ہر مثبت جواب پر خوشی سے گویا پاگل ہو جاتی۔ ہنستی، تالی بجاتی، آنکھوں میں شرارے پھوٹتے۔ پھر قیصر کوئی عمومی بات کہہ کر سارا مزا کرکرا کر دیتا۔ چلو یار چل کر چاٹ کھائیں۔ اسے اتنا شعور نہیں تھا کہ معزز لوگ بازار میں کھڑے ہو کر چاٹ نہیں کھایا کرتے۔

قیصر کے رویے نے میرا کراچی میں رکنا دوبھر کر دیا۔ جی چاہتا تھا کہ فوراً گھر چلا جاؤں لیکن اگر گھر والوں نے بھی مجھ سے یہی سلوک کیا تو؟

حاجی سپیشل:

اخبار میں یہ خبر پڑھ کر کہ اسی روز کراچی سے ایک حاجی سپیشل ٹرین چل رہی ہے، میرا جی چاہا کہ میں ہوائی جہاز کی بجائے ریل گاڑی سے اسلام آباد جاؤں۔

مجھے کئی بار حاجی سپیشل ٹرین دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ گاڑی میں نورانی شکلوں والے بوڑھے بیٹھے تسبیح میں مصروف ہوتے ہیں۔ ان کے چہروں پر عجیب سی روشنی ہوتی ہے۔ انداز میں بے پایاں سکون اور ٹھہراؤ ہوتا ہے۔

یہ سپیشل ٹرین ہر بڑے سٹیشن پر رکتی ہے۔ ہر بڑے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ وہ عقیدت بھرے، اضطراب بھرے شوق سے حاجی کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار ہوتے ہیں، ہونٹوں پر سبحان اللہ ہوتا ہے۔ دل اسلامی جذبے سے سرشار ہوتے ہیں۔

جب گاڑی پلیٹ فارم پر رکتی ہے تو اللہ اکبر کے نعروں سے فضا گونجتی ہے۔ پھر لوگ ہار بانہوں پر لٹکائے ڈبوں کی طرف بھاگتے ہیں۔ ڈبوں کی کھڑکیوں سے نورانی چہرے جھانکتے ہیں۔ لوگ حاجیوں کے ہاتھ چومتے ہیں، ان کی بلائیں لیتے ہیں۔ ان کے روبرو سر جھکا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ کوئی لفظ جو ان کے منہ سے نکلے اسے یوں دل کی ڈبیا میں رکھ لیتے ہیں جیسے وہ موتی ہو۔

سپیشل ٹرین سفر کرنے والے حاجیوں کو کھانے پینے کا فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بیشتر سٹیشنوں پر لوگ دیگیں دیگچے لیے منتظر ہوتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ حاجیوں کی خدمت کریں۔ جنھیں خود حاضری کی سعادت نصیب نہیں ہوتی وہ ان کی زیارت کو نیم حاضری سمجھتے ہیں۔

میرا جی چاہتا تھا کہ میں صبح سپیشل میں سفر کروں۔ لوگ میرے ہاتھ چومیں، میرے منہ سے نکلے ہوئے لفظ کو موتی سمجھ کر رکھ لیں۔ میری بلائیں لیں، میری آؤ بھگت کریں۔ لیکن مجھ میں اتنی جرأت نہ تھی کہ قیصر کو کہتا۔

جذبے کی راب:

جو کہہ دیتا تو قیصر قہقہہ مار کر ہنس پڑتا اور مجھے شرمساری ہوتی۔ قیصر جذبے کو

قابل تحسین چیز نہیں سمجھتا۔ وہ ایک عملی آدمی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مسلمان کو جذبہ لیے ڈوبا ہے۔ جذبہ عمل، کام اور جدوجہد کے راستے میں ایک عظیم رکاوٹ ہے۔ قیصر کے خیال مطابق سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ وہ کام جو تمہیں سونپا گیا ہے اسے دل لگا کرو، جان مار کر کرو، خوش اسلوبی، شوق اور اہتمام سے کرو۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دیانت سے کرو۔

میں نے ڈرتے ڈرتے قیصر سے کہا: "میں نے کہا چلو یار سٹیشن پر چل سپیشل کو دیکھیں۔"

وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا "حج سپیشل تو گاڑھے جذبے کی راب ہوتی ہے۔ اس میں ڈوب جاؤ تو کسی کام کے نہیں رہتے۔ لوگ اپنے جذبے کی راب سے حاجیوں کو لت پت کر دیتے ہیں، ان میں عظمت کا ایک جھوٹا احساس جگا دیتے ہیں، انہیں بندے سے بت بنا دیتے ہیں۔ ان کی انا کو پھر سے استوار کر دیتے ہیں۔ نہیں، ہم سٹیشن پر نہیں، جائیں گے"۔

اس کے بعد میرا جی چاہتا تھا کہ ابھی طیارے پر سوار ہو کر گھر جا پہنچوں۔ قیصر کی رفاقت میرے لیے نا قابل برداشت ہو گئی تھی۔

جیسے گئے ویسے لوٹے:

جب ٹکٹ کنفرم کرانے کے لیے ہم پی آئی اے کے دفتر پہنچے تو وہاں چند ایک دوست مل گئے۔ انہوں نے مجھے گھیر لیا۔

"اچھا تو حاجی صاحب تشریف لے آئے"۔ ایک بولا۔

دوسرا کہنے لگا: "نہیں، ان پر تہمت نہ لگاؤ۔ یہ تو غالباً دوبئی گئے تھے۔ حج پر گئے ہوتے تو چہرے پر یہ یبوست نہ ہوتی"۔

"یبوست تو نہیں" تیسرے نے کہا "رندی ہے، وہی پرانا رندانہ انداز ہے"۔

"جیسے گئے ویسے ہی لوٹ آئے" ایک نے قہقہہ مارا "جتھوں دی کھوتی اوتھے آن کھلوتی"۔ابن انشا ان میں پیش پیش تھے۔بولے "مفتی جی وہ آپ کی اتنی لمبی داڑھی کیا ہوئی، ہم نے تو سنا تھا کہ مفتی جی بالکل بدل گئے ہیں، داڑھی رکھ لی ہے، تہجد پڑھتے ہیں، ولایت سے نوازے جانے کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے، ہم تو ڈر گئے تھے لیکن شکر ہے اللہ کا کہ جیسے تھے ویسے ہی لوٹ آئے۔بچپن میں کوئی نیک عمل کئے ہوں گے جن کے صلے میں خطرہ ٹل گیا"۔

میں نے کراچی سے روانگی کی خبر کسی کو نہ دی تھی لیکن جب میرا طیارہ اسلام آباد پہنچا اور میں باہر نکلا تو پیرزادہ، راجہ، نور محمد، وانی، آغا سبھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے مجھے گھیر لیا۔میری گردن ہاروں سے لد گئی۔پیرزادہ نے ہٹ جاؤ ہٹ جاؤ کا نعرہ لگایا اور پھر اپنا کیمرہ نکال کر میری تصویریں کھینچنے لگا۔اس اہتمام پر خوشی کی ایک لہر دل میں دوڑ گئی۔دل بلیوں اچھلا لیکن مجھے محسوس ہونے لگا کہ بات نہیں بات بنی۔اہتمام تو تھا، پھولوں کے ہار بھی پہنے۔مسکراہٹوں بھرا خیر مقدم بھی تھا لیکن وہ تقدیس بھرا احترام نہ تھا۔میں نے کئی بار بہانے بہانے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن کسی نے اسے نہ چوما۔کوئی سینے پر ہاتھ باندھ کر میرے روبرو کھڑا نہ ہوا۔کسی نے میری بات کو موتی سمجھ کر نہ اٹھایا، کسی نے سبحان اللہ سبحان اللہ نہ کہا۔مجھے شک پڑنے لگا کہ وہ جانتے ہیں کہ میں جیسا گیا تھا ویسا واپس آ گیا ہوں۔ مجھے محسوس ہونے لگا جیسے وہ در پردہ مجھ پر ہنس رہے ہوں۔

وحید پیرزادہ نے وہی ابن انشا والی بات دہرائی۔بولا "آپ نے داڑھی کیوں منڈوا دی؟ اسے رہنے دیتے کیا حرج تھا"۔

"کون سی داڑھی؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جو آپ نے سرزمین حجاز پر رکھی تھی۔شہاب صاحب کہتے تھے، آپ نے

داڑھی رکھ لی ہے، چہرہ نورانی ہوگیا ہے۔انہوں نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا تھا''۔

''ہم تو سمجھتے تھے کہ ایک دوست ہاتھ سے گیا لیکن الحمد اللہ کہ کوئی خطرہ نہیں''۔راجہ نے کہا۔

جب میں گھر پہنچا تو اقبال بولی ''آ گئے! چلو اچھا ہوا، جیسے گئے تھے ویسے ہی آ گئے''۔

اقبال کٹر قسم کی مسلمان خاتون ہے۔وہ جذبے کے اظہار کو اچھا نہیں سمجھتی۔ اس کے نزدیک دنیا داری کو دیانت سے نبھانا اسلام کا سب سے بڑا مطالبہ ہے''۔

وہی ممتاز مفتی:

میرا خیال تھا کہ میری آمد کی خبر سن کر محلے والی آئیں گے لیکن کوئی بھی نہ آیا۔ انہیں علم ہی نہ تھا کہ میں حج پر گیا ہوا تھا۔

محلے والوں، گھر والوں اور دوستوں کی سرد مہری کی وجہ سے میرا دل بیٹھ گیا۔ اور وہ حاجی جسے میں بڑی امید اور امنگ سے اپنے ساتھ لایا تھا، عزیزوں کی سرد مہری کی وجہ سے سسک سسک کر دم توڑ گیا۔اس کا یہ انجام دیکھ کر میں نے انتقاماً اسی پرانے بوسیدہ غلیظ ممتاز مفتی کو نکالا اور اپنے آپ پر طاری کرلیا۔

''وہ شیشہ ہائے مے کشی
کہ مصلحت اسی میں تھی
جنھیں وہی پڑے پڑے
وہیں کی خاک کھا گئی
پھر ان کو ڈھو رہا ہوں میں
یہ کیا بنا رہا ہوں میں''

نہیں نہیں:

ہاں کبھی کبھار اکیلے میں، جب زندگی اک اکتاہٹ سی محسوس ہونے لگتی ہے تو ایک کالا بے ڈھبا کوٹھا سا ابھرتا ہے اور وہ آ کر چاروں طرف سے مجھے گھیر لیتا ہے۔ پھر وہ میرے گرد گھومتا ہے، گھومے جاتا ہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ مجھ سے کہہ رہا ہو: "آؤ، ایک بار پھر آ کر میرے گرد گھومو۔ ایک بار پھر میرے گرد پھیرے لو۔ کب آؤ گے، ہم انتظار کر رہے ہیں"۔

"نہیں نہیں، میں چیخ کر اٹھ بھاگتا ہوں۔ میں نہیں آؤں گا، میں نہیں آؤں گا، میں پھیرے نہیں لوں گا۔"

"مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے پھر حاضر ہو کر پھیرے لیے تو میں کبھی واپس نہیں آؤں گا۔ بلکہ وہیں ابد تک یوں گھومتا رہوں گا جیسے خلاء کا سیارہ ہو"۔

"نہیں نہیں، میں پھر نہیں جاؤں گا، نہیں جاؤں گا، میں لذت پرست نہیں بنوں گا۔"

"کالے کوٹھے کے گرد پھیرے لینا" سے بڑھ کر کوئی لذت نہیں، کوئی نشہ نہیں، کوئی کیف نہیں۔

تعارف

نذیر احمد

ممتاز مفتی ایوانِ آداب کا سربرآوردہ رکن ہے۔اس نے زندگی کے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔وہ تلخ و شیریں سے دوچار ہوا ہے۔مختلف النوع تجربات کے الاؤ سے گزرا ہے۔اس نے اپنے مشاہدات اور تجربات کو افسانے اور ناول کے واسطے سے قارئین تک پہنچایا ہے۔ ہر پڑھنے والے کے ذہن میں اس کا ایک غالب تصور ہے۔ باغی اور بت شکن کا تصور، ایک ایسا لکھنے والا جس نے زندگی کے چہرے پر پڑے دبیز پردوں کا چاک کر کے اصلیت کی مسلسل تلاش کی ہے۔معاشرتی رویوں پر چڑھے منافقت کے لبادوں کو تار تار کیا ہے۔کبھی طنز و مزاح کے ہتھیار سے اور کبھی متضاد واقعات،خیالات اور محسوسات کو فنکارانہ سیاق و سباق مہیا کر کے۔

بظاہر یہ حیرت انگیز بات معلوم ہوتی ہے مگر ہے امرِ واقعہ۔ممتاز جذباتی و فکری نہج پر جتنا باغی ہے،اظہار کے پیرائے میں وہ اتنا ہی روایت کا پاسدار ہے۔اس کی نثر میں ہمارے بلند پایہ نثر نگاروں کی گونج سنائی دیتی ہے۔اس کے فقرون کے آہنگ کے پیچھے توانا روایت جھلکتی ہے۔اس کی تحریروں میں ایک ایسی لے ہے جو اپنی باطنی قوت کے ذریعے قاری کے ردِ عمل کے اتار چڑھاؤ کو متعین کرتی ہے۔وہ اعلیٰ درجے کا صناع ہے اور واقعات و خیالات کو جوڑ اور گوندھ کر نامیاتی کل تیار کرتا ہے۔یہاں تک کہ باریک ترین جزئیات ہیئت و قیع کا جزو لاینفک بن جاتی ہیں۔ اس کے ہاں استعاروں اور تشبیہوں کی نوعیت زیادہ تر بصری ہے۔یہی وجہ ہے وہ زندگی کی کہانی صرف بیان نہیں کرتا بلکہ اس کی تصویریں بھی دکھاتا ہے۔ان میں رنگ بھرتا ہے۔کہیں گہرا کہیں ہلکا۔اس کے رنگوں میں قوسِ قزاح کی سی دلکشی اور جامعیت ہے۔

رپورتاژ "لبیک" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ممتاز کی صناعی پہلے کی طرح اب بھی تابناک ہے۔ نثر میں زور ہے، لے کا زیر و بم ہے، مشاہدے کی ہمہ گیریت ہے، ہیبت گری کا شغف برابر قائم ہے، جزرسی کا رجحان بھی جاری ہے مگر فن کے اس جادو کے پیچھے کارفرما نقطۂ نظر میں زبردست تبدیلی آچکی ہے۔ میں سب سے پہلے اس تبدیلی کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ اس کا تعلق ایک اہم فکری مسئلے سے ہے۔

زندگی ایک جھمیلا ہے...... بھول بھلیاں۔ کوئی ایک گلی کا اسیر، کوئی دوسری گلی میں گم۔ سب کو راستے کی تلاش ہے۔ باہر نکلنے کا راستہ۔ ایسے مقام کی جستجو جہاں پر کھڑے ہو کر زندگی کے اسرار کا مکمل مشاہدہ کیا جا سکے مگر سب راستے محدود لگتے ہیں۔

مطالعے، مشاہدے اور تجربے کی بنا پر برسوں بعد آدمی کو ایک ہیولیٰ نظر آتا ہے اور وہ اس تک پہنچنے کے لیے راہ وضع کرتا ہے، چلتے چلتے ہیولیٰ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی راہ بھی گم۔ برسوں کی ریاضت سے ادراک کے دائرے میں آنے والی حقیقت واہمے میں بدل جاتی ہے۔ تاریکی ہی تاریکی! اور پھر گھپ اندھیرے میں روشنی کا کوندا۔ ازسرِنو تلاش کا سفر!! کیا معلوم اس کا نتیجہ بھی مختلف نہ ہو۔ شاید زندگی واہموں کا دھارا ہے۔ جو موت کے ساکت سمندر میں جا گرتا ہے۔

مگر ممتاز مفتی کا اندازِ نظر منفی کبھی نہیں رہا۔ وہ ہمیشہ مثبت باتوں اور رویوں پر زور دیتا رہا ہے۔ وہ آنکھوں کی پلکوں اور تخیل کی انگلیوں سے ہمیشہ حقیقت کا متلاشی رہا ہے۔ تلاش اور رجائیت سے اس کی افتادِ طبع کا صحیح سراغ ملتا ہے۔ اس لیے جب ایسے شخص کا استوار کیا ہوا حقیقت کا مینار گرتا ہے تو وہ مایوسی کا شکار نہیں ہو سکتا۔ وہ

ایک اور مینار کھڑا کرتا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ ممتاز مفتی حقیقت کے مینار کو منہدم کر کے نور کا مینار استوار کرنے میں مصروف ہے۔ "لبیک" اسی تخریب و تعمیر کا رپورتاژ ہے۔ ممتاز کے لہجے میں بیک وقت احساس شکست بھی ہے اور احساس فتح مندی بھی، ناستیلجیا اور فینٹسی کا دلچسپ کا امتزاج!

میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ ممتاز مفتی کا دوسرا سفر کب شروع ہوا؟ مگر ایک قاری کی حیثیت سے مجھے سب سے پہلے اس وقت جھٹکا لگا جب میری نظر سے وہ مضمون گزرا جو اس نے چند برس قبل شہاب کے افسانوں کے مجموعے "ماں جی" کی تعارفیہ تقریب کے موقع پر پڑھا تھا۔ اور پھر میں اپنی یادداشت کو ٹٹولا۔ قیاس ہے کہ اس میں یہ تبدیلی ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ شروع ہوئی۔

زیر نظر رپورتاژ کے ایک حصے میں ممتاز نے ان مصنفین کا ذکر کیا ہے جن کے زیر اثر اس کی طبیعت میں بغاوت کا جذبہ پروان چڑھا اور اس نے ہر روایتی ڈھانچے کو بشمول مذہب کے، شک کی نظر سے دیکھا۔ مگر یہ ذکر سرسری ہے۔ رپورتاژ اصل میں معرفت کے اس دروازے سے متعلق ہے جو اس کے دوسرے سفر کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس سفر میں اسے کیا ہاتھ لگا؟ میں چند نکات کی شکل میں درج کرتا ہوں۔

۱: موجودات کی کثرت محض وحدت کا پردہ ہے۔

۲: وحدت حقیقت ہے اور کثرت بھول بھلیاں۔

۳: وحدت تک رسائی وجدان کے ذریعے ممکن ہے۔ عقل صرف بھول بھلیوں میں کھو کر رہ جاتی ہے۔

۴: معروف اور معلوم کا احاطہ ناقابل یقین حد تک تنگ ہے۔ نہ معلوم اور

پُراسرار حقیقت وسیع و عریض ہے۔

۵: اسرار کا پتہ چلانا ہر کس و ناکس کے اختیار میں نہیں۔ اس سلسلے میں نور کا سب سے بڑا مینار رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔

۶: اس نور سے اخذ فیض کرنے والے لوگ معدودے چند ہیں جو دنیا میں ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔

ان مراتب کا ایک سلسلہ ہے اور ان میں سے ہر ایک پاس حسب مرتبہ ابلاغ کا ایک واسطہ ہے۔ یہ واسطہ متصوفانہ ریاضت کا ثمر ہے۔ چنیدہ لوگوں کا یہ گروہ خدا سے خاص تعلق رکھتا ہے۔ اس تعلق کی وجہ سے ان کا باطن زمانوں پر محیط حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ مستقبل کے طرازان کی نظر میں ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کا ایک الوہی رول ہے جس کے باعث وہ عصری واقعات کے بہاؤ پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اپنے اردگرد بکھرے ہوئے جاہل، بے خبر اور اندھے عوام الناس میں ان کے ظرف کے مطابق روشنی اور فیض بانٹتے ہین۔

قدرت اللہ شہاب انہی لوگوں میں سے ایک ہے۔

رپورتاژ میں شہاب کی شبیہ بار بار ابھاری گئی ہے۔ وہ ربانی بے نیازی کا مجسمہ ہے مگر حال کی کیفیت میں اسرار کے بوجھ تلے شیشے کی طرح تڑخ جاتا ہے، اپنے آپ کو چھپاتا پھرتا ہے۔ صرف دو شخص دانائے راز ہیں، ممتاز مفتی اور ڈاکٹر عفت!

مندرجہ بالا نکات بڑی حد تک اس تصورِ حیات کی نفی کرتے ہیں جس کی ترسیل ممتاز نے اپنے فن کے ذریعے گذشتہ تقریباً بیس برسوں سے کی ہے۔ یہ علیحدہ موضوع ہے اور نہایت دلچسپ۔ میں اس سے قطع نظر کرکے سرِ دست ممتاز کے نسبتاً نئے زاویۂ نگاہ کے مضمرات پر توجہ مرکوز کرنا چاہتا ہوں۔

سترھویں صدی عیسوی سے لے کر بیسویں صدی تک ...... یہ زمانہ انسانی تاریخ کا وہ حصہ ہے جس میں زیادہ تر سائنس پر تکیہ کیا گیا ہے۔ مایوسیوں اور محرومیوں کے باوجود مجموعی طور پر رجائیت اور اعتماد کی فضا برابر قائم رہی ہے۔ یہ بجا ہے، اور اس فضا میں خوف اور عدم تحفظ کے گھنے بادل بھی اُمڈ آئے ہیں، موت کے سائے بھی در آئے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تعمیر و تخریب کی کائناتی ابدی ثنویت مکمل نہ ہوتی۔ مگر تخریب کے عمل کو تخلیق کے عمل کے خلاف بطور دلیل کے نہیں برتا جاسکتا۔ انسان نے عقل و خرد کے سرچشموں سے فیض یاب ہو کر کائنات میں جاری و ساری تخلیقی اصول سے حیرت انگیز ہم آہنگی حاصل کر لی ہے اور وہ کائنات کی وسعتوں میں پھیل رہا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ علم کی روشنی سے سب کچھ منور ہو گیا ہے یا ہو جائے گا بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ سائنس کا علم جتنا وسیع ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ اسے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔ ایک اس وجہ سے کہ کائنات روز بروز انسان کی توقع سے کہیں زیادہ وسیع نکلتی ہے۔ دوسری اس وجہ سے کہ کائنات ایک نہ ختم ہونے والے تخلیقی عمل سے گزر رہی ہے۔ جب تک سائنس دان پرانے روپوں سے واقف ہوتا ہے، نئے روپ دو گنے ہو جاتے ہیں۔ اقبال تو خود انسان کو اس تخلیقی عمل میں حصہ دار بتاتا ہے۔

جدید سائنس کی دریافتوں کا دائرہ کتنا محدود ہے، اس کو بیان کرنے کے لیے میں کوسٹلر کے خوبصورت جملے کا سہارا لیتا ہوں:

MOOREN SCENTISTS ARE PEEPING
TOMS AT THE KEYHOLE OF ETERNITY

وجدان کو عقل کا ہراول دستہ کہا جانا چاہیے، نہ کہ اس کا نعم البدل! وجدان کے مسخر علاقوں پر جب تک خرد کے خیمے نصب نہ ہوں وہ مبہم اور معاشرتی طور پر غیر

متعلق رہتے ہیں۔ عقل کی نفی کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ہم اپنے آپ کو وجدان کے فیض کا نا اہل بنا لیں اور زندگی کو، کم از کم اپنے لیے، انفرادی اور اجتماعی سطح پر منجمد کر دیں۔ حرکت اور تبدیلی سے منہ موڑ لیں اور یوں تاریخی طاقتوں سے منقطع ہو کر زندگی کے دائم رواں دواں قافلے سے جدا ہو جائیں۔ ایسی جدائی کا عذاب ہم نے طویل عرصے تک جھیلا ہے۔ یہ واقعہ بے سبب نہیں کہ ہجر و فراق کا موضوع ہمارے ادب میں اتنا حاوی رہا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ اب وصل کی باتیں ہوں۔ وصل کسے پسند نہیں؟ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ہم نے اس کے لیے حسرت زیادہ پالی اور کوشش کم کی ہے اور:

لیس للانسان الا ما سعی!

جب سے نطشے نے خدا کی موت کا اعلان کیا ہے، خدا کی تلاش مشرق و مغرب میں تیز تر ہو گئی ہے۔ اس ضمن میں تمام علمی کاوشوں کا نتیجہ غالباً یہ ہے کہ خدا کی تلاش کا موثر ترین ذریعہ کائنات میں جاری و ساری تخلیقی اصول سے ہم آہنگی ہے تاکہ تخلیق کا عمل زیادہ بھرپور ہو سکے اور موت کے راستے مسدود کیے جا سکیں۔ یہ فعل اجتماعی نوعیت کا ہے اور اس کے لیے فرد کے پیرانارمل (PARANORMAL) تجربات اور محسوسات پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات تو قابل فہم ہے کہ افراد اپنے شعور یا اپنی بصیرت کی وسعت یا تنگ دامنی کی بنا پر کم مرتبہ یا بلند مرتبہ ہوتے ہیں، مگر ان کو پر اسرار محسوسات کے حوالے سے درجوں میں تقسیم کرنا اور زندگی کی پوری ڈگر کو ان کا مرہون منت قرار دینا کہاں تک صحت مند رویہ ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا۔ خیر یہ کوئی اہم بات نہیں۔ میری سمجھ میں تو چھوٹے چھوٹے معاملے بھی نہیں آتے۔ اصل بات یہ ہے کہ انسانیت کا معتد بہ حصہ اس رویئے کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ کم از کم تعلیم یافتہ روشن خیال انسانیت کا معتد بہ حصہ۔

مجھے خدشہ ہے کہ اس کی خواہشات اور ارادوں کے برعکس اس معاملے میں ممتاز مفتی کا انداز فکر ایسے اداروں کے لیے باعث تقویت ہے جن کا کردار ہمیشہ سے عوام کے لیے گمراہ کن رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آخری تجزیئے میں اس انداز فکر کے ڈانڈے PRIESTHOO کے اس تصور سے جا ملتے ہیں جو اسلام کی روح کے منافی ہے اور جس کے خلاف اسلامی مفکرین نے مسلسل جہاد کیا ہے۔

اس جملہ معترضہ کے بعد ''لبیک'' کے ایک منفرد پہلو کا ذکر کرتا ہوں۔

ممتاز مفتی نے جس خوبصورتی سے اللہ اور رسولؐ کی افسانوی تشکیل پیش کی ہے اس کی داد نہ دینا نا انصافی ہوگی۔ گو ممتاز نے مقامات مقدسہ سے متعلق تمام تفصیلات اور عبادات کی جزئیات رپورتاژ میں سمودی ہیں تاہم اس کا ارتکاز اس داخلی تجربے پر ہے جس میں سے تمام زائرین گزرتے ہیں۔ ایک تو پورے اجتماع کا اعتقاد کی خارجی تصویر ہے، دوسرے اس تعلق خاطر کی تصویر ہے جو زائرین حسب توفیق اللہ اور رسولؐ سے ایمانی اور جذباتی سطح پر محسوس کرتے ہیں۔ اس تجربے میں سینکڑوں درجے ہیں اور ممتاز نے بڑی چابک دستی سے ان کا نقشہ کھینچا ہے۔ روضہ نبوی اور حرم شریف کو رپورتاژ میں تخیلی پیکر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جو باہمی کشش سے ایک دوسرے کی طرف حرکت کر کے اس نقطۂ ساکت (STILL POINT) کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جس کے اردگرد دلوں کی دھڑکنیں اور زمانوں کے سمٹتے پھیلتے دائرے ہیں۔ ان دائروں کے اندر مختلف تاریخی ادوار میں اور مختلف رنگ و نسل کے لوگ ایک ہی نوع کے تجربے سے گزرتے ہوئے اسلامی یگانگت اور مساوات کی دل پذیر مثال نظر آتے ہیں۔ ممتاز نے داخلیت اور خارجیت کے امتزاج سے تجربے اور مشاہدے کا ایک جہان پیدا کیا ہے جس میں سانس لیتے ہوئے عجیب سرشاری کی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔

جذب وایمان کے ان دائروں کے باہر زندگی کا حقیقی رنگ بھی نظر آتا ہے۔ حرص ولالچ کا بازار، نفسانفسی کا عالم، نفس پرستی کے مناظر اور سب سے بڑھ کر مغربی تہذیب کے اثرات جن سے مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کی مقدس سرزمین کی رعنائی اور اصلیت مسخ ہوگئی ہے۔

گو مجھے ''لبیک'' میں مضمر بعض فکری مباحث سے شدید اختلاف ہے تاہم فنی نقطۂ نظر سے اس رپورتاژ کی اس تاثیر سے انکار کرنا کفر ہوگا۔ جہاں تک مجھے معلو ہے حج کے بارے میں اس سے زیادہ بامعنی، فکر انگیز اور فن کارانہ رپورتاژ اردو میں نہیں لکھا گیا۔ اس صنف کی ذیل میں ہمارے ہاں جو قلیل اثاثہ موجود ہے ممتاز مفتی نے اس میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

ذوالفقار احمد تابش

۲

''لبیک'' ...... ممتاز مفتی کا رپورتاژ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کی اشاعت کی داستان تو آپ قاسم محمود کی زبانی سنیں گے۔ میں تو ایک مشتاق اور منتظر قاری کی طرح اس کی قسطیں سیارہ ڈائجسٹ میں پڑھتا رہا ہوں۔ پھر جب اس کی اشاعت کا مرحلہ آیا تو مجھے اس کا مسودہ پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، اس لیے کہ مفتی صاحب نے مجھے اس کا دیباچہ لکھنے کا حکم دیا تھا۔ سرتابی کی مجال نہیں تھی ورنہ مجھے اب تک علم نہیں کہ اس کے لیے میرا ہی انتخاب کیوں کیا گیا۔

مفتی صاحب کا یہ رپورتاژ پیچیدہ، تہ در تہ اور پردہ در پردہ معانی کی ایک ایسی ودیسی ہے جس کی مثال کم از کم میرے سامنے نہیں ہے۔ ویسے معلوم نہیں کیوں مفتی صاحب کو حجابات، پردوں اور تہوں سے اتنی دلچسپی ہے۔ آپ جانتے ہیں ان کے ایک مجموعے کا نام ''پیاز کے چھلکے'' ہے۔

پہلے ممتاز مفتی اپنے قلم کی تیز نوک سے نفس انسانی کے پیاز سے چھلکا چھلکا اتار کر اس کے درون دیکھنے کے شوق میں مبتلا تھے۔ اب ان کے شغف میں ذرا سی تبدیلی واقع ہوئی ہے اور آج کل وہ روح انسانی پر سے مرئی اور غیر مرئی پردے اتار کر پردوں کے پیچھے چھپے ہوئے کو فاش کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

کرید، تلاش، جستجو، محجوب کو عریاں کرنے کی خواہش، چھپے ہوئے کو فاش کرنے کی آرزو، پوشیدہ کو ظاہر میں لانے کی تمنا مفتی صاحب کی فطرت میں یوں موجود ہے جیسے پانی نمی...... یہ تحقیق اور جستجو یوں تو شاید ہر انسان کی سرشت کا حصہ ہے کہ میرے خیال میں زندگی بنیادی جوہر یہی ہے، لیکن بعض لوگوں کے خمیر میں یہ عنصر معمول سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو تین محفوظ سمتوں کی جانب سفر کرنے کی بجائے چوتھی سمت کی طرف جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایسے ہی سر پھرے لوگوں میں ایک ممتاز مفتی ہیں جو چوتھی سمت کے سفر میں اپنے پیروں کے تلوے لہولہان کر رہے ہیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مفتی صاحب اچھا بھلا افسانہ لکھتے لکھتے اب قلمی شعبدہ بازی پر اتر آئے ہیں۔ چونکہ اب ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا اس لیے انہوں نے لوگوں کو من گھڑت قصے اور مافوق الفطرت کہانیاں سنانی شروع کر دی ہیں۔ کچھ اصحاب تو یہ بھی کہتے ہیں کہ بڑھاپے میں مفتی صاحب اب تخلیقی طور پر بانجھ ہو چکے ہیں۔ اب وہ محض اپنی تخلیقی حس کی تسکین کے لیے کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑتے رہتے ہیں...... ان چہ میگوئیوں کا آغاز اس وقت ہوا جس "سویرا" میں مفتی صاحب کا ایک مضمون "میں اور میرے اللہ میاں" شائع ہوا۔ ذاتی طور پر مجھے ان آراء سے اختلاف ہے۔ میں تخلیقی حاصل کی کسی ٹھوس اور جامد شکل کا قائل نہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ مفتی صاحب جس راہ پر پہلے چل رہے تھے اسی پر گامزن ہیں۔

جس مشغلے میں وہ اب تک رہے ہیں اسی میں منہمک ہیں۔انہیں تو شروع ہی سے پیاز سے چھلکے اتارنے کا شوق ہے اور وہ اب تک چھلکے اتارتے جا رہے ہیں اگر کوئی فرق پڑا ہے تو محض اتنا کہ پہلے ان کے ہاتھ میں سرخ رنگ کا پیالہ تھا، اب سفید رنگ کا ہے۔

ممتاز مفتی کا یہ رپورتاژ پڑھ کر جانے مجھے قرآن پاک کی وہ تمثیل کیوں بار بار یاد آئی۔جس میں حضرت موسیٰ اور حضرت خضرؑ کے ایک عجوبہ سفر کا بیان رقم ہوا ہے۔ یہ داستان مجھے یوں بڑی مرغوب ہے کہ اس میں علم، تحیر اور عجز کے عناصر اس طرح باہم آمیز ہیں کہ عقلیں گنگ اور شعور شل ہو جاتے ہیں۔ایسا اسرار، ایسی پردہ داری، ایسا حسن اور ایسا اعجاز!......اس فر کے دو مسافروں میں سے ایک جانتا ہے کہ اسے بتانے والے نے گزرے ہوئے اور آنے والے لمحوں کے اسرار سے آگاہی بخش رکھی ہے۔وہ علم رکھتا ہے اور متین ہے......دوسرا نہیں جانتا اس لیے اس کے حصے میں تحیر آتا ہے۔تحیر پے در پے سوالوں، معلوم کرنے اور جاننے کی شدید آرزو کو جنم دیتا ہے۔خضر کی متانت اور خموشی اور موسیٰ کا تحیر اور اضطراب جب اپنے انجام کو پہنچتے ہیں تو عجز وجود میں آتا ہے۔عجز اللہ کو پسند ہے چنانچہ وہ بندے کو سکھانے کے لیے اسے بڑے چکر دیتا ہے۔بندہ جو سوچتا ہے، جو کرتا ہے، جو کرنا چاہتا ہے۔جس کے ارادے باندھتا ہے وہ اسے زیر و زبر کر کے ایسی گھمن گھیری میں ڈالتا ہے کہ بندے کے سامنے عجز کے سوا کوئی راستہ نہیں رہتا۔حضرت علیؓ نے کہا تھا:

"مجھے اپنے عزائم کی ناکامی سے اپنے رب کا عرفان حاصل ہوا ہے"۔

اس رپورتاژ میں بھی مجھے یوں لگا جیسے قدرت اللہ شہاب جانتے ہیں اور چپ ہیں۔ممتاز مفتی استفسار کرتے ہیں اور مضطرب ہیں، جاننے اور معلوم کرنے کی خواہش انہیں ہر بل آتش زیر پا رکھتی ہے۔شاید یہی سبب ہے کہ وہ جا بجا اکھڑ جاتے

ہیں۔صبر وضبط کا دامن ان کی گرفت سے بار بار نکل جاتا ہے اور وہ گلہ گزاری سے لے کر چاک دامانی تک اتر آتے ہیں۔ایسے موقعوں پر کبھی تو مجھے شہاب صاحب پر ترس آتا ہے کہ مفتی صاحب کی رفاقت نے انہیں کس عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے اور کبھی ممتاز مفتی صاحب پر رحم آتا ہے کہ شہاب صاحب انہیں کیوں اس آتش وارفتہ سے آشنا کر دیا جو انسان کے مکمل وجود کو خاکستر کر دینے پر قادر ہے۔پھر کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے شہاب کو متوازن رکھنے کے لیے توازن دینے والے ممتاز مفتی کو ساتھ نتھی کر دیا ہے کہ کہیں شہاب صاحب بالکل ریزہ ریزہ نہ ہو جائیں، کہیں ان کا وجود تحلیل نہ ہو جائے۔پھر کبھی مجھے احساس ہوتا ہے کہ مفتی صاحب جیسے مضطرب، متجسس اور چھلکے اتارنے کے شوقین کو قدرت اللہ شہاب صاحب کی ہمراہی اس لیے دی گئی ہے کہ انہیں علم، تحمل، عمق اور عجز کے معنی سمجھ میں آ جائیں۔

اس کتاب میں قدرت اللہ شہاب کی تصویر ایک غیر معمولی انسان کی تصویر کے طور پر ہمارے سامنے آتی ہے۔جن لوگوں نے شہاب صاحب کو دیکھا ہے، اور ہمارے ملک کے لاکھوں لوگوں نے انہیں دیکھا ہے، ان کے لیے یقیناً یہ تصویر اجنبی ہوگی۔شہاب صاحب یہاں کسی سالک، کھلی آنکھوں والے اور روشن ضمیر کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ایک پرانے آئی۔سی ایس، ایک مقتدر سابق سی ایس پی، پاکستان کی بیوروکریسی کے ایک نہایت اہم اور فعال شخص کے بارے میں مفتی صاحب جو کچھ بیان کرتے ہیں اس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔یوں لگتا ہے جیسے مفتی صاحب سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ان کا غیر معمولی انسان کے طور پر امیج بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔جیسے ان کی نامعلوم نوازشات کا بدلہ چکانے کی سعی کر رہے ہوں۔شہاب کو وہ بنا کر پیش کر رہے ہیں جو وہ نہیں ہیں یا نہیں ہو سکتے ...... مفتی صاحب کے بیانات پر بھلا کسے شک نہیں گزرے گا لیکن میں سوچتا ہوں

کہ اس بات کا بھلا کسے پتہ کہ کون کیا ہے؟ اندر اور باہر کے راز کون جانتا ہے؟ کوٹ پتلون کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے، خرقہ و عبا و قبا کے عقب میں کون مستور ہے۔ کسے معلوم؟...... شہاب صاحب کے سلسلے میں مفتی صاحب جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ عجیب سہی، غیر معمولی سہی لیکن اس کی تردید کے لیے میرے اور آپ کے پاس کیا ہے۔ کیا صرف یہ کہ قدرت اللہ شہاب "صاحب" آدمی رہے ہیں، حکومت کے اہم اور معتمد کارندے تھے، انہیں کئی حکومتوں میں کلیدی عہدے حاصل رہے ہیں، انہیں حکومت کے کئی سربراہوں کا اعتماد میسر رہا ہے؟ کیا یہ ثبوت، یہ دلائل کافی ہیں کہ ان کے سہارے شہاب صاحب کے ایک غیر معمولی انسان ہونے کی تردید کی جا سکے۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ انسان، بلکہ انسان ہی کیوں، اس کائنات کی ہر شے جو کچھ نظر آتی یا محسوس ہوتی ہے، اس سوا بھی بہت کچھ ہو سکتی ہے، اور ہوتی ہے۔

ویسے ان چار یاروں کی ٹولی ہے بھی بڑی طرفہ، مختلف مزاجوں، جدا جدا طبیعتوں والے ان چہار درویشوں کو میں نے جتنا دیکھا ہے وہ میرے لیے حیران ہونے کا خاصا سامان رکھتا ہے...... شہاب صاحب، اشفاق احمد، ابن انشاء اور ممتاز مفتی۔ یہ منڈلی بڑی عجیب ہے۔ دیکھیں تو چاروں میں کوئی قدر مشترک نہیں، مگر چاروں کی مثال مربع شکل کے ان چار کونوں کی ہے جو ایک دوسرے سے الگ الگ بھی ہیں اور ایک دوسرے کو یوں تھامے ہوئے بھی ہیں کہ اسی تھام سے ان کا وجود قائم ہے۔ شہاب صاحب کے بارے میں ان کے تینوں دوستوں سے میں نے جو کچھ سنا اور پوچھا ہے وہ اپنی جگہ کمال کی چیز ہے۔ ان میں ہر ایک ان کے سلسلے میں الگ رائے رکھتا ہے۔ اشفاق احمد ویسے تو قائل ہیں کہ شہاب صاحب ایک پراسرار شخصیت ہیں اور اپنا آپ کبھی کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ وہ ان کے چند پوشیدہ پہلوؤں اور اوجھل حصوں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ وہ دوستی کے ناطے سے اپنے

کچھ مشاہدات بھی بیان کرتے ہیں جو اتفاقاً ان کی نگہ کی زد میں آ گئے ہیں، لیکن ان کے رویئے میں ایک ٹھہراؤ، لاتعلقی اور بے پروائی ہے۔ غالباً انہوں نے شہاب صاحب کی شخصیت کے ظاہر اور پوشیدہ پہلوؤں کے بارے میں ذہنی سمجھوتہ کر لیا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ وہ شہاب صاحب کے پرتو کی حدت سے بچے ہوئے ہیں ورنہ ان کا حشر بھی ممکن ہے مفتی صاحب جیسا ہوتا۔ ممتاز مفتی نے شہاب صاحب کو بے حد قریب سے دیکھا ہے۔ شاید اتفاقاً انہیں اس کا موقع زیادہ ملا ہے۔ وہ ان کے چشم دید گواہ ہیں۔ انہوں نے شہاب صاحب کے ایسے روپ آنکھوں سے دیکھے ہیں جو دوسروں پر ظاہر نہیں ...... لیکن اس دیدہ بازی میں ممتاز مفتی مارے گئے۔ وہ شہاب صاحب کی خاموشی، گہرائی، عمق اور اسرار کو سمجھنے کی کوشش میں مبتلا ہیں۔ وہ چھپے ہوئے کو چھو کر دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ انہیں بے نقاب دیکھنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے وہ بیک وقت اضطراب اور جھلاہٹ کا شکار ہیں۔ وہ پیاز سے چھلکا اتارنا چاہتے ہیں مگر غالباً یہ پیاز ان کے بس کی بات نہیں ...... پھر ابن انشاء ہیں، شہاب صاحب کے بہت ہی قریبی دوست ...... راز دار اور غمگسار ...... ان سے ایک بار میں نے شہاب صاحب کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے بڑی بے نیازی سے کہا:

''شہاب صاحب سے ہماری دوستی اور وضع کی ہے۔ اشفاق اور ممتاز مفتی کی طرح مجھے ان کی شخصیت کے اس گوشے سے کوئی دلچسپی نہیں جس کے یہ دونوں عاشق ہیں۔ میں تو شہاب صاحب کو ایک خوبصورت اور مکمل انسان سمجھتا ہوں۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔ یوں بھی ان کے روحانی مراتب اور رمال کا محکمہ الگ ہے۔ اس سے ہمیں کچھ تعلق نہیں یا یوں کہیے کہ اس میں ہمیں درک نہیں۔ ممتاز مفتی کی طرح ہم ان مسائل کے غواص نہیں، ہونا چاہتے، کپڑے بھگونا نہیں چاہتے۔

ساحل پر رہنا پسند کرتے ہیں، کئی بار قوی شبہ ہوا کہ شہاب صاحب جو کچھ نظر آتے ہیں اس کے علاوہ بھی کچھ ضرور ہیں لیکن تحقیق و تجسس کی تکلیف کبھی گوارا نہیں کی''۔

میرا اپنا بھی یہی خیال ہے کہ ابن انشاء کا شہاب صاحب سے بالکل اور وضع کا تعلق ہے۔ مگر اشفاق اور مفتی صاحب ان کے رمز شناس ہونے کے باوجود عجیب رویہ رکھتے ہین۔ اشفاق احمد تو اس لیے شہاب صاحب سے آنکھیں چراتے ہیں کہ کہیں ان کی شخصیت میں چھپے ہوئے آتش سوزاں کی کوئی آوارہ چنگاری ان کے خرمن کو بھی نہ پھونک ڈالے۔ ایک روز میں نے کہا:

''آپ تصوف، ماورائے نفسیات اور مابعد الطبیعات میں اتنی دلچسپی بھی لیتے ہیں، اور بے تحاشا پڑھتے بھی ہیں مگر آپ کے بقول آپ کا یہ شوق صرف اکیڈمک سطح تک ہی ہے۔ ذرا اس میدان میں اتر کر بھی دیکھیے۔ تھوڑی سی سیاحت اس وادی پر خار کی بھی ہو جائے۔''

بولے۔ ''ہرگز نہیں۔ مجھ میں اتنی جرأت نہیں، یا میں کم از فی الحال یہ جرأت نہیں کر سکتا۔ میری مثال سینٹ آگسین کے اس قول کی سی ہے کہ

"GOD, MAKE ME PIOUS BUT NOT TODAY"

ویسے اشفاق احمد، شہاب صاحب کے اثر سے زیادہ دیر تک بچ نہ سکیں گے۔ وہ ایک روز اس سمت کا سفر اختیار کریں گے یا انہیں کرایا جائے گا۔ ویسے فی الحال میں دیکھتا ہوں کہ اشفاق احمد کی مثال اس بچے کی سی ہے جو بکری کے میمنے کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اسے چنگیاں مارتے دیکھ کر اس پر فریفتہ ہوتا ہے لیکن اس کے قریب جانے کی، اسے چھونے کی جرأت نہیں کرتا۔

یہ کتاب ان ہونے والے واقعات اور غیر معمولی مشاہدات سے بھری پڑی

ہے۔ ایسے واقعات اور مشاہدات جو عقل کی گرفت میں نہیں آتے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ سائنس اور علم کے زیرِ اثر دماغوں کے لیے یہ باتیں ناقابلِ یقین ہوں گی حالانکہ یوں بھی سوچا جا سکتا ہے کہ آخر ہونا کیا ہے اور انہونا کیا ہے..... کسے پتا؟..... کیا ہے اور کیا نہیں ہے..... اس کی دلیل کس کے پاس ہے؟ جو یہاں ہے وہ کہاں نہیں ہے اور جو یہاں نہیں وہ کہاں ہے، اس کا علم کسے میسر ہے؟

راولپنڈی کا مجذوب، چنیوٹ کا ایڈووکیٹ، مدینہ منورہ کی حمیدہ بیگم اور بدر کا شہید یہ سب کون لوگ ہیں، کیوں ہیں؟..... ان سوالوں کا جواب کس کے پاس ہے۔ ہمارے علم کی حدوں سے اگر ان کا تعلق نہیں قائم ہوتا تو کیا ہمارے علم کی حدیں آخری حدیں ہیں۔ کیا ان حدوں سے آگے اور حدیں نہیں ہو سکتیں؟ کیا ایک افق سے آگے اور افق نہیں ہو سکتے؟ میرا خیال ہے کہ ہو سکتے ہیں بلکہ ہوتے ہیں۔ موسیٰؑ اور خضرؑ کی داستان ذرا پھر پڑھ کر دیکھیے، شاید عجز کی خوشبو ہمیں بھی چھو جائے۔

ویسے ذاتی طور پر میں سوچتا ہوں کہ ممتاز مفتی نے یہ رپورتاژ لکھ کر اچھا نہیں کیا۔ انہوں نے جو کچھ مشاہدہ کیا ہے، جو کچھ ان کے محسوسات کی گرفت میں آیا ہے، جو کچھ انہیں بتایا گیا ہے، جو امانت انہیں سونپی گئی ہے، جس راز میں انہیں شریک کیا گیا ہے اسے یوں فاش بھی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ انہوں نے دیدار اور وصال کی واردات سینے میں رکھنے کی بجائے چوک میں لا کر سجا دی ہے۔ ایسی باتیں جو چھپ چھپ کر کرنے والی تھیں، جو سرگوشی میں بتاتے ہوئے بھی ڈرنا چاہیے تھا وہ انہوں نے چار کھونٹ نشر کر دی ہیں۔ اب "ذکلی ہونٹوں چڑھی کوٹھوں" والی صورت پیش آئے تو کسی کا کیا قصور..... لیکن یہ قصور کا مسئلہ بھی خوب ہے۔ قصور کس کا ہے اور کس کا نہیں ہے؟..... میں سوچتا ہوں کہ شاید جس کی تشہیر ہوئی ہے وہ خود اپنی تشہیر

کروانا چاہتا ہو۔ شاید وہ پردے میں رہتے رہتے اب تنگ آ گیا ہو۔ ورنہ مفتی صاحب کی کیا مجال کہ اس راز کو یوں افشا کرتے۔ یہ تو محض آلۂ کار بن گئے۔ شاید اس لیے کہ وہ اور بہت کچھ ہونے کے ساتھ ساتھ احسن الماکرین بھی تو ہے۔

کچھ بعید تو نہیں کہ اس کتاب کی اشاعت سے مفتی صاحب کو ڈھیروں گالیاں پڑیں۔ ان پر فتوے لگیں۔ اس کتاب کو BAN کرنے کی سفارش کی جائے۔ ان میں سے کچھ بھی ہو یا سب کچھ ہو، مجھے ذرا تعجب نہ ہوگا کہ وہ ایسے تماشے خود ہی کرتا ہے اور خود ہی دیکھتا ہے۔ پتا نہیں اسے تماشے اتنے کیوں مرغوب ہیں۔ یہ جہان، اس کا سارا کاروبار، یہ ساری کائنات اور اس ہاو ہو تماشا ہی تو ہے۔ دلچسپ، دل کش، خوف ناک، عقل کی بنیادیں ہلا دینے والا تماشا۔ اور سب سے بڑے تماشے تو وہ ان کے بناتا ہے جنھیں وہ بہت عزیز رکھتا ہے۔ نبیوں کے باپ سے کہتا ہے کہ ہونے والے نبی کے گلے پر چھری چلا دے۔ وہ چلاتا ہے تو اسے بچا بھی لیتا ہے۔ اپنی ایک جھلک کا ہلکا سا عکس دکھا کر موسیٰ کو پہاڑ پر بلاتا ہے۔ اور اس کے سر پر نبوت کی گٹھڑی رکھ دیتا ہے۔ موسیٰ لاکھ ہاتھ جوڑتے ہیں۔ واسطے دیتے ہیں۔ فریاد کرتے ہیں، مجھے نبوت کی حاجت نہیں۔ میرے بھائی کو نبی بنا دے۔" مگر گٹھڑی انہی کے سر پر ٹکا دی جاتی ہے۔ اپنے سب سے محبوب اور عزیز رسول کو طائف کے بھرے بازاروں میں لہولہان کرا دیتا ہے۔ دیکھا آپ نے کیسا تماشا گر ہے۔ سو مفتی صاحب پر افشائے راز کی تہمت بھی لگائی جائے تو کیونکر۔ مفتی صاحب کی کیا بساط کہ ایسی جرأت کر سکتے۔

"لبیک" ایک بے مثل کتاب ہے۔ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی انوکھی اور نادر کتاب ہے۔ یوں بھی کہ اسے ایک بے مثل انسان نے لکھا ہے۔ یہ انسان بھی انوکھا اور نادر ہے۔ یہ کتاب باہر سے اندر کی جانب سفر کی روداد ہے۔ یہ

حاضر کے زوج غائب کی تصویر ہے۔ یہ ظاہر کے ہمزاد باطن کی کہانی ہے۔ یہ ساتویں سمت کے سفر کی داستان ہے جہاں زمان و مکان کی حدود اٹھ جاتی ہیں۔ یہ وقت اور زمانے کی کسی اور ہی DIMENSION کا قصہ ہے۔ یہ عشق اور سرمستی، محبت اور وصال کی حکایت ہے۔ وہ لوگ جو مائیکرو ملی میٹر والے پیانے، ٹیسٹ ٹیوبیں، محدب شیشے اور ایئر ٹائٹ ترازو لے کر ہر شے کو جانچتے، پرکھتے اور سمجھتے ہیں انہیں ''فی الحال'' اس کتاب سے کچھ حاصل نہیں ہوگا کہ عالم موجود کے ساتھ ایک عالم مثال بھی ہے اور عالم مثال میں چیزیں عقل اور آلوں سے نہیں، عشق اور وجدان سے دیکھی اور سمجھی جاتی ہیں۔ یہ اس دنیا کی کہانی ہے جہاں دل اور دماغ کو حاضر ہونے کی اجازت نہیں۔ جہاں عقل و خرد اور فکر و فلسفہ کے پر جلتے ہیں۔ ہاں جن کے باطن میں محبت کی کوئی ہلکی سی بھی چنگاری ہے۔ جو دل اور دماغ کے آسیب سے کسی قدر بچے ہوئے ہیں، جو محض علم کے اسیر نہیں ہیں ان کے لیے اس کتاب میں بہت کچھ ہے۔

THE END---ختم شد---